(سورۃ الشمس تا سورۃ التکاثر)

(۱)

خرم مرادؒ

ترتیب

قرآن مجید کے آخر میں جو سورتیں ترتیب کے ساتھ جمع کردی گئیں ہیں، وہ مختصر اور جامع ہیں۔ انھیں آسانی سے یاد کیا جاسکتا ہے۔ اور عام طور پر نمازوں میں ان کی تلاوت کی جاتی ہے۔ اگر مختصر ہیں تو اس کے یہ معنی نہیں کہ ان میں بیان کے گئے مضامین بھی مختصر ہیں۔ سورہ خواہ مختصر ہو یا طویل، اپنے اندر انتہائی جامع مضامین سموئے ہوئے ہوتی ہے۔ جس طرح لمبی بات کو یاد رکھنا، پڑھنا، بار بار دہرانا مشکل ہوتا ہے، اسی طرح دین کی بنیادی تعلیمات کو یاد رکھنے، بار بار پڑھنے اور ذہن نشین کرنے کے لیے ناگزیر ہے کہ وہ مختصر ہوں۔ چناں چہ دین کی بنیادی تعلیمات کو بغیر کسی تفصیل کے ان سورتوں میں اختصار سے جمع کر دیا گیا ہے۔ اس لحاظ سے یہ سورتیں نہایت اہمیت کی حامل ہیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

دل کی زندگی ہو یا اُمت کی زندگی، قرآن مجید سے وابستہ ہے۔ صرف وہی صحیح راستہ بتاتا ہے، نور بخشتا ہے، شفا عطا کرتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آج بھی ہمارے لیے دنیا میں ترقی و سربلندی کا کوئی نسخۂ کیمیا ہے تو قرآن ہے، آخرت میں نجات کی کوئی سبیل ہے تو قرآن میں ہے۔ آج بھی مسلمان پر قرآن کا وہی حق ہے، جو چودہ سو سال پہلے تھا۔ اسے سنیں اور سنائیں، سمجھیں اور سمجھائیں، عمل کریں اور عمل کی طرف بلائیں، اس کو غالب کرنے کے لیے جہاد کریں۔ آج بھی قرآن ان کو وہی کچھ عطا کرے گا، جو چودہ سو سال پیش تر کیا تھا: دلوں کی نرمی اور گداز، آنکھوں میں نمی اور بصیرت، علم و حکمت کے گوہر تاب دار، زندگی بسر کرنے کا سیدھا، آسان اور روشن راستہ، زمین میں علو و خلافت اور آخرت میں مغفرت اور جنت۔

مجھ سے زیادہ کوئی نہیں جانتا کہ میرے پاس نہ وہ علم ہے نہ تقویٰ اور نہ عمل بالقرآن، کہ میں درس قرآن کا منصب سنبھالنے کی جسارت کروں، نہ یہ کہ جو کچھ کبھی کہا ہے، اسے کتابی صورت میں شائع بھی کروں۔ لیکن میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ یہ میرے اوپر فرض ہے کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کی نعمت جتنی بھی عطا کی ہے، میں اسے سناؤں، بیان کروں اور اس کی طرف بلاؤں۔ اس لیے کہ جس نے کتاب دی ہے، اس نے یہ عہد بھی لیا ہے کہ تم اسے بیان بھی کرو گے اور جو اس عہد کو وفا نہ کریں اور اس کتاب کو چھپا کر بیٹھ جائیں، انھیں اس نے اپنی، فرشتوں کی اور سارے انسانوں کی لعنت کی وعید سنائی ہے۔ نبی کریم ﷺ نے بھی فرمایا کہ بَلِّغُوا

عَنِّیْ وَلَوْ کَانَ آیَۃً۔ اللہ کے عہد کی وفا، اور اسی ارشادِ نبوی ﷺ کی تعمیل ہی میں یہ جرأت کرتا رہا ہوں کہ اپنے علم و دانست کی حد تک قرآن کا پیغام سناؤں۔ اسی کوشش کا نتیجہ یہ دروس ہیں جو پیش خدمت ہے۔

ان دروس میں آپ صرف ونحو کی گتھیاں نہیں پائیں گے، نہ شانِ نزول کی روایات، نہ فقہ وکلام کے مسائل ومباحث، نہ منطقی استدلال۔ ان کا مقصد صرف ابلاغِ پیغام اور تذکیر ہے، دلوں کی زندگی کا سامان اور دعوتِ عمل ہے۔ کم علمی اور کم مائیگی کے باوجود وَلَقَدْ یَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّکْرِ پر یقین اس کی بنیاد ہے۔ دل کی صدا یہی ہے: فَھَلْ مِنْ مُّدَّکِر۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اس حقیر کوشش کو قبول فرمائے، میری کسی بات کو میرے خلاف حجت نہ بنائے۔ لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لاَ تَفْعَلُوْنَ کے زمرے میں شامل ہونے سے مجھے بچائے۔ میرے لیے اصل حاصل قارئین کی داد وتحسین نہیں، بلکہ عنداللہ قبولیت ہے، جس کا ایک ذریعہ آپ کا عمل اور میرے لیے آپ کی دعا ہے۔ اس لیے میری درخواست ہے کہ اگر آپ اس تحریر کو اپنے لیے نافع پائیں تو اللہ تعالیٰ سے دعا کریں کہ وہ میرا خاتمہ ایمان پر کرے اور مجھے اپنی مغفرت سے ڈھانپ لے۔

خرم مراد

سورۃ الشمس

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

وَالشَّمْسِ وَضُحٰهَا ۝۱ وَالْقَمَرِ اِذَا تَلٰهَا ۝۲ وَالنَّهَارِ اِذَا جَلّٰهَا ۝۳ وَالَّيْلِ اِذَا يَغْشٰهَا ۝۴ وَالسَّمَآءِ وَمَا بَنٰهَا ۝۵ وَالْاَرْضِ وَمَا طَحٰهَا ۝۶ وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰهَا ۝۷ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا ۝۸ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا ۝۹ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا ۝۱۰ كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ بِطَغْوٰهَآ ۝۱۱ اِذِ انْۢبَعَثَ اَشْقٰهَا ۝۱۲ فَقَالَ لَهُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ نَاقَةَ اللّٰهِ وَسُقْيٰهَا ۝۱۳ فَكَذَّبُوْهُ فَعَقَرُوْهَا ۥ فَدَمْدَمَ عَلَيْهِمْ رَبُّهُمْ بِذَنْۢبِهِمْ فَسَوّٰهَا ۝۱۴ وَلَا يَخَافُ عُقْبٰهَا ۝۱۵

ع ۱۵ ۱۶

اللہ کے نام سے، جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔

سورج اور اس کی دھوپ کی قسم، اور چاند کی قسم جب کہ وہ اس کے پیچھے آتا ہے، اور دن کی قسم جب کہ (وہ سورج کو) نمایاں کر دیتا ہے، اور رات کی قسم جب کہ وہ (سورج کو) ڈھانک لیتی ہے، اور آسمان کی اور اس ذات کی قسم جس نے اسے قائم کیا، اور زمین کی اور اس ذات کی قسم جس نے اسے بچھایا، اور نفس انسانی کی اور اُس ذات کی قسم جس نے اسے ہموار کیا، پھر اس کی بدی اور اُس کی پرہیزگاری اُس پر الہام کر دی، یقیناً فلاح پا گیا وہ جس نے نفس کا تزکیہ کیا اور نامراد ہوا وہ جس نے اس کو دبا دیا۔

ثمود نے اپنی سرکشی کی بنا پر جھٹلایا۔ جب اس قوم کا سب سے زیادہ شقی آدمی

پھر کر اُٹھا تو اللہ کے رسول نے اُن لوگوں سے کہا کہ خبردار، اللہ کی اونٹنی کو (ہاتھ نہ لگانا) اور اس کے پانی پینے میں (مانع نہ ہونا) مگر انھوں نے اس کی بات کو جھوٹا قرار دیا اور اونٹنی کو مار ڈالا۔ آخر کار اُن کے گناہ کی پاداش میں اُن کے رب نے اُن پر ایسی آفت توڑی کہ ایک ساتھ سب کو پیوندِ خاک کر دیا، اور اُسے (اپنے اِس فعل کے) کسی برے نتیجے کا کوئی خوف نہیں ہے۔

تشریح: سورہ کا آغاز مختلف چیزوں کی قسم اٹھانے سے ہوتا ہے۔ سورج، چاند، دن رات اور آسمان و زمین کی قسم کھائی گئی ہے اور اس کے بعد انسان کے نفس کی قسم کھائی گئی ہے۔ اس سے پہلے کی سورتوں میں بھی قسم کثرت کے ساتھ استعمال ہوئی ہے اور اگلی سورتوں میں بھی مختلف قسمیں اٹھائی گئی ہیں، مثلاً وَالَّیۡلِ (قسم ہے رات کی)، وَالضُّحیٰ (قسم ہے دن کی)، وَالۡعَصۡرِ (قسم ہے زمانے کی)، وَالتِّیۡنِ (قسم ہے انجیر کی) وغیرہ۔

قرآن مجید کے طالب علم کے ذہن میں پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ قسمیں کیوں کھائی ہیں؟ کیا یہ چیزیں بڑی عظیم اور محترم و مکرم ہیں؟

جب ہم کہتے ہیں، اللہ کی قسم! تو اس سے ہماری مراد یہ ہوتی ہے کہ ہم اُس اللہ کو گواہ بناتے ہیں، جس کی عظمت و بزرگی عیاں ہے اور اس جیسی عظیم اور بزرگ ہستی کوئی اور نہیں۔ سوال یہ ہے کہ اللہ نے سورج اور چاند، دن اور رات، انجیر اور زمانے اور ہواؤں کی، جو کہ اس کی مخلوقات ہیں، قسمیں کیوں کھائی ہیں؟ کیا ان کی عظمت کی وجہ سے کھائی ہیں یا کوئی اور سبب ہے؟

دراصل قسم کا مقصد اپنی بات کی صداقت کے لیے شہادت یا گواہی پیش کرنا ہوتا ہے۔
جب ہم کہتے ہیں: اللہ کی قسم، تو اس سے ہماری مراد یہ ہوتی ہے کہ اللہ بزرگ و برتر ہے، وہ ہر جگہ موجود ہے، وہ اس وقت بھی موجود تھا جب ہم نے یہ بات کہی تھی اور وہ ہماری بات کو جانتا ہے۔
لیکن اصل بات یہ ہے کہ قسم کھا کے ہم اپنی سچائی کے حق میں اللہ کو گواہ کرتے ہیں۔ چناں چہ جو بھی قسم کھائی جاتی ہے وہ اپنی بات کو سچا اور برحق ثابت کرنے کے لیے گواہی کے طور پر کھائی جاتی ہے۔ انسانی زندگی میں قسم کا یہی مقصد اور استعمال ہے۔ گویا اپنی بات کی تائید کے لیے اور اپنی بات کی صداقت کے لیے آدمی اللہ کا نام لے کر قسم اٹھاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ اس بات کا محتاج نہیں ہے کہ وہ اپنی کسی بات کو ثابت کرنے کے لیے سورج اور چاند، دن اور رات اور زمین و آسمان کو گواہ کے طور پر پیش کرے، البتہ انسان اس بات کا ضرور محتاج ہے کہ قرآن مجید کی تعلیمات کو جاننے اور سمجھنے کے لیے اس کی رہ نمائی کی جائے کہ یہ باتیں کیوں کر سچ ہیں۔ چناں چہ قرآن مجید میں جہاں بھی اللہ تعالیٰ نے قسمیں کھائی ہیں وہاں اس کا مقصد انسان پر سچائی اور حقانیت کو واضح کرنا ہے تا کہ قرآن کا پڑھنے والا، اس سے ہدایت و رہنمائی اور روشنی حاصل کرنے والا، جسے اللہ نے عقل و فہم، سوچنے سمجھنے اور سننے اور دیکھنے کی صلاحیتوں سے نوازا ہے، ان حقائق تک پہنچ سکے، جن حقائق کی تعلیم اسے دی جا رہی ہے۔

قسم کھانے کا ایک اور پہلو بھی ہے۔ وہ یہ کہ جہاں پر قسم اٹھائی گئی ہوگی وہاں کوئی ایسی چیز بھی ہوگی، جس کے اوپر قسم کھائی جا رہی ہے۔ مفسرین اس کو مقسم علیہ کہتے ہیں یعنی جس کے اوپر قسم کھائی گئی ہو۔ اس لیے ہر سورہ میں جہاں بھی قسم کھائی گئی ہوگی وہاں وہ چیز بھی موجود ہوگی، جس کے لیے قسم کھائی جاتی ہے۔ لیکن وہ کس طرح اور کہاں موجود ہوگی، اس کا انداز، ہر سورہ میں مختلف ہوگا۔ اب یہ سمجھنے والے کا کام ہے کہ وہ تلاش کرے کہ اس قسم کا تعلق کس مضمون سے ہے۔

بعض دفعہ قسم کے فوراً بعد وہ بات کہہ دی جاتی ہے، جس وجہ سے قسم کھائی جا رہی ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر فرمایا:

وَالْعَصْرِ ۝ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ ۝ (العصر ۱:۱۰۳-۲)

''زمانے کی قسم، انسان درحقیقت خسارے میں ہے۔''

اس سے مراد یہ ہے کہ زمانہ خود اس بات پر گواہ ہے کہ وقت ہاتھ سے نکلا جا رہا ہے اور آدمی ایمان اور عمل صالح کے بغیر اس کو ضائع کر رہا ہے اور نقصان میں ہے۔

بعض جگہ چند آیتیں گزرنے کے بعد پھر وہ بات آتی ہے کہ جس کی طرف یہ قسم اشارہ کرتی ہے اور جس کی گواہی میں اس کو پیش کیا جا رہا ہوتا ہے۔ مثلاً:

قٓ ۚ وَالْقُرْاٰنِ الْمَجِیْدِ ۝ (قٓ ۱:۵۰)

''ق، قسم ہے قرآن مجید کی۔''

پھر آگے چل کے جہاں قیامت کا ذکر کیا گیا ہے، اُس کے اوپر قسم کھائی گئی ہے۔

بعض جگہ ایسا ہوتا ہے کہ جس چیز پر قسم کھائی جا رہی ہوتی ہے، اس کا ذکر نہیں کیا جاتا

بلکہ سورہ کا مضمون خود اس بات کو ظاہر کرتا ہے۔ اس سورہ میں کئی پہلو اور مختلف مضامین ہوتے ہیں، جن کے ہر پہلو پر وہ قسم منطبق ہوتی ہے اور گواہی دیتی ہے۔ اس کی مثال سورۂ شمس ہے۔

سورۂ شمس میں جن چیزوں کی قسم اٹھائی گئی ہے، یا گواہی دی جا رہی ہے، یا گواہ کے طور پر جن چیزوں کو پیش کیا جا رہا ہے، بعض مفسرین کی رائے میں یہ قسمیں درج ذیل آیات کی سچائی میں کھائی گئی ہیں:

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا ○ وَ قَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا ؕ (الشمس:۹،۱۰)

”بے شک وہ کامیاب ہوگیا، جس نے اپنے نفس کا تزکیہ کیا اور نامراد ہوگیا وہ جس نے اس کو دبا دیا۔“

بعض کی رائے میں آگے چل کر قومِ ثمود کا ذکر ہے اور جس طرح اللہ تعالیٰ نے ان کو ان کی بدبختی اور نافرمانی کے جرم کی پاداش میں تباہ کر دیا، یہ قسمیں اس کے اوپر کھائی جا رہی ہیں۔

بعض کہتے ہیں کہ یہاں پر مقسم علیہ محذوف ہے، یعنی ذکر نہیں کیا گیا ہے۔ اگر غور کیا جائے تو اس سورہ میں کئی پہلو ہیں جن پر قسم کھائی جا سکتی ہے۔ ہر مفسر نے اپنے اپنے فہم کے مطابق اس کی تاویل کی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے، جو بھی قسمیں کھائی ہیں وہ کائنات کے مختلف شواہد و مناظر کی ہیں، جو روز ہماری نظروں کے سامنے ہوتے ہیں، اور انھیں اُن تعلیمات کے لیے کہ جو قرآن مجید ہمیں دے رہا ہے، گواہ کے طور پر پیش کیا ہے۔ سورج اور چاند، دن اور رات، نفسِ انسانی، ہواؤں کا چلنا، بادلوں کا آنا اور بارش کا برسنا، یہ سب ہماری نظروں کے سامنے ہے، مثلاً آسمان کی قسم کھائی گئی، جو سب کے سامنے ہے:

وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْبُرُوْجِ ○ (البروج:۱)

”قسم ہے، مضبوط قلعوں والے آسمان کی۔“

اسی طریقے سے ستاروں کی قسم کھائی گئی ہے:

وَالنَّجْمِ اِذَا هَوٰى ○ (النجم:۱)

”قسم ہے تارے کی جب کہ وہ غروب ہوا۔“

ستارہ بھی آدمی کی نگاہوں کے سامنے ہوتا ہے۔

یہ قرآن مجید کے طرزِ تعلیم کا کمال ہے کہ اُس نے ان چیزوں کو جن کو آدمی روز دیکھتا ہے، جن سے روزانہ واسطہ پڑتا ہے، جو نگاہوں کے سامنے ہیں، جن سے انسان کا ایک ربط اور تعلق ہے، ان کو اس نے انسان کا معلم بنا دیا ہے۔ دراصل قرآن مجید کے پیش نظر تعلیم کا جو مقصد، غرض و غایت اور مشن ہے، وہ ایسا مشن ہے، جس کو کوئی تعلیمی ادارہ پورا نہیں کرسکتا۔ اسے بہ یک وقت جاہل کو بھی تعلیم دینا ہے اور پڑھے لکھے کو بھی۔ ایک عام آدمی کو بھی تعلیم دینا ہے اور ایک فلسفی، سائنس داں اور پی ایچ ڈی کو بھی۔ بچہ، بوڑھا اور جوان، مرد و عورت، عامی و عاقل، غرض بہ یک وقت سب اس کے مخاطب ہیں۔ پھر اس کی تعلیم بنی نوعِ انسان کے لیے ہے:

نُوْرًا وَّ هُدًى لِّلنَّاسِ (الأنعام:۹۱)

''تمام انسانوں کے لیے روشنی اور ہدایت۔''

گویا وہ تمام انسانوں کے لیے ہدایت بن کے آیا ہے۔

قرآن کی درس گاہ تو ایک ایسی درس گاہ ہے، جس میں ایک اسکول، یونی ورسٹی اور کسی خاص درجے کا آدمی ہی نہیں داخل ہوتا بلکہ ہر سطح کا آدمی داخل ہوسکتا ہے اور تعلیم حاصل کرسکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید نے آدمی کو تعلیم دینے کے لیے وہ معلم مقرر کیے ہیں جو ہر آدمی کو دستیاب ہیں۔ سورج، چاند اور ستارے، یہ ہر آدمی کے مشاہدے میں ہیں۔ اپنے نفس کے اوپر آدمی روز نگاہ ڈالتا ہے۔ تاریخ لمبی ہو یا مختصر، دنیا کی ہو یا اپنی قوم کی، یا اپنی زندگی کے گزرے ہوئے ۴۰، ۵۰ برس، سب نگاہوں کے سامنے ہوتے ہیں اور اس تاریخ سے سبق حاصل کیا جاسکتا ہے۔ اِن سب کے ذریعے اللہ تعالیٰ اُن تعلیمات کو ہمارے دلوں میں اتارتا ہے، جو وہ ہم کو سکھانا چاہتا ہے۔ اسی لیے کہا گیا ہے:

سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّـهُ الْحَقُّ ؕ (حٰمٓ السجدة:۵۳)

''عن قریب ہم ان کو اپنی نشانیاں آفاق میں بھی دکھائیں گے اور ان کے اپنے نفس میں بھی، یہاں تک کہ ان پر یہ بات کھل جائے گی کہ یہ قرآن واقعی برحق ہے۔''

چناں چہ قرآن مجید نے 'آیاتِ آفاق'، 'آیاتِ انفس' اور 'آیاتِ زمان' کی طرف خود اشارہ کیا ہے۔ یہاں آیات سے مراد نشانیاں ہیں۔

شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ قرآن مجید کے مضامین کو پانچ حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ ان میں سے دو حصے 'تذکیر بہ اعلاے اللہ' اور 'تذکیر بہ ایام اللہ' ہیں۔ اللہ کی جو نعمتیں کائنات اور انسان کے اپنے نفس میں پھیلی ہوئی ہیں، ان کے ذریعے اللہ تعالیٰ تذکیر کرتا ہے، یاد دلاتا ہے اور تعلیم دیتا ہے۔ یہ 'تذکیر بہ اعلاے اللہ' ہے۔ تاریخ میں جو کچھ قوموں کو پیش آیا، لوگوں کو پیش آیا، اور قرآن مجید میں بھی تاریخ کا ایک بڑا حصہ ہے، یہ 'تذکیر بہ ایام اللہ' ہے۔

کائنات میں جو کچھ پیش آتا ہے، اس سے آدمی کا ایک ربط ہوتا ہے۔ سہانی صبح ہوتی ہے، چڑیاں چہچہاتی ہیں، سورج طلوع ہوتا ہے، روشنی پھیلتی ہے، ایک نئی زندگی کا آغاز ہوتا ہے۔ غرض زندگی اور فطرت سے آدمی کا بڑا گہرا ربط ہے۔ فطرت مصنوعی کتاب کی طرح نہیں ہے کہ آدمی اسے کھول کے پڑھتا ہے۔ یہ تو کھلی کتاب ہے۔ مظاہر فطرت کو اگر آدمی آنکھیں کھول کے دیکھے، کان کھول کے سنے اور دل حاضر ہو، تو وہ اس سے نصیحت حاصل کرتا ہے:

اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَذِکْرٰی لِمَنْ کَانَ لَہٗ قَلْبٌ اَوْ اَلْقَی السَّمْعَ وَھُوَ شَھِیْدٌ ○ (قٓ ۵۰:۳۷)

''اس تاریخ میں عبرت کا سبق ہے ہر اس شخص کے لیے، جو دل رکھتا ہو، یا جو توجہ سے بات کو سنے۔''

یہ عمومی رویہ ہے کہ مظاہر فطرت، رات اور دن کا آنا جانا، سورج اور چاند کی گردش، موسموں کا تغیر وتبدل، ہواؤں کا چلنا، بارش کا برسنا اور بہت سے مناظر کائنات ہیں، جن کا انسان مشاہدہ کرتا ہے لیکن وہ ان پر سرسری نگاہ ڈال کر ہی گزر جاتا ہے۔ اسی طرف قرآن مجید نے اشارہ کیا ہے کہ کتنے سبق، کتنی آیات اور کتنے دلائل اور نشانیاں زمین وآسمان میں پھیلی ہوئی ہیں لیکن لوگ سرسری طور پر گزر جاتے ہیں اور غور ہی نہیں کرتے۔ اس لیے کہ جب اپنی ہی آنکھیں بند ہوں تو روشنی کیسے دکھائی دے اور اگر اپنے ہی کان بند ہوں تو پھر آواز کیسے سنائی دے۔ لیکن قرآن مجید نے انسان کی ہدایت ورہنمائی کے لیے یہ جو معلم مقرر کیے ہیں، اگر کوئی ایک دفعہ ان کی حکمت کو جان لے تو پھر صبح شام، اٹھتے بیٹھتے ہر وقت اللہ کو دیکھ سکتا ہے۔ اگرچہ اس کی ذات کو تو نہیں دیکھ سکتا، تاہم اس کا جلوہ اور اس کی صفات کا جلوہ ضرور دیکھ سکتا ہے۔

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّھَارِ لَاٰیٰتٍ

لِّاُولِی الْاَلْبَابِ ۚ الَّذِیْنَ یَذْکُرُوْنَ اللّٰہَ قِیٰمًا وَّ قُعُوْدًا وَّ عَلٰی جُنُوْبِہِمْ وَ یَتَفَکَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ

(آل عمران: ۱۹۰، ۱۹۱)

"زمین اور آسمانوں کی پیدائش میں اور رات اور دن کے باری باری سے آنے میں اُن ہوش مند لوگوں کے لیے بہت نشانیاں ہیں، جو اٹھتے، بیٹھتے اور لیٹتے، ہر حال میں خدا کو یاد کرتے ہیں اور زمین اور آسمانوں کی ساخت میں غور وفکر کرتے ہیں۔"

سورج طلوع ہوتا ہے تو ان کو اللہ کی یاد آتی ہے۔ سورج غروب ہو، دن چڑھے یا رات ہو، ہر چیز ان کو اللہ کی یاد دلاتی ہے۔ اسی لیے قرآن مجید نے تعلیم کا یہ انتظام کیا ہے اور یہ ہر ایک کے بس میں ہے۔ ایک عام بدو اور دیہاتی کے لیے اتنی بات ہی کافی ہے کہ وہ صبح وشام اور دن اور رات کو دیکھے کہ یہ نظام کس نے پیدا کیا اور کس کے حکم سے چل رہا ہے۔ دوسری طرف ایک مفکر و مدبر اور ایک سائنس داں کے لیے بھی اس میں غور وفکر کے لیے ایک جہان پنہاں ہے۔ ایک سائنس داں جانتا ہے کہ سورج کتنی عظیم الشان چیز ہے۔ وہ اس کا سائز، اس کی روشنی، اس کی گیسیں اور اس کے اثرات سے پوری طرح واقف ہے۔ وہ اپنے اس علم کی روشنی میں غور وفکر کرے گا۔ اس طرح سے ایک بدو اور دیہاتی اپنے مشاہدے کے ذریعے اور ایک سائنس داں اپنی تحقیق اور غور وفکر کے ذریعے، دونوں ایک ہی نتیجے پر پہنچیں گے، جسے قرآن مجید نے ہوش مند لوگوں کے لیے کھلی نشانیاں قرار دیا ہے اور اللہ کی یاد کا ذریعہ بتایا ہے۔ یہ ایسا ذریعۂ تعلیم ہے، جو ہر ایک کے لیے کھلا ہوا ہے۔ بہت علم ہو تو بھی مفید ہوگا اور کچھ علم نہ ہو، تو بھی ہدایت و رہنمائی کا ذریعہ ہے۔

یہ بلند وبالا پہاڑ، جو زمین پر کھڑے ہیں، ان کے بارے میں قرآن مجید کا ارشاد ہے:

وَ جَعَلْنَا فِیْهَا رَوَاسِیَ شٰمِخٰتٍ (المرسلٰت: ۲۷)

"ہم نے پہاڑوں کو اس میں کیلیں بنا کر ٹھونک دیا ہے۔"

اس مثال میں ایک عام دیہاتی اور ان پڑھ کے لیے بھی پیغام اور غور وفکر کا سامان ہے اور اس کے لیے بھی، جو پہاڑوں کے علم سے واقف ہے۔ جسے یہ معلوم ہے کہ پہاڑ کس طرح بنے اور کس طرح ان سے زمین کو سکون ہوا۔

اسی طرح جو صرف یہ جانتا ہے کہ نطفہ جا کر عورت کے رحم میں ٹھہرتا ہے اور اس سے انسان پیدا ہوتا ہے، اس کے لیے یہی بڑا معجزہ ہے۔ دوسری طرف جو جدید سائنس کے حوالے سے جانتا ہو کہ کس طرح ایک چھوٹا سا خلیہ اور جین جس کے اندر پورے انسان کا وجود پنہاں ہوتا ہے نشوونما پا کر ایک مکمل انسان کی صورت اختیار کرتا ہے، یہ اس کے لیے کسی معجزے سے کم نہیں۔ یہی جین ہے جو کہیں ناخن بنتی ہے، کہیں بال بنتی ہے، کہیں گوشت بنتی ہے اور کہیں کھال۔ اسی لیے فرمایا گیا ہے:

اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰہَ مِنْ عِبَادِہِ الْعُلَمٰٓؤُا (فاطر:۲۸)

''حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے بندوں میں سے صرف علم رکھنے والے لوگ ہی اس سے ڈرتے ہیں۔''

میں نے اتنی تفصیل اس لیے بیان کی ہے تا کہ اس بات کو بخوبی سمجھ لیا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے جہاں بھی آیات (واضح نشانیاں) کی طرف اشارہ کیا ہے، ان کی قسمیں کھائی ہیں، اس کا مقصد یہ ہے کہ ہمارا ان سے جتنا ربط ہے، ہم ان پر جتنا بھی غور کریں، اس سے ہمارے دل و دماغ متحرک ہو جائیں اور اللہ تعالیٰ، جن چیزوں سے ہمارا تعلق قائم کر رہا ہے، ان چیزوں سے ہمارا صحیح تعلق قائم ہو جائے۔

اب ہم سورۂ شمس کی روشنی میں پہلے ان قسموں پر نظر ڈالیں گے اور پھر دیکھیں گے کہ ان کا تعلق کس چیز سے ہے، اور کس بات کے ثبوت یا گواہی کے طور پر ان کو پیش کیا جا رہا ہے۔

وَالشَّمْسِ وَضُحٰهَا ○ (الشمس:۱)

''سورج اور اس کی دھوپ کی قسم۔''

ضُحٰی کے معنی بعض کے نزدیک دن چڑھے کا وہ وقت ہے، جب سورج خوب روشن ہو جاتا ہے۔ اسے چاشت کا وقت بھی کہتے ہیں۔ جب ابھی گرمی بھی نہیں بڑھتی اور سورج اپنے نصف النہار پر بھی نہیں پہنچتا۔ یہ دن کا سب سے خوب صورت حصہ ہوتا ہے اور یہ سورج کے عروج کا وقت ہے، جب کہ زوال کا وقت ایک دوسری کیفیت ہے۔ بعض کے نزدیک اس کا مطلب دن کی روشنی اور دھوپ ہے۔ غرض جو بھی معنی لیے جائیں، اللہ تعالیٰ نے سورج اور اس کی روشنی کی بطور گواہ قسم اٹھائی ہے۔

وَالْقَمَرِ اِذَا تَلٰهَا (الشمس:۲)

’’اور چاند کی قسم، جب کہ وہ اس کے پیچھے آتا ہے۔‘‘

یہ دوسری چیز ہے، جس کی گواہی پیش کی گئی ہے۔

وَ النَّهَارِ اِذَا جَلّٰهَا (الشمس:۳)

’’اور دن کی قسم کہ جب وہ اس کو روشن کردے۔‘‘

یہ تیسری چیز ہے، جس کی گواہی پیش کی گئی ہے۔

’اس‘ سے کیا مراد ہے؟ ’اس کو روشن کردے‘ کا بالعموم لوگوں نے یہی ترجمہ کیا ہے کہ ’’دن چڑھے اور سورج روشن ہوجائے۔‘‘ لیکن یہ ترجمہ بھی کیا گیا ہے کہ یہاں ھا کا مطلب دراصل زمین ہے، اگرچہ زمین کا ذکر پہلے نہیں ہوا۔ لیکن انسان تو زمین پر رہتا ہے اور جانتا ہے کہ سورج نکلتے ہی پوری زمین روشن ہوجاتی ہے، حرکت پیدا ہوتی ہے، ایک دنیا جاگ اٹھتی ہے، کاروبارِ حیات شروع ہوجاتا ہے، زندگی کی ایک نئی رودوڑ پڑتی ہے، رات کو مردوں کی مانند سوئے انسان زندہ اٹھ کھڑے ہوتے ہیں، جانور نکل پڑتے ہیں، دودھ دیتے ہیں، غرض بے شمار کام ہیں جو سورج کے نکلتے ہی دن کی روشنی میں شروع ہوجاتے ہیں۔ اسی لیے بعض مفسرین کے نزدیک اس کے معنی ہیں کہ ’’جب وہ زمین کو روشن کردے۔‘‘ قرآن مجید میں مثالیں بھی موجود ہیں کہ زمین اسم ضمیر (Pronoun) کے طور پر آتی ہے اور پہلے اس چیز کا ذکر نہیں ہوا ہوتا، جس کے بارے میں زمین کا بطور اسم ضمیر استعمال ہوتا ہے۔ گویا دونوں معنی کی گنجائش ہے۔

وَالَّيْلِ اِذَا يَغْشٰهَا وَالسَّمَآءِ وَمَا بَنٰهَا (الشمس:۴،۵)

’’قسم ہے رات کی، جب وہ اس پر چھا جائے اور اس پر اندھیرا کردے۔ اور قسم ہے
آسمان کی اور جیسا کہ اُس کو بنایا۔‘‘

مَا کے معنی عربی میں ’کیا‘ کے بھی ہوتے ہیں اور ’جو‘ کے بھی، اور ’جس‘ کے بھی۔ یہاں پر بھی لوگوں نے دو طرح سے ترجمہ کیا ہے۔ ایک یہ کہ: ’’قسم ہے آسمانوں کی اور اس ذات کی، جس نے اس کو بنایا۔‘‘ بعض کے نزدیک اس کے معنی اس طرح ہیں: ’’جس طرح جیسا کچھ اس نے بنا دیا، کیسا بنایا ہے۔‘‘ یعنی آسمان اور اس کی شان دیکھیں، جیسا کہ اس نے بنایا ہے، کیسا بنایا ہے! دونوں معنی ہی لیے جاسکتے ہیں۔ مضمون میں کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ ان

تمام قسموں کا اطلاق اگلی آیت پر کیا گیا ہے۔ فرمایا:

وَالْاَرْضِ وَمَا طَحٰهَا ۝ (الشمس:۶)

''اور زمین کی اور اس ذات کی قسم، جس نے اسے بچھایا۔''

یہاں اگر گزشتہ آیات میں اٹھائی جانے والی قسموں کا جائزہ لیا جائے تو ایک مکمل تصویر سامنے آتی ہے۔ سورج کی روشنی انسانی زندگی کی علامت ہے۔ چاند بھی روشنی لے کر آتا ہے لیکن اس کی روشنی کی کیفیت کچھ اور ہوتی ہے۔ سورج کی طرح اس میں گرمی یا حدت نہیں ہوتی۔ اگرچہ وہ قوت کا سرچشمہ نہیں ہوتا، لیکن اس میں سکون اور اطمینان ہوتا ہے۔ گیتوں، شاعری اور ادب اور زندگی میں، چاندنی رات محبت اور خوب صورتی کی علامت ہے۔ سورج چاند سے بالکل مختلف چیز ہے۔ دن چڑھتا اور صبح ہوتی ہے تو یہ زمین کی پوری زندگی اور کاروبارِ حیات کو روشن کر دیتا ہے اور ایک حرکت پیدا ہو جاتی ہے۔ رات آتی ہے تو سکون کے ساتھ سب کو ڈھانپ لیتی ہے۔ ہر چیز کے اوپر ایک پردہ پڑ جاتا ہے۔ اگر دن نہ ہو اور رات نہ آئے تو زندگی بسر نہیں ہو سکتی۔ پودے اور جانور بھی آرام کے محتاج ہوتے ہیں اور انسان بھی۔ اللہ تعالیٰ نے خود فرمایا ہے کہ رات تو ہم نے آرام کے لیے بنائی ہے۔ دن اور رات دونوں دو متضاد چیزیں ہیں، ایک طرف روشنی ہے اور دوسری طرف تاریکی۔ اسی طرح آسمان اور زمین بھی ہیں۔

آسمان اتنا وسیع اور اتنا بلند ہے کہ ہم تو جانتے ہی نہیں کہ اس کی حد کیا ہے؟ سائنس داں جب آسمان کے بارے میں غور کرے گا تو اس کی عقل دنگ رہ جائے گی۔ عام آدمی بھی جب آسمان کو دیکھے گا اور غور کرے گا کہ ایک وسیع و عریض چیز نگاہوں کے سامنے ہے اور اس میں ستارے جگمگا رہے ہیں، سورج اور چاند ہے، اربوں ستارے ہیں، جو اربہا ارب میل کے فاصلے پر واقع ہیں، گویا ایک جہان ہے، جو آباد ہے۔ یہ بیان نہیں ہو سکتا کہ کس طرح اللہ تعالیٰ نے اسے بنایا ہے۔ اسی لیے مفسرین نے وَالسَّمَآءِ وَمَا بَنٰهَا (الشمس:۵) کا ترجمہ ''جیسا اس نے اس کو بنایا'' کیا ہے۔ میں نے بھی یہی معنی اختیار کیے ہیں۔

زمین کو پھیلانے سے مراد یہ ہے کہ اس کو رہنے اور بسنے کے قابل بنا دیا:

الَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا (البقرۃ:۲۲)

''وہی تو ہے، جس نے تمھارے لیے زمین کا فرش بچھایا۔''

ایک دوسرے مقام پر یوں فرمایا:

اَمَّنْ جَعَلَ الْاَرْضَ قَرَارًا (النمل:۶۱)

''اور وہ کون ہے، جس نے زمین کو جائے قرار بنایا۔''

کائنات کے اندر تو ہر قسم کا درجۂ حرارت پایا جاتا ہے، کروڑوں اور لاکھوں ڈگری بھی ہے اور ہزاروں ڈگری بھی، لیکن زمین کا درجۂ حرارت ۱۵۰، ۱۶۰ اور ۱۵۵ درجے سے اوپر نہیں جاتا اور نیچے جانے کی بھی اس کی ایک حد مقرر ہے۔ زمین کا درجۂ حرارت اگر اس سے اوپر چلا جائے تو سب لوگ جل بھن کر خاک ہو جائیں گے اور اگر نیچے چلا جائے تو سب سردی سے ٹھٹھر کر مر جائیں گے۔ اسی طرح کائنات میں بے شمار ایسی نشانیاں پائی جاتی ہیں، جو کہ انسان کو غور و فکر کی دعوت دیتی ہیں کہ وہ یہ دیکھے کہ اللہ نے انھیں کس طرح سے اس لائق بنایا کہ انسانی زندگی ممکن ہو سکے۔ انسان نے کتنے ہی سیارے چھوڑے ہیں، کائنات کا جائزہ لیا ہے اور بار بار تلاش کر رہا ہے مگر اسے کسی ایسی جگہ کا پتا نہیں چلا، جو زمین کی طرح، انسانی زندگی کو سہارنے کے لائق ہو۔ کروڑوں ستاروں کو آدمی دیکھ چکا ہے اور بار بار تلاش کر رہا ہے لیکن اسے زندگی کا سراغ کہیں نہیں ملا۔ یہی وہ بات ہے، جس کی طرف سورۂ شمس کی ان آیات میں اشارہ کیا گیا ہے:

وَالسَّمَآءِ وَمَا بَنٰهَاۙ وَالْاَرْضِ وَمَا طَحٰهَاۙ (الشمس:۵،۶)

''اور آسمان اور اس ذات کی قسم، جس نے اسے قائم کیا، اور زمین کی اور اس ذات کی قسم جس نے اسے بچھایا۔''

یہ بات بھی غور طلب ہے کہ یہاں جو چھے قسمیں کھائی گئی ہیں وہ متضاد چیزوں کی ہیں۔ سورج اور چاند دونوں روشنی کے حامل ہیں، لیکن دونوں بالکل مختلف چیز ہیں۔ سورج کی اپنی روشنی ہے، لیکن چاند کی روشنی تو سورج سے مستعار مانگی ہوئی ہے اور چاند کی خود کوئی روشنی نہیں ہے۔ سورج کی روشنی میں گرمی، شدت اور حرارت ہے، جب کہ چاند کی روشنی میں ٹھنڈک، سکون اور طمانیت ہے۔ دن ایک الگ چیز ہے، رات ایک الگ چیز ہے۔ آسمان انتہائی بلند و بالا اور وسعتوں کا حامل ہے، جب کہ زمین اس کائنات کے سامنے ریگستان کے ایک ذرّے کی مانند بلکہ اُس سے بھی چھوٹی ہے۔ لیکن انسانی زندگی صرف زمین پر ہی ممکن ہے اور ہمارے لیے رہنے کا واحد ٹھکانا یہی ہے۔

یہ سب چیزیں، جو یہاں بیان کی گئی ہیں اگرچہ بالکل متضاد ہیں، ایک خاص پہلو کی طرف اشارہ کررہی ہیں، مگر اس سورہ کے آخر میں ایک اور چیز کو ثبوت کے طور پر پیش کیا گیا ہے اور اس کی قسم اٹھائی گئی ہے۔ فرمایا:

وَ نَفْسٍ وَّمَا سَوّٰهَا ۝ۙ (الشمس:۷)

''اور نفس انسانی کی اور اس ذات کی قسم، جس نے اسے ہموار کیا۔''

تَسْوِيَه کے معنی ہوتے ہیں برابر کردینا، ٹھیک کردینا، یعنی کسی چیز کو عدل کرتے ہوئے ٹھیک ٹھیک اس طرح بنانا کہ اس میں کوئی کمی بیشی نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ نے، جو چیز بنائی اس کو اس طرح بنایا کہ جس مقصد کے لیے بنایا اُس کے لیے اس کو موزوں اور ٹھیک ٹھیک بنایا: رَبُّنَا الَّذِیٓ اَعْطٰی کُلَّ شَیْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰی ۝ (طٰہٰ:۵۰) ''ہمارا رب وہ ہے، جس نے ہر چیز کو اس کی ساخت بخشی، پھر اس کو راستہ بتایا۔'' یعنی اس نے ہر چیز کو وجود اور ساخت عطا کی اور پھر اس نے صحیح راستے پر لگا دیا اور ہدایت کردی کہ وہ اس کو کیسے استعمال کرے۔

انسان کی بعض چیزیں تو ایسی ہیں، جن کی ہدایت اس کی فطرت میں ودیعت کردہ ہے۔ اس کی ایک نمایاں مثال یہ ہے کہ بچہ پیدا ہوتے ہی جانتا ہے کہ اس کی غذا کہاں ہے اور اُس کو وہ کیسے حاصل کرے؟ کسی نے اسے نہیں سکھایا ہوتا، نہ کوئی اسے تعلیم دیتا ہے بلکہ یہ ہدایت اس کے اندر موجود ہے۔ یہی ہدایت درختوں اور جانوروں میں بھی پائی جاتی ہے۔

اگر آپ کے گھر میں بلی ہے اور وہ پہلی دفعہ بچہ جنتی ہے تو وہ کہیں جا کر یا کسی کالج میں جا کر یہ نہیں پڑھتی کہ بچہ کیسے پیدا ہوتا ہے؟ وہ خود بخود مضطرب اور بے چین ہوتی ہے۔ گھر میں کوئی گوشہ یا پناہ گاہ تلاش کرتی ہے اور وہاں جا کر بچے جنتی ہے اور اُن کی حفاظت کرتی ہے۔ مگر جیسے ہی بچے بڑے ہوتے ہیں، ان سے لاپروا ہو جاتی ہے۔

یہ قدرت کی ہدایت کا انتظام ہے۔ اس نے ہر ایک کو ہدایت دی ہے اور بالکل ٹھیک ٹھیک بنایا ہے۔ سورج کو، چاند کو، زمین کو، ہر ایک کو اس مقصد کے لیے ٹھیک بنایا ہے کہ جو مقصد اُس نے اس کے لیے مقرر کیا ہے۔ نفسِ انسانی کو بھی ایک خاص مقصد کے لیے ٹھیک ٹھیک بنایا گیا ہے اور اسی کے لیے انسان کو پیدا کیا ہے۔ اس بات کی طرف اگلی آیت میں اشارہ کیا گیا ہے۔

فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَ تَقْوٰهَاo (الشمس:۸)

"پھر اس کی بدی اور اس کی پرہیزگاری اس پر الہام کر دی۔"

زندگی میں بے شمار چیزیں ہیں لیکن جس چیز کے لیے انسان کو بنایا گیا ہے وہ اگر واضح ہو، اور وہ یہاں واضح ہو جاتی ہے کہ وہ دراصل نیکی اور بدی کی آزمائش کے لیے بنایا گیا ہے۔ یہ انسان کا مقصد تخلیق ہے۔ سورۂ ملک میں اس بات کی طرف واضح طور پر اشارہ کیا گیا ہے:

اَلَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوةَ لِیَبْلُوَكُمْ اَیُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا

(الملک:۲)

"اس نے موت اور زندگی کو پیدا کیا ہے تاکہ وہ آزمائے کہ تم میں سے کون اچھے عمل کرتا ہے۔"

انسان کا مقصد وجود یہی ہے کہ وہ نیکی اور بدی میں سے نیکی کا انتخاب کرے، نیک عمل کرے اور نیکی اختیار کرے۔

یہاں الہام کا لفظ استعمال ہوا ہے (فَاَلْهَمَهَا)، یہ بھی غور طلب ہے۔ الہام کے معنی ہوتے ہیں کہ کسی چیز کو نگلنا یا کسی چیز کو نگلوانا، یعنی جو چیز اللہ تعالیٰ آدمی کے دل و دماغ میں یا فطرت کے اندر ڈال دے، وہ چیز دراصل الہام کی گئی ہے۔ یہ اللہ کی طرف سے ہے، اس کو آدمی نے خود نہیں سیکھا ہے۔ یہ اُس کی فطرت میں ودیعت ہے۔ فطرت میں نیکی اور بدی کے حوالے سے کیا چیز ودیعت کی گئی ہے؟ یہ جاننے کی ضرورت ہے۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ ہر آدمی جانتا ہے کہ اچھائی اور برائی کیا ہے۔ ابھی ہم اس بحث میں نہیں پڑ رہے ہیں کہ کیا اچھائی ہے اور کیا برائی؟ ایک نقطۂ نظر یہ ہوسکتا ہے کہ انسان کے لیے شراب پینا کوئی بری بات نہیں ہے۔ کوئی کہہ سکتا ہے کہ زنا کرنے میں کوئی خرابی نہیں ہے۔ یہ بھی کہا جاسکتا ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ہر آدمی اچھائی اور برائی کو بخوبی جانتا ہے۔ اچھائی اور برائی کا احساس ہر آدمی کی فطرت میں موجود ہے۔ دنیا کے سارے معاشرے، زندگی کی قدریں، سارے خاندان، جرم و سزا کا نظام، عدالتیں اور قانون و ضوابط، سب اسی نقطۂ نظر پر مبنی ہیں۔

کیا چیز اچھی ہے اور کیا بری؟ اس سے اختلاف نہیں ہوسکتا کہ بعض کام اچھے ہوتے ہیں اور بعض برے۔ کوئی کسی کو ناحق مارے یا کوئی کسی کا مال دبا لے، کوئی نہیں کہہ سکتا کہ یہ اچھا

کام ہے۔ کوئی کسی کو گالی دے، وعدہ توڑے، ظلم ڈھائے، کوئی نہیں کہے گا کہ یہ اچھا کام ہے۔ یہ تو ممکن ہے کہ آدمی یہ سب کام کرے لیکن کوئی اسے اچھا کام نہیں کہے گا۔ اچھائی اور برائی کا تصور انسان کے ضمیر میں موجود ہے۔

اگر آپ غور کریں تو دنیا کے اندر بالعموم لوگ اس بات پر متفق رہے ہیں کہ کیا چیز اچھی ہے اور کیا بری۔ اس میں کوئی بڑا اختلاف نہیں رہا ہے۔ وہ معاشرے جہاں پر بدکاری عام ہے، جہاں عورت مرد کے اختلاط پر کوئی پابندی نہیں ہے، جہاں شراب پانی کی طرح حلال ہے، وہاں بھی اگر کوئی اعلیٰ عہدے دار شرابی ہو تو اس کو عہدہ نہیں دیا جاتا۔ اگر کسی صدر ریاست کے اوپر بدکاری کا الزام ثابت ہو جائے تو لوگ اس سے ناراض ہوتے ہیں، اسے ہٹانا چاہتے ہیں اور منتخب نہیں کرتے۔ گو وہ اپنے لیے سب کچھ کرتے ہیں لیکن جانتے ہیں کہ یہ اچھی چیز نہیں۔ دراصل آدمی خواہ کتنے ہی فلسفے تراش لے، کتنے ہی دلائل دے، لیکن سب جانتے ہیں کہ کیا چیز اچھی ہے اور کیا بری۔ تفصیلات میں اختلاف ہو سکتا ہے، تاہم اصولی طور پر لوگ متفق ہیں۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ جھوٹ بولنا اچھی بات ہے یا سچ بولنا بری بات۔ یہ وہ چیزیں ہیں، جو آدمی کی فطرت میں الہام ہیں۔ یہ دوسری چیز ہے، جو اللہ نے تعلیم کی ہے۔

تیسری چیز جو اس نے الہام کی ہے وہ یہ کہ نیکی کو اس نے محبوب بنایا ہے اور برائی کو ناپسندیدہ قرار دیا ہے۔ آدمی برے کام کر سکتا ہے، مگر کہتا یہی ہے کہ دنیا دار آدمی ہوں یا ہم تو گناہ گار ہیں۔ کوئی نہیں کہتا کہ یہ بڑا اچھا کام ہے۔

فطرتاً آدمی کے لیے نیکی پسندیدہ اور محبوب ہے، جب کہ برائی ناپسندیدہ اور غیر محبوب۔ یہ بھی فطرت نے اس کے اندر انتظام کیا ہے۔ اس نے اس کے اندر ضمیر جیسی شے رکھی ہے۔ جب آدمی برا کام کرتا ہے تو وہ اس کو ٹوکتا ہے۔ بڑے سے بڑا مجرم بھی اس سے بھاگ نہیں سکتا۔ وہ اس کو جھنجھوڑتا ہے کہ اس نے یہ کیا کر دیا؟ کوئی زبردستی کسی بیوہ یا یتیم سے زیادتی کرے یا کسی کو قتل کر دے تو اس کا دل اس کو ملامت کرتا ہے۔ نفسِ لوّامہ، آدمی کے اندر موجود ہے۔ ضمیر موجود ہے، جو اس کو ہر وقت ٹوکتا ہے۔ پھر اُس نے انسان کو اچھائی اور برائی کی پہچان دی، اسے اچھائی اور برائی کے درمیان تمیز کرنا سکھایا ہے۔ یہ ساری چیزیں الہام میں شامل ہیں۔

دراصل یہ اس لیے ہے کہ آدمی جس مقصد کے لیے پیدا کیا گیا ہے اور جس مقصد

کے لیے اللہ تعالیٰ نے اس کو بنایا ہے، اس کی فکر اس کے دامن گیر ہو اور اس کے حصول کے لیے وہ بھرپور جدوجہد کرے۔ وہ یہ ہے کہ زندگی کے امتحان میں، اس تھوڑی سی عمر کے اندر وہ یہ ثابت کرے کہ وہ نیکی کے راستے پہ چلے گا اور برائی کے راستے سے بچے گا۔ اس کے لیے جس بنیادی رہنمائی اور ہدایت کی ضرورت ہے وہ اس کے اندر موجود ہے اور اللہ کی طرف سے ودیعت کردہ ہے۔ یہی وہ بات ہے، جس کو آگے چل کے اس سورہ میں تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا ○ وَ قَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا ○ (الشمس: ۹،۱۰)

''یقیناً فلاح پا گیا وہ، جس نے نفس کا تزکیہ کیا اور نامراد ہوا وہ، جس نے اس کو دبا دیا۔''

گویا جس نے اپنے اس نفس کو پاکیزہ کیا، اس کی اچھی چیزوں کو ابھارا، ان کو نشوونما اور ترقی دی وہ کامیاب ہو گیا، اور جس نے اس کو دبا دیا، مٹی میں ملا دیا، ختم کر دیا وہ نامراد و ناکام ہو گیا۔ اس آیت میں قرآن مجید نے انسان کے بارے میں جو کچھ بیان کیا ہے، جسے تربیت کے عنوان سے آپ جانتے ہیں اور جس کو بیان بھی کیا جا چکا ہے، وہ سب کا سب اس آیت کے اندر موجود ہے۔ تزکیہ و تربیت کے پہلو کو قرآن مجید میں مختلف انداز میں مختلف جگہ بیان کیا گیا ہے۔ سورۂ دہر میں کہا گیا ہے کہ انسان تو کچھ بھی نہیں تھا بلکہ کوئی قابلِ ذکر شے بھی نہیں تھا:

هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُنْ شَيْئًا مَّذْكُوْرًا ○ اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ ۖ نَّبْتَلِيْهِ فَجَعَلْنٰهُ سَمِيْعًا ۢ بَصِيْرًا ○ اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّ اِمَّا كَفُوْرًا ○ (الدھر: ۱-۳)

''کیا انسان پر لامتناہی زمانے کا ایک وقت ایسا بھی گزرا ہے، جب وہ کوئی قابل ذکر چیز نہ تھا؟ ہم نے انسان کو ایک غلیظ نطفے سے پیدا کیا تاکہ اس کا امتحان لیں اور اس غرض کے لیے ہم نے اسے سننے اور دیکھنے والا بنایا۔ ہم نے اسے راستہ دکھا دیا، خواہ شکر کرنے والا بنے یا کفر کرنے والا۔''

سورۂ بلد میں ایک مختلف انداز میں یہی بات دہرائی گئی ہے:

اَلَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ عَيْنَيْنِ ○ وَ لِسَانًا وَّ شَفَتَيْنِ ○ وَ هَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ ○

(البلد: ۸-۱۰)

”کیا ہم نے اسے دو آنکھیں اور ایک زبان اور دو ہونٹ نہیں دیے؟ اور (نیکی اور بدی کے) دونوں نمایاں راستے اسے (نہیں) دکھا دیے؟“

گویا انسان کو وہ بنیادی رہ نمائی اور ہدایت، جس سے فی الواقع انسان، انسان بنتا ہے وہ اس کو فطرتاً الہام کر دی گئی ہے۔ اب یہ اس کا اپنا اختیار ہے کہ وہ کس راستے کو چنتا ہے۔ یہی انسان کا امتحان اور یہی اس کی آزمایش ہے، اور اسی کے لیے اس نے اس کے نفس کو ٹھیک ٹھیک بنایا ہے۔

سورۂ شمس کی ان ابتدائی آیات میں اللہ تعالیٰ نے کائنات اور دنیا کی وہ چیزیں، جو ہر وقت ہمارے مشاہدے میں ہیں، گواہ کے طور پر پیش کر کے نفس انسانی اور انسانی شخصیت کے بارے میں، جو دین کی تعلیم میں سب سے زیادہ بنیادی اہمیت کے حامل ہیں، فطرتاً انسان کو نیکی اور بدی کا شعور اور احساس دلایا ہے۔ اس نے نیکی اور بدی کی طرف فطری میلان دیا ہے، نیکی کو محبوب بنایا ہے اور بدی کو ناپسندیدہ۔ اب یہ انسان کے اپنے اوپر ہے کہ وہ نیکی کی راہ پر چلے، اپنے آپ کو پاک کرے، نشوونما دے، ترقی دے تو کامیابی حاصل کرے گا، اور اگر نفس کے اندر فطرتاً ودیعت کیے گئے نیکی کے جذبے کو مٹا دے، دبا دے تو وہ ناکام اور نامراد ٹھیرے گا۔

یہ بات کہ انسان خود اپنے نفس کے لیے ذمے دار اور جواب دہ ہے، اس کا لازمی تقاضا ہے کہ اس کو اختیار بھی حاصل ہو۔ اگر اختیار حاصل نہ ہو تو آدمی جواب دہ اور ذمے دار نہیں ہو سکتا۔ اگر وہ نیکی یا بدی کرنے پر مجبور ہے تو وہ اس کا مستحق نہیں کہ اس کا مواخذہ کیا جائے۔ اگر وہ فرشتوں کی طرح یا سورج چاند، یا دن رات کی طرح اللہ کی اطاعت کا پابند ہو تو اس کے لیے جنت کے دروازے نہیں کھل سکتے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ تو اس مخلوق کے لیے بنائی ہے، جو نیکی اور بدی، دونوں کا اختیار رکھتی ہو اور اپنے ارادے و مرضی سے نیکی کا راستہ اختیار کرے۔ اُن ساری آزمائشوں اور رکاوٹوں کے باوجود اس راہ کو اختیار کرے، جو اللہ نے اس کے امتحان کی خاطر اس کے اپنے نفس کے اندر بھی پیدا کر دی ہیں اور نفس سے ہٹ کر دنیا کے اندر بھی پائی جاتی ہیں۔ اسی لیے قرآن مجید میں بار بار ذکر کیا گیا ہے کہ دراصل زمین و آسمان کی ہر چیز اللہ کی مطیع، اس کی تسبیح کرنے والی اور اُس کے آگے سجدہ ریز ہے۔ لیکن صرف انسان ایسی مخلوق ہے، جو اگر چاہے تو اس راستے سے ہٹ سکتا ہے، جس راستے کے لیے اس نے اس کے نفس کو بنایا ہے۔ اسی

وجہ سے اللہ تعالیٰ نے نفسِ انسانی کی قسم کھائی اور جس کو اس نے بالکل ٹھیک ٹھیک اسی آزمائش کے لیے بنایا ہے۔ نفسِ انسانی کو ٹھیک ٹھیک بنانے کا ایک پہلو تو وہ ہے، جو میں نے مختصراً آپ کے سامنے بیان کیا ہے اور پہلے تفصیل کے ساتھ بیان کر چکا ہوں۔

نفس کو ہموار کرنے کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ انسان کو، جو چیزیں بظاہر ناپسندیدہ لگتی ہیں وہ بھی دراصل اس مقصد کے لیے ضروری ہیں، جس مقصد کے لیے اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کیا ہے۔

مثال کے طور پر ہم سمجھتے ہیں کہ لالچ بری چیز ہے لیکن لالچ فی نفسہٖ کوئی بری چیز نہیں۔ لالچ اگر کسی بری چیز کے لیے ہو تو غلط ہے اور اگر کسی اچھائی، نیکی اور جنت کے لیے ہو تو یہ انتہائی مرغوب اور انتہائی محبوب ہے۔ اگر آدمی کی فطرت میں لالچ نہ رکھی گئی ہوتی تو یہ ممکن ہے کہ وہ کسی بدی کا مرتکب نہ ہوتا لیکن نیکی بھی نہ کر پاتا۔ ممکن ہے وہ جہنم کی راہ پر نہ جاتا لیکن پھر وہ جنت کا طلب گار بھی نہ بنتا۔

اسی طرح دنیا کی محبت ہے۔ دنیا کی محبت تو ہمارے نزدیک بڑی ناپسندیدہ چیز ہے۔ مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ اگر نفسِ انسانی میں دنیا کی محبت نہ ہوتی تو آدمی دنیا میں مشقت برداشت کرنے کے لیے تیار نہ ہوتا:

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ كَبَدٍؕ (البلد: ۴)

"درحقیقت ہم نے انسان کو مشقت میں پیدا کیا ہے۔"

پوری انسانی زندگی مشقت میں گھیر دی گئی ہے۔ اگر دنیا کی محبت نہ ہوتی تو پورا تمدن اور پوری دنیا اجڑ کر رہ جاتی، حتیٰ کہ خاندان تک نہ بنتے۔ ماں باپ آخر کس لیے تیار ہوتے ہیں کہ اپنی راتوں کی نیند قربان کریں، بچے کو کندھے سے لگائیں، اس کو ٹہلائیں، جب کہ اُس سے ان کو کچھ نہیں ملتا۔ دراصل یہ دنیا کی محبت ہی ہے جو اللہ نے رکھی ہے اور جس کی وجہ سے پوری دنیا کا کاروبار چلتا ہے، آدمی مشقتیں اٹھاتا ہے، آزمائشوں سے گزرتا ہے اور اپنے لیے جنت کا سامان کرتا ہے۔ جب محبت حد سے گزر جاتی ہے تو پھر وہ فتنہ بن جاتی ہے لیکن جب تک یہ ایک حد کے اندر رہتی ہے اور اس پر اللہ کی محبت غالب رہتی ہے تو یہ فلاح اور خیر کا ذریعہ بنتی ہے۔ چناں چہ اللہ نے یہ مطالبہ نہیں کیا ہے کہ صرف اسی سے محبت کی جائے، البتہ بندگی کے لیے ضرور کہا ہے کہ صرف اسی کی بندگی کی جائے۔ لیکن محبت تو انسانوں سے بھی ہوگی، مال سے بھی ہوگی، مکان سے

بھی ہوگی اور کاروبار سے بھی۔ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ؕ (البقرۃ:۱۶۵) ''ایمان رکھنے والے لوگ سب سے بڑھ کر اللہ کو محبوب رکھتے ہیں۔'' اس سے محض یہ مراد نہیں کہ اہلِ ایمان صرف اللہ سے محبت کرتے ہیں بلکہ دیگر محبتوں کے مقابلے میں سب سے بڑھ کر اللہ سے محبت کرتے ہیں۔

یہاں دو مثالوں سے میں نے یہ بات واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ جن چیزوں کو بظاہر ہم اپنی راہ میں رکاوٹ سمجھتے ہیں، درحقیقت یہی چیزیں نیکی کی راہ پر چلنے کے لیے ہماری دوست اور حلیف بن سکتی ہیں۔ اگر ان کو انسان اپنی تربیت کے لیے صحیح طور پر استعمال کرے۔ سَوّٰهَا کے اندر یہ مفہوم بھی شامل ہے۔ اس سے یہ بات واضح ہوگئی کہ اللہ تعالیٰ نے نفسِ انسانی کو اُس آزمایش کے لیے بالکل صحیح اور مناسب بنایا ہے جو کہ انسان کی مطلوب ہے۔

فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَ تَقْوٰىهَا ۝ (الشمس:۸)

''پھر اس کی بدی اور اس کی پرہیزگاری اس پر الہام کردی۔''

یہاں بدی کے لیے فجور کا لفظ اور نیکی کے لیے 'تقویٰ' کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ یہ قرآن مجید کے عام الفاظ ہیں، جو جگہ جگہ استعمال ہوئے ہیں۔ دراصل بدی کا تصور یہ ہے کہ آدمی حد سے نکل جائے اور ان چیزوں کو، جو اس کے تصرف میں دی گئی ہیں، جن کا وہ ذمہ دار ٹھیرایا گیا ہے، ان کو وہ غلط طور پر استعمال کرے۔ قرآن مجید نے برائی کے لیے کئی الفاظ استعمال کیے ہیں۔ کہیں 'اسراف' کا لفظ آیا ہے، جس کے معنی ہیں حد سے گزر جانا، یعنی جو مناسب حد ہے، ہر چیز کی جو مناسب حد ہے اُس سے آگے بڑھ جانا۔ کہیں 'فساد' کا لفظ آیا ہے، جس کے معنی ہیں کسی چیز کے مزاج کا بگڑ جانا۔ 'ظلم' کے معنی ہیں کسی چیز کو ایسی جگہ پر رکھنا یا اس سے ایسا معاملہ کرنا، جو اس کی فطرت کے اور اس کے حق کے مطابق نہ ہو۔ 'فجر' کے معنی بھی یہی ہیں کہ کسی چیز کو توڑ کر باہر نکل آنا۔ صبح کی روشنی چوں کہ رات کی تاریکی کے پردے کو پھاڑ کر باہر نکلتی ہے، اسی لیے اسے 'فجر' کہا جاتا ہے۔ لہٰذا جو آدمی فطرت کی، اللہ کی حدود کو توڑ دے، یا حدود سے باہر نکل آئے تو پھر وہ برائی کی راہ پر چل پڑتا ہے۔

نیکی کے لیے یہاں 'تقویٰ' کا لفظ آیا ہے۔ نیکی دراصل عدل اور اعتدال کا نام ہے۔ ہر چیز کو اس کی حد میں رکھ کے، اُس حد میں، جو معقول بھی ہو اور جس کی تعلیم شریعت نے دی ہو، اس حد میں رکھ کر چلنا، یہ دراصل نیکی کا کمال اور نیکی کی معراج ہے۔ اس طرح سے ان دو لفظوں

کے ذریعے نیکی اور بدی کا تصور اجاگر ہو گیا۔

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا ۝ (الشمس:۹)

''یقیناً فلاح پا گیا وہ، جس نے نفس کا تزکیہ کیا۔''

'زَكّٰی' یعنی تزکیہ کا لفظ عربی زبان میں کسی چیز کو مسلسل اور تدریج کے ساتھ کرنے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اسی طرح عربی زبان میں عَلَّمَ کے معنی تعلیم دینا کے ہیں اور تعلیم ایک آدھ گھنٹے میں تعلیم و تربیت دینے کا نام نہیں بلکہ یہ ایک مسلسل اور بتدریج عمل کا نام ہے۔ ایک ہی چھلانگ میں آدمی تعلیم کے اونچے معیار پر نہیں پہنچ سکتا۔ قدم بہ قدم آگے بڑھے گا، مسلسل لگا رہے گا یا جدوجہد کرے گا، تب جا کر کہیں تعلیم کے اعلیٰ معیار تک پہنچ جائے گا۔ اسی طرح قرآن مجید میں نَزَّلَ کا لفظ جب آتا ہے تو اس کے معنی ہوتے ہیں کہ اس نے تدریج کے ساتھ آیاتِ الٰہی کو اتار کر قرآن مجید کو مکمل کر دیا۔ لہٰذا زَكّٰی یعنی تزکیہ کا لفظ بڑی خوب صورتی کے ساتھ اس بات کی طرف بھی اشارہ کر رہا ہے کہ اس سے مراد اپنے نفس کو سنوارنا ہے، جس مقصد کے لیے اللہ تعالیٰ نے اسے ٹھیک بنایا ہے اس کے مطابق اُس کی تعمیر کرنا ہے، اور یہ کام مسلسل اور بتدریج ہو گا۔ جو چاہے کہ ایک ہی چھلانگ میں اونچے درجات تک پہنچ جائے، چوں کہ عملاً ایسا ممکن نہیں لہٰذا وہ مایوسی کا شکار ہو گا۔ اسی طرح جو یہ چاہے کہ آج کام کرے اور کل چھوڑ دے، اس کے ہاتھ بھی کچھ نہیں آئے گا۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا ہے کہ ''اللہ کو وہ عمل زیادہ پسندیدہ اور محبوب ہے، جو خواہ تھوڑا کیا جائے لیکن باقاعدگی اور تسلسل سے کیا جائے۔''

'تقویٰ' کا لفظ نیکی کے لیے استعمال ہوتا ہے، جس کے معنی دراصل اپنی حد کے اندر رہنا اور حد سے نکلنے سے بچنے کے ہیں۔ یہی تقویٰ ہے۔ درحقیقت زندگی کا راستہ تو صاف، سیدھا اور واضح ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سارے انتظام فرما دیے ہیں کہ آدمی صراطِ مستقیم پر چل سکے۔ اس کی ایک خوب صورت مثال حدیث میں بیان کی گئی ہے۔

نبی کریم ﷺ نے صراطِ مستقیم کی مثال اس طرح پیش کی ہے، جیسے کوئی راستہ ہے اور اس راستے کی دونوں طرف دیواریں ہیں اور دیواروں میں دروازے ہیں اور ان دروازوں پر پردے پڑے ہوئے ہیں۔ جب آدمی اس راستے پر چلنے لگتا ہے تو اسے ایک پکار سنائی دیتی ہے کہ راستے پر سیدھے جانا اور ادھر ادھر مت نکل جانا۔ جیسے ہی وہ آگے بڑھتا ہے، اس کا دل چاہتا ہے کہ وہ پردہ

اٹھائے اور باہر دیکھے اور نکل جائے تو اس کے اندر سے ایک آواز اٹھتی ہے اور کہتی ہے کہ دیکھو ایسا مت کرو۔ پھر جو آدمی پردہ اٹھا کر باہر نکل جاتا ہے وہ گناہ میں مبتلا ہو جاتا ہے اور جو سیدھا چلتا رہتا ہے اور پہلی آواز اور دوسری آواز کو دھیان میں رکھتا ہے، وہ اپنی منزل پر پہنچ جاتا ہے۔

دنیا میں نیکی کے راستے پر چلنا کوئی مشکل کام نہیں۔ صرف یہ ہے کہ آدمی فجور، اعتدا، ظلم اور فساد سے بچے۔ فسق کے معنی بھی حد سے نکلنے کے ہیں۔ یہ وہ چیزیں ہیں، جن سے بچنے کی ضرورت ہے۔ جیسا کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ راستے کے سرے پر ایک واعظ ہے، جو پکارتا ہے اور یہ واعظ قرآنِ مجید اور اللہ کی وحی ہے۔ اللہ کی وحی یہ بتاتی ہے کہ کس راستے پر چلنا ہے اور کہاں باہر نکلنے سے بچنا ہے، اور جو آدمی راستے میں دروازہ کھول کر یا پردہ اٹھا کر باہر نکلنا چاہتا ہے، اس کے لیے ایک واعظ مقرر کر دیا گیا ہے۔ وَاعِظُ اللّٰهِ فِيْ قَلْبِ كُلِّ مُؤْمِنٍ یعنی ہر مومن کے دل میں اللہ نے ایک واعظ، ضمیر رکھ دیا ہے، جو اس کو ٹوکتا ہے اور بتاتا ہے کہ یہ مت کرو۔ لہٰذا تقویٰ کا لفظ اگرچہ منفی معنوں میں ہے لیکن یہ ساری نیکیوں کی جامع کلید ہے۔ اس کے معنی صرف یہی ہیں کہ صحیح حد میں رہنا اور حدود سے باہر نکلنے سے بچنا۔ یہی نیکی ہے۔

وَ قَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا (الشمس:۱۰)

''اور نامراد ہوا وہ، جس نے اس کو دبا دیا۔''

دَسّٰی کے معنی دبانے کے ہیں اور مٹانے کے بھی، یعنی جس نے اپنے نفس کو مٹا دیا اور دبا دیا۔ مٹی میں ملا دینا محاورتاً بھی استعمال ہوتا ہے۔ آدمی تو بنا ہی مٹی سے ہے۔ اللہ نے اس کے اندر اپنی روح پھونک کے اور اس کے اندر اچھائی برائی کی تمیز پیدا کر کے اسے انسانیت کا درجہ عطا کیا ہے۔ مگر جو خدا سے غافل ہو کر دوبارہ گناہوں کے اندر مبتلا ہو جائے، گویا اس نے اپنے نفس کو مٹی میں ملا دیا، برباد کر دیا اور نامراد ہو گیا۔

اس چھوٹی سی آیت کے اندر نفس کی تربیت اور تزکیے اور نفس کی کامیابی اور ناکامی کے اصول واضح کر کے جمع کر دیے گئے ہیں۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے کہ یہ سورتیں بہت چھوٹی اور مختصر ہیں، چند الفاظ پر مشتمل ہیں اور آسانی سے یاد ہو جاتی ہیں، آدمی انھیں بار بار پڑھتا ہے لیکن ان کے اندر معنی کا ایک سمندر ہے۔ ان پر آدمی غور کرے اور روز دہرائے اور بار بار دہرائے تو بہت مفید ہوگا۔ اس لیے کہ یہ دین کی بنیادی تعلیمات پر مبنی ہیں۔ احکامات کی تفصیلات تو آدمی

کسی جگہ سے بھی معلوم کرسکتا ہے لیکن یہ بنیادی باتیں جتنی راسخ ہوں گی اتنا ہی آدمی صحیح راستے پر چلے گا اور فطری بنیادوں پر اس کی شخصیت کی تعمیر ہوگی۔

کامیابی اور ناکامی، فلاح اور خسران کا یہ معاملہ صرف فرد کے ساتھ ہی نہیں ہے بلکہ گروہوں اور قوموں کے ساتھ بھی ہے۔ انسان تنہا نہیں ہے اور اکیلا پیدا نہیں ہوا ہے۔ وہ پیدا ہوتے ہی ایک خاندان کے بندھن میں بندھ جاتا ہے اور پھر بتدریج وسیع خاندان اور برادری کا حصہ بنتا چلا جاتا ہے۔ خاندان بھی ایک اجتماعی ادارہ ہے۔ اسی طرح بازار سے لے کر ریاست تک یہ سب اجتماعی دائرے ہیں۔ چناں چہ اجتماعی زندگی اور اجتماعیت سے بھی اللہ تعالیٰ کے وہی مطالبات ہیں جو ایک فرد سے ہیں کہ وہ سرکشی، بغاوت، حدود سے تجاوز، ظلم اور فساد سے بچے، اور معروف، نیکی اور خیر کی راہ کو اپنائے اور اس پر چلے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اگلی آیات میں ایک قوم کی مثال دے کر اس بات کو واضح کیا ہے۔

قرآن مجید میں قوموں کے قصے اس لیے بیان کیے گئے ہیں کہ ہم ان سے سبق لیں اور عبرت پکڑیں۔ یہ محض تاریخی واقعات اور قصے نہیں ہیں۔ ان سے ہمیں وہی سبق ملتا ہے جو ہماری فطرت کے اندر موجود ہے، جو سبق کہ چاند اور سورج، رات اور دن اور زمین و آسمان، سب ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں۔ انسانی تاریخ بھی اسی سبق کو دہراتی ہے اور یہ بتاتی ہے کہ اچھے اعمال کا اچھا بدلہ اور برے اعمال کا انجام برا ہے۔ اس لحاظ سے تاریخ ایک زبردست معلم ہے۔

دنیا میں اچھے لوگ بھی ہوتے ہیں اور برے بھی۔ اچھے لوگ غریب اور مفلس بھی ہوتے ہیں، آزمائشوں سے گزرتے ہیں اور بظاہر ختم ہوجاتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں برے لوگوں کے بارے میں یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے پھل پھول رہے ہوں اور مال و دولت، رعب و دبدبہ اور قوت و طاقت، سب کچھ ان کے پاس ہے۔ آدمی ظلم کرتا ہے اور بچا رہتا ہے۔ لیکن قوموں کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں اس بات کو کھول کر بیان کر دیا ہے کہ قوموں کے اعمال کا فیصلہ اسی زندگی میں ہوگا۔ اس زندگی سے مراد ہماری، آپ کی زندگی نہیں ہے بلکہ قومی زندگی اور اجتماعی زندگی ہے۔ یہ زندگی کئی سو برس پر بھی محیط ہوسکتی ہے۔ اسی لیے قومیں زوال کا شکار ہوتی ہے اور بالآخر صفحۂ ہستی سے مٹ جاتی ہیں۔

فَكُلًّا اَخَذْنَا بِذَنْبِهٖ (العنکبوت:۴۰)

''آخرکار ہر ایک کو ہم نے اس کے گناہ میں پکڑا۔''

فَهَلْ يُهْلَكُ اِلَّا الْقَوْمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝ (الاحقاف:۳۵)

''اب کیا نافرمان لوگوں کے سوا اور کوئی ہلاک ہوگا؟''

یعنی ظالموں اور فاسقوں کے علاوہ کوئی ہلاک نہیں ہوتا۔

افراد کے ساتھ یہ معاملہ نہیں ہے۔ آدمی اس لیے نہیں مرتا کہ وہ گناہ کرتا ہے، بلکہ اس لیے مرتا ہے کہ ہر ایک کو موت کا ذائقہ چکھنا ہے، برے کو بھی اور نیک کو بھی:

كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ (العنکبوت:۵۷)

''ہر متنفس کو موت کا ذائقہ چکھنا ہے۔''

کسی آدمی پر مصیبت اس لیے نہیں آتی کہ وہ ظلم کرتا ہے۔ ممکن ہے کہ ظلم کرنے والے پر مصیبت نہ آئے اور مظلوم پر مصیبت آجائے۔ لہٰذا ایک فرد کے ساتھ اس کے اعمال کا فیصلہ آخرت میں ہوگا مگر قوموں کا معاملہ دوسرا ہے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس سورہ میں، جو بشارت دی گئی ہے کہ ''یقیناً فلاح پا گیا وہ، جس نے نفس کا تزکیہ کیا'' سے کیا مراد ہے؟ دراصل یہ بشارت آخرت کے لیے ہے اور دنیا کے اندر معنوی نعمتوں کے لیے۔ دنیا میں سکون واطمینان اور یکسوئی بہت بڑی نعمتیں ہیں، جو نفس کا تزکیہ کرے گا، اسے یہ سب نعمتیں نصیب ہوں گی۔ لیکن قوموں کا انجام دنیا میں ہی ہوتا ہے۔ یہ انجام کس وجہ سے ہوتا ہے اور کس طرح سے ہوتا ہے۔ اس مختصر سورہ کے اندر اس حوالے سے بھی تاریخ کا فلسفہ بیان کر دیا گیا ہے۔

قرآن مجید میں، جن قوموں کا تذکرہ کیا گیا ہے اور مثالیں دی گئی ہیں، یہ ان قوموں کی مثالیں ہیں، جن سے قرآن سننے والے پہلے سے واقف تھے اور جانتے تھے۔ عاد، ثمود اور حضرت نوح علیہ السلام کی قومیں اہلِ عرب کے لیے معروف تھیں۔ یہاں قومِ ثمود کا تذکرہ بطورِ مثال کیا گیا ہے۔ یہ ایسے ہی جیسے ٹی بی کا مرض خواہ کسی کو ہو، سبب ایک ہوتا ہے۔ اگر موت واقع ہوتی ہے تو ایک ہی سبب سے اور اگر علاج ہوگا تو بھی ایک ہی طرح سے۔ ایسا ہی معاملہ اقوام کا بھی ہے۔

یہاں بظاہر قوم ثمود کا تذکرہ ہے، لیکن اقوام کے عروج وزوال سے متعلق اصول اور قانون بیان کیا گیا ہے۔ ثمود کا لفظ کسی بھی قوم پر چسپاں کر دیا جائے خواہ امریکہ پر، روس پر، یا خود مسلمانوں پر تو یہ بات اسی طرح سچ رہے گی، جس طرح ثمود کے بارے میں یہاں بیان کی گئی ہے۔

یہاں ثمود کے واقعے کی تفصیل بیان کیے بغیر فرمایا گیا:

كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ بِطَغْوٰهَآ ۝ اِذِ انْۢبَعَثَ اَشْقٰهَا ۝ فَقَالَ لَهُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ نَاقَةَ اللّٰهِ وَ سُقْيٰهَا ۝ فَكَذَّبُوْهُ فَعَقَرُوْهَا ۝ فَدَمْدَمَ عَلَيْهِمْ رَبُّهُمْ بِذَنْۢبِهِمْ فَسَوّٰىهَا ۝ وَلَا يَخَافُ عُقْبٰهَا ۝ (الشمس:۱۱-۱۵)

''ثمود نے اپنی سرکشی کی بنا پر جھٹلایا۔ جب اس قوم کا سب سے زیادہ شقی آدمی بپھر کر اُٹھا تو اللہ کے رسول نے ان لوگوں سے کہا کہ خبردار، اللہ کی اونٹنی کو (ہاتھ نہ لگانا) اور اس کے پانی پینے میں (مانع نہ ہونا)، مگر انھوں نے اس کی بات کو جھوٹا قرار دیا اور اونٹنی کو مار ڈالا۔ آخر کار اُن کے گناہوں کی پاداش میں اُن کے رب نے اُن پر ایسی آفت توڑی کہ ایک ساتھ پیوندِ خاک کر دیا، اور اُسے (اپنے اس فعل کے) کسی برے نتیجے کا کوئی خوف نہیں ہے۔''

ان مختصر آیات میں انتہائی اختصار اور جامعیت کے ساتھ قوموں کی تباہی، ان پر خدا کے عذاب کا سبب، تاریخ کا فلسفہ اور تاریخ سے جو سبق ملتا ہے، بیان کر دیا گیا ہے۔

''کس کو جھٹلایا'' یہاں اس کا ذکر نہیں کیا گیا۔ یہ قرآن مجید کا اندازِ بیان ہے۔ اگر وہ اس تفصیل میں جاتا کہ کس چیز کو جھٹلایا، تو یہ پورا بیان بے جان ہو جاتا۔ آیت کا سیاق بتا رہا ہے کہ یہاں جھٹلانے سے مراد نیکی کی تعلیم اور بدی سے بچنے کی ہدایت کو جھٹلانا ہے، اور جو لوگ یہ ہدایت لے کر آئے ان کو جھٹلانا ہے۔ اپنی فطرت کے تقاضوں کو اور تاریخ، چاند، سورج، دن اور رات، جو سبق سکھا رہے ہیں، ان سب کو جھٹلانا مراد ہے۔

كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ بِطَغْوٰهَآ ۝ (الشمس:۱۱)

''ثمود نے اپنی سرکشی کی بنا پر جھٹلایا۔''

یہاں قوم ثمود کے جھٹلانے کی وجہ بیان کی گئی ہے کہ انھوں نے سرکشی اختیار کی۔ طَغْوٰهَا کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، جس کے معنی طغیانی کے ہیں۔ طغیانی کہتے ہیں دریاؤں کا پانی سرکش ہو کر جن دو کناروں کے درمیان بہہ رہا ہو، ان سے باہر نکل کر پھیل جائے اور باہر نکل نکل

پڑے۔ بہتے دریا کے دو کناروں کی مانند نیکی اور بدی کا تصور بھی ہے کہ اللہ نے زندگی بسر کرنے کے لیے، جو حدود مقرر کر دی ہیں، جن اصول وضوابط کا تعین کر دیا گیا ہے آدمی ان کو عبور کر جائے اور ان کی خلاف ورزی کرے۔ یہ تو ایک فرد کا معاملہ ہے۔ جب قومیں ظلم اور فساد پر آمادہ ہوتی ہیں تو اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ لوگ اپنے حق سے زیادہ لینا چاہتے ہیں اور دوسروں کو ان کے حق سے کم دینا چاہتے ہیں۔ یہ بات اللہ تعالیٰ نے ایک دوسری جگہ بھی بیان فرمائی ہے کہ سارے انسان صحیح راستے پر تھے۔ اس کے بعد ان میں بگاڑ پیدا ہوا اور یہ بگاڑ اس لیے پیدا ہوا کہ لوگوں نے بغاوت کی اپنے حق سے زیادہ لینے کی اور دوسروں کو ان کے حق سے کم دینے کی۔ آج بھی سیاست، معیشت، خاندان اور اجتماعی زندگی میں یہی وجہ فساد کی جڑ ہے، یعنی اپنے حق سے زیادہ لینا اور دوسرے کو اس کے حق سے کم دینا۔

قرآن مجید نے جب بھی قوموں سے مطالبہ کیا ہے تو یہی کیا ہے:

وَ اَقِیۡمُوا الۡوَزۡنَ بِالۡقِسۡطِ وَلَا تُخۡسِرُوا الۡمِیۡزَانَ ۝ (الرحمٰن:۹)

"انصاف کے ساتھ ٹھیک تولو اور ترازو میں ڈنڈی نہ مارو۔"

یہ بنیادی تعلیم ہے کہ ہمیشہ عدل وانصاف پر قائم رہو۔ کبھی عدل کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹے۔ لوگوں کے حقوق پامال نہ کیے جائیں۔ عدل، حق اور راستی سے ہٹنے کی وجہ یہ نہیں ہے کہ یہ بات غلط ہے۔ نہیں، بلکہ انسانی فطرت یہ گواہی دیتی ہے کہ بات تو صحیح ہے۔ سب جانتے ہیں کہ نیکی کیا ہے اور بدی کیا ہے، رشوت لینا برا ہے، کسی کا حق مارنا جائز نہیں۔ درحقیقت زیادہ لینے کی ہوس، حد سے باہر نکل جانے کی کشش اور سیدھے راستے سے پردہ اٹھا کر اس راستے کے باہر، جو نعمتیں نظر آتی ہیں ان کی طلب میں حد سے باہر نکل جانا، وہ وجوہات ہیں، جن کی وجہ سے آدمی نیکی کی سیدھی راہ اور سچی تعلیمات کو جھٹلاتا ہے اور بغاوت اور سرکشی کی راہ پر چل نکلتا ہے۔ ثمود نے بھی بغاوت کی یہی روش اختیار کی۔

ہر قوم کے اندر اچھے اور برے، نیک بخت اور بدبخت، ہر طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔ برے لوگ اگر جھٹلانے پر تل جائیں تو وہ پوری قوم کی بدبختی کا باعث بنتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ایک دوسرے مقام پر فرمایا ہے کہ جب ہم کسی قوم کو ہلاک کرنے کا ارادہ کرتے ہیں تو ہم ان کے اکابر کو مجرم بنا دیتے ہیں۔ ان کے لیڈر ظلم وزیادتی اور فساد وسرکشی کی راہ پر نکل کھڑے ہوتے

ہیں۔ نتیجتاً تباہی اور بربادی اس قوم کا مقدر ٹھیرتی ہے۔ قوم ثمود میں بھی ایسا ہی ایک بدبخت شخص اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور اس نے پوری قوم کو اس راستے پر لگا دیا، جو تباہی کا راستہ تھا۔

یہاں حضرت صالح علیہ السلام کا ذکر نہیں کیا گیا۔ قرآن مجید میں جگہ جگہ اس واقعے کا تذکرہ ملتا ہے اور تفصیل ملتی ہے کہ حضرت صالح علیہ السلام کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا تھا۔ قرآن مجید کسی واقعے کی کسی مخصوص جگہ پر اتنی ہی تفصیل بیان کرتا ہے، جو اس کے مقصد ہدایت کے لیے ضروری ہوتی ہے۔ غیر ضروری تفصیل نہیں بیان کی جاتی۔ اونٹنی کیا تھی؟ واقعہ کیا ہوا؟ یہاں یہ بیان نہیں کیا گیا۔ بس یہ کہا کہ فَقَالَ لَهُمْ رَسُولُ اللّٰهِ نَاقَةَ اللّٰهِ وَ سُقْيٰهَا (الشمس: ۱۳) ''اللہ کے رسول نے ان لوگوں سے کہا: خبردار! اللہ کی اونٹنی کو (ہاتھ نہ لگانا) اور اس کے پانی پینے میں (مانع نہ ہونا)۔''

یہاں نَاقَةَ اللّٰهِ استعمال ہوا ہے۔ عربی زبان میں جب اس لفظ کے اوپر زبر آ جائے تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ اس کے اندر کوئی ایسی چیز ہے، جو حذف ہے۔ اس لیے کہ لفظ کے اوپر زبر خود سے نہیں آ سکتا۔ لہٰذا اس کے معنی یہ ہیں کہ یا تو یہ کہا کہ اس اونٹنی کے بارے میں اللہ سے ڈرو اور اس کے حقوق کا خیال رکھو۔ لیکن یہ حذف پڑھنے والا یا سننے والا خود ہوا کرتا ہے۔ قرآن کا انداز خطاب اور تقریر کا ہے، اور خطاب اور تقریر کے انداز میں ضروری نہیں ہوتا کہ فعل اور ہر چیز موجود ہو تو بات مکمل ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر 'تمھیں کیا چاہیے؟' 'رہن'۔ بس رہن کہنا کافی ہے۔ یہ نہیں کہ ''مجھے رہن چاہیے'' اس لیے کہ جو گفتگو کا سلسلہ ہوتا ہے وہ خود اس کو پورا کرتا چلا جاتا ہے۔ قرآن مجید میں یہ انداز جگہ جگہ استعمال ہوا ہے۔ اس لیے یہ نہیں بیان کیا گیا کہ اونٹنی کے بارے میں کہا گیا ہے، بس اشارہ کر دیا گیا کہ 'وَسُقْيٰهَا' اور اس کے پانی پینے کی باری ہے اُس کے بارے میں ڈرو، بچو اور حدود کا خیال رکھو۔

جہاں تک اونٹنی کے بارے میں معلومات کا تعلق ہے کہ اونٹنی میں کوئی خاص بات تھی یا نہیں تھی؟ اس سے کوئی بحث نہیں ہے۔ اونٹنی کیسے آئی؟ اس سے بھی کوئی بحث نہیں۔ پہاڑی سے نکلی یا جو اونٹنیاں قوم ثمود کے پاس پہلے سے موجود تھیں ان میں سے کسی اونٹنی کو حضرت صالح علیہ السلام نے نامزد کر دیا تھا، اس سے بھی قرآن مجید کی تعلیم اور ہدایت میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ معلومات اور دلچسپی کے لیے یہ سب کچھ پڑھا جا سکتا ہے۔ دراصل قومِ ثمود کی کہانی بھی مظلوم اور ظالم اور ظلم و سرکشی کی کہانی ہے۔ اونٹنی درحقیقت کمزور اور بے بسی کی علامت تھی، جب کہ قومِ ثمود ظلم، سرکشی اور

تعدی اور کمزروں کے حقوق دبانے والی قوم تھی۔ پوری قوم اس مرض کے اندر مبتلا تھی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی آزمایش کے لیے پانی کی باری مقرر فرما دی کہ ایک دن تم پانی لوگے اور ایک دن اونٹنی پانی پیے گی اور اس کے پانی پینے کی باری کا خیال رکھنا۔

حقوق کی حدود اور پابندیاں برداشت کرنا ہی اصل میں آزمایش ہے۔ جب انسان انھیں برداشت نہیں کرتا تو تقویٰ کے راستے سے ہٹ جاتا ہے۔ ظلم، فساد اور سرکشی کے راستے پر چل نکلتا ہے۔ یہ آزمائش دراصل ان کا امتحان تھا۔ یہ ان کی ساری برائیوں کو سامنے لانے کا باعث بنا۔ آج بھی کھیتوں کو پانی دینے اور فصلوں کو سیراب کرنے کے لیے کیا کچھ نہیں ہوتا، جھگڑے، ظلم اور قتل۔ جو زمین دار طاقت ور اور اثر ورسوخ والا ہوتا ہے وہ پانی کا رُخ زبردستی اپنی زمینوں کی طرف موڑ لیتا ہے اور دوسروں کو پانی کم دیتا ہے۔ یہ سب فساد کی شکلیں ہیں۔

قومِ ثمود سے یہ پابندی برداشت نہ ہوئی۔ ان کے درمیان ایک بد بخت آدمی تھا، جو ان کا رہنما بھی تھا۔ اس کے ساتھ بیسیوں لوگ تھے۔ اس نے ساری قوم سے کہا کہ ہم اس پابندی کو برداشت نہیں کر سکتے۔ کیا صرف ایک آدمی کے کہنے سے ہم یہ سب کچھ کریں گے؟ بظاہر کہنے والا تو ایک ہی آدمی تھا لیکن درحقیقت غیب کے پردے کے اندر اللہ کی ذات مستور تھی۔ چناں چہ فرمایا:

فَكَذَّبُوْهُ فَعَقَرُوْهَا ۝ (الشمس: ۱۴)

”ان سب نے اس کو جھٹلایا اور اونٹنی کو مار ڈالا۔“

یہاں صیغہ بدل گیا ہے۔ پہلے تھا کہ ایک آدمی کھڑا ہوا اور قوم نے جھٹلایا۔ اب کہا گیا ہے کہ سب کے سب نے جھٹلایا۔ یہ ایک اصولی بات ہے کہ قوم کے اندر اگر چند آدمی بھی برائی کے راستے پر نکل کھڑے ہوں اور پوری قوم کو ظلم وفساد کی راہ پر لے جائیں تو پوری قوم اس کی ذمے دار ہوتی ہے۔ چناں چہ سب کی طرف اشارہ ہے کہ سب اس جھٹلانے کے اندر شریک ہو گئے۔ جنھوں نے اونٹنی کے اوپر ظلم کیا اور اسے مارا اور وہ بھی، جنھوں نے ان کا ہاتھ نہیں پکڑا اور نہ انھیں روکا بلکہ خاموشی کے ساتھ اس کو برداشت کیا۔

احادیث میں آتا ہے کہ ایک لشکر اپنے اعمال کی وجہ سے زمین کے اندر دھنسا دیا جائے گا۔ حضرت عائشہؓ نے پوچھا: یارسول اللہ کیا اس میں نیک لوگ اور اچھے لوگ بھی ہوں گے؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ آخرت میں سب اپنی اپنی نیت اور اعمال کے مطابق اٹھائے جائیں گے۔ دنیا میں جب

کشتی ڈوبتی ہے تو کشتی میں سوار برے لوگوں کے ساتھ نیک لوگ بھی ڈوبتے ہیں۔ صرف انبیاء علیہم السلام کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے یہ وعدہ فرمایا ہے کہ جب قوم پر عذاب آئے گا تو وہ نبی کو اور اس کے ساتھ ایمان لانے والوں کو نجات دے گا۔ صرف ان پر عذاب نہیں آئے گا۔ وَ نَجَّیْنٰہُ ''اور ہم نے ان کو نجات دی۔'' یہ بات حضرت نوح علیہ السلام، حضرت صالح علیہ السلام، حضرت لوط علیہ السلام، حضرت ہود علیہ السلام اور ان کے ساتھ ایمان لانے والوں کے بارے میں فرمائی گئی ہے لیکن باقی لوگوں کے ساتھ یہ وعدہ نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دیگر لوگ یہ دعویٰ نہیں کر سکتے کہ انھوں نے دعوت کا حق اور اصلاح کے عمل کا حق ادا کر دیا ہے۔ صرف انبیائے کرام علیہم السلام کے بارے میں، جو اللہ کی نگرانی میں کام کرتے ہیں، یہ دعویٰ کیا جاسکتا ہے کہ انھوں نے اتمامِ حجت کر دیا، دعوت حق کا حق ادا کر دیا، اور وہ اس کے مستحق ہو گئے کہ ان کو نجات دی جائے اور کفر کی مرتکب قوم کو تباہ و برباد کر دیا جائے۔

فَکَذَّبُوْہُ فَعَقَرُوْھَا ۪ۙ (الشمس: ۱۴)

''مگر انھوں نے اس بات کو جھوٹا قرار دیا اور اونٹنی کو مار ڈالا۔''

یہاں تکذیب (جھوٹا قرار دینا، جھٹلانا) کسی قول کے ذریعے ہو رہی ہے۔ یہ بات اس لحاظ سے بھی اہم ہے کہ محض یہ کہنا کہ بات غلط ہے، جھٹلانا نہیں ہوتا بلکہ عمل سے بھی جھٹلانا تکذیب ہے۔ انھوں نے نبی کی مبنی برحق تعلیم کو بھی جھٹلایا کہ نافرمانی پر خدا کے عذاب کا شکار ہو سکتے ہیں۔ چناں چہ انھوں نے اللہ کی اس بات کو نہ مانا کہ اونٹنی کا خیال رکھنا، اس کے پانی پینے کی باری کا خیال رکھنا اور اس کا حق ادا کرنا ان کی ذمے داری ہے۔ پھر نہ صرف اللہ کی ہدایت کو پسِ پشت ڈالا، صریح حکم کو توڑا بلکہ یہاں تک جسارت کی کہ اونٹنی کو ہلاک کر دیا تاکہ سارا پانی ان کے حصے میں آجائے۔ انھوں نے یہ اقدام اس لیے کیا تھا کہ خدا کے عذاب کے بارے میں انھیں یقین نہیں تھا کہ یہ وعدہ سچا ثابت ہوگا۔ ان کا خیال تھا کہ اب تو ایک دن پانی ملتا ہے پھر دونوں دن پانی ہمارا ہوگا۔ انھوں نے یہ اقدام لالچ میں کیا اور اپنی سرکشی کی وجہ سے اسے جھٹلایا، اور سب اس نافرمانی اور گناہ کے ذمے دار ٹھہرے۔ چناں چہ پوری کی پوری قوم اپنی سرکشی اور نافرمانی کی بنا پر تباہ و برباد ہو کر رہ گئی۔

اس طرح یہاں قرآن مجید نے قوموں کی زندگی، ان کی اصلاح اور خیر، ان کے اندر

شر و فساد اور ظلم و سرکشی اور ان کی نجات اور کامیابی کے بارے میں مختصر اً بنیادی اصول، ضابطہ اور قانون بیان کر دیا ہے۔ یہ اللہ کی سنت ہے، جو کبھی نہیں بدلتی اور ہر قوم پر یکساں لاگو ہوتی ہے۔

فَدَمْدَمَ عَلَيْهِمْ رَبُّهُمْ بِذَنْۢبِهِمْ فَسَوّٰىهَا ﴿ (الشمس:۱۴)

''آخر کار ان کے گناہ کی پاداش میں ان کے رب نے ان پر ایسی آفت توڑی کہ ایک ساتھ سب کو پیوند خاک کر دیا۔''

یہاں پر پھر تصریح کی کہ جو عذاب آیا وہ ان کے گناہ (بِذَنْۢبِهِمْ) کی وجہ سے آیا۔ یوں ہی نہیں آ گیا کہ اللہ کی مرضی ہوئی اس نے قوم کو ہلاک کر دیا۔ دَمْدَمَ کے لفظ کے اندر خود عذاب کی کیفیت کا اظہار ہوتا ہے۔ وہ ایک زبردست چنگھاڑ یا چیخ تھی، جس نے پوری کی پوری بستی کو الٹ پلٹ کر اور تہس نہس کر کے رکھ دیا۔ البتہ وہ چنگھاڑ زلزلے کی تھی یا آتش فشاں پہاڑ کے پھٹنے کی، یہ تفصیلات قرآن مجید بیان نہیں کرتا۔ تاہم یہ واضح ہے کہ ان کے گناہوں کی پاداش میں اس پوری کی پوری قوم کو تہس نہس کر دیا گیا۔ یہاں فَسَوّٰىهَا (الشمس:۱۴) ''اور اس کو بالکل برابر کر دیا'' کا لفظ استعمال ہوا۔ یہ لفظ پہلے بھی اس سورہ میں استعمال ہوا ہے: وَ نَفْسٍ وَّ مَا سَوّٰىهَا (الشمس:۷) ''بالکل ٹھیک ٹھیک برابر اس طرح کر دیا، جیسا کہ نفس کو ہونا چاہیے تھا۔'' مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اُس بستی کو بھی اُسی طرح ملیامیٹ کر کے برابر کر دیا، جس طرح کہ بستی کے لوگوں کے گناہوں کا تقاضا تھا۔ ان کے ساتھ ایسا ہی ہونا چاہیے تھا۔ یہ بات انتہائی ہولناک تباہی کی طرف بھی اشارہ کر رہی ہے۔ یہ بھی واضح رہے کہ یہ اللہ کی طرف سے ان پر کوئی ظلم و زیادتی نہیں تھی بلکہ ان کی شامتِ اعمال کا نتیجہ تھا: وَمَا رَبُّكَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ﴿ (حٰم السجدۃ:۴۶) ''اور تیرا رب اپنے بندوں کے حق میں ظالم نہیں ہے۔''

وَلَا يَخَافُ عُقْبٰهَا (الشمس:۱۵)

''اور اسے (اپنے اس فعل کے) کسی برے نتیجے کا کوئی خوف نہیں ہے۔''

یعنی اعمال کی سزا دیتے ہوئے یہ خوف، ڈر یا اندیشہ ہوتا ہے کہ اس کا نتیجہ کیا نکلے گا؟ لیکن وہ اس سے نہیں ڈرتا۔ وَلَا يَخَافُ (الشمس:۱۵) ''وہ نہیں ڈرتا۔'' 'وہ' سے کیا مراد ہے؟ بعض مفسرین کے نزدیک اس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہے، اور بعض کے نزدیک اس کی نسبت

اس قوم کی طرف ہے اور ان شقی لوگوں کی طرف ہے، جو کھڑے ہو گئے اور جنھوں نے قوم کو اونٹنی کا حق مارنے پر آمادہ کیا اور بالآخر اونٹنی کو ہلاک کر کے ثابت کر دیا کہ وہ اللہ کے حکم کی خلاف ورزی کر رہے ہیں۔ ان کو اس بات کا کوئی ڈر نہ ہوا کہ ان کے اس فعل کا کیا انجام ہونے والا ہے۔ اس آیت کا ایک مفہوم یہ ہو سکتا ہے۔

اس کے ایک دوسرے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو قوموں کو ہلاک یا تباہ کرتے ہوئے کسی قسم کا خوف، خدشہ یا کسی بھی حوالے سے کوئی پروا نہیں ہوتی۔ اگر غور کیا جائے کہ آج اگر مسلمانوں پر ان کے اعمال کی وجہ سے ذلت اور مسکنت مسلط ہے تو اللہ کو اس کی کوئی پروا نہیں، جس طرح اللہ کو بنی اسرائیل کی کوئی پروا نہیں تھی۔ اگر آج سویت یونین صفحۂ ہستی سے ہی مٹ گیا تو اللہ کو اس کی کوئی پروا نہیں ہے۔ اس لیے کہ اس سے اس کا نہ تو کچھ بگڑتا ہے اور نہ اسے کچھ ملتا ہے۔ یہ تو انسان کے اپنے اعمال کا بدلہ ہے، جو اس کے حصے میں آتا ہے۔

اس سورہ کے ابتدا سے آخر تک، جیسا کہ آپ نے دیکھا کہ چھوٹے چھوٹے جملے ہیں، مختصر آیات ہیں۔ ان کو ہم بڑی آسانی سے یاد کر سکتے ہیں۔ بہت سوں کو یہ سورہ یاد بھی ہوگی، اس کو مختلف نمازوں میں پڑھتے بھی ہوں گے، اور ظہر، عصر، عشا، مختلف نمازوں میں حضورؐ کے ارشادات اور اسوہ سے اس کا پڑھنا ثابت بھی ہے۔ اسلام کی بنیادی تعلیمات اور ہدایت و راہ نمائی کے حوالے سے یہ بہت اہم سورہ ہے۔

اس سورہ کے اندر دونوں چیزیں جمع کر دی گئی ہیں۔ یعنی بہ حیثیت انسان ہمارے لیے بھلائی کا راستہ کیا ہے اور اس کی ذمے داری کیا ہے؟ دوسرا یہ کہ قوم کی تباہی اور ہلاکت کا سبب کیا ہے، اور عظمت و سربلندی کیسے حاصل کی جا سکتی ہے؟ ہمیں اختیار دیا گیا ہے کہ خواہ ہم نیکی کی راہ پر چلیں یا برائی کی راہ پر۔ نیکی کی راہ پر چلنا اور برائی سے بچنا، یہ ہماری فطرت کے اندر ودیعت ہے۔ اگر ہم نیکی کی راہ پر چلیں گے تو ہم فطرت اور ساری کائنات کے ہم رکاب ہوں گے۔

قوموں کے بارے میں یہ واضح کر دیا گیا ہے کہ دراصل جب آپس میں تعدی، زیادتی، ظلم اور ایک دوسرے کا حق مارنا، یہ چیزیں جب قوموں میں آتی ہیں تو پھر قومیں تباہی کے راستے پر چل نکلتی ہیں اور ہلاک و برباد ہو جاتی ہیں۔ جب وہ عدل و انصاف کے راستے پر گامزن رہتی ہیں، لوگ ایک دوسرے کے حقوق ادا کرتے ہیں، شوہر بیوی کے اور بیوی شوہر کے، پڑوسی پڑوسی

کے، حکمراں رعایا کے اور رعایا حکمراں کے تو اس کے بعد امن و انصاف، ترقی اور سربلندی ان کے حصے میں آتی ہے۔

یہ مختصر سورہ آپ یاد کریں اور ان معنوں میں سے جو بھی معنی آپ کے ذہن میں رہ سکتے ہوں، ان کو ذہن میں رکھیں۔ اس طرح دین کی بہت سی بنیادی تعلیمات بار بار آپ کے ذہن میں تازہ کرنے کے لیے یہ سورہ کافی ہوگی۔ اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ کو عمل کی توفیق عطا کرے۔ (آمین)

سورۃ الیل

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

وَالَّیْلِ اِذَا یَغْشٰی ۝۱ وَالنَّهَارِ اِذَا تَجَلّٰی ۝۲ وَمَا خَلَقَ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰی ۝۳ اِنَّ سَعْیَكُمْ لَشَتّٰی ۝۴ فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰی وَاتَّقٰی ۝۵ وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰی ۝۶ فَسَنُیَسِّرُهٗ لِلْیُسْرٰی ۝۷ وَاَمَّا مَنْۢ بَخِلَ وَاسْتَغْنٰی ۝۸ وَكَذَّبَ بِالْحُسْنٰی ۝۹ فَسَنُیَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰی ۝۱۰ وَمَا یُغْنِیْ عَنْهُ مَالُهٗۤ اِذَا تَرَدّٰی ۝۱۱ اِنَّ عَلَیْنَا لَلْهُدٰی ۝۱۲ وَاِنَّ لَنَا لَلْاٰخِرَةَ وَالْاُوْلٰی ۝۱۳ فَاَنْذَرْتُكُمْ نَارًا تَلَظّٰی ۝۱۴ لَا یَصْلٰىهَاۤ اِلَّا الْاَشْقَی ۝۱۵ الَّذِیْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰی ۝۱۶ وَسَیُجَنَّبُهَا الْاَتْقَی ۝۱۷ الَّذِیْ یُؤْتِیْ مَالَهٗ یَتَزَكّٰی ۝۱۸ وَمَا لِاَحَدٍ عِنْدَهٗ مِنْ نِّعْمَةٍ تُجْزٰۤی ۝۱۹ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْاَعْلٰی ۝۲۰ وَلَسَوْفَ یَرْضٰی ۝۲۱

اللہ کے نام سے، جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔

قسم ہے رات کی جب وہ چھا جائے، اور دن کی جب کہ وہ روشن ہو، اور اُس ذات کی جس نے نر اور مادہ کو پیدا کیا، درحقیقت تم لوگوں کی کوششیں مختلف قسم کی ہیں۔ تو جس نے (راہِ خدا میں) مال دیا اور (خدا کی نافرمانی سے) پرہیز کیا، اور بھلائی کو سچ مانا، اس کو ہم آسان راستے کے لیے سہولت دیں گے، اور جس نے بخل کیا اور (اپنے خدا سے) بے نیازی برتی

اور بھلائی کو جھٹلایا، اس کو ہم سخت راستے کے لیے سہولت دیں گے۔ اور اس کا مال آخر اس کے کس کام آئے گا جب کہ وہ ہلاک ہو جائے؟

تشریح: قسم درحقیقت کسی بات پر گواہی اور شہادت کے لیے کھائی جاتی ہے۔ بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ جس بات پر شہادت اور گواہی دی جا رہی ہو وہ بات قسم سے متصل ہی بیان کر دی جاتی ہے، جیسا کہ اس سورہ میں ہے۔ وہ وجہ یہ ہے: اِنَّ سَعۡیَکُمۡ لَشَتّٰی (الیل:۴) ''درحقیقت تم لوگوں کی کوششیں مختلف طرح کی ہیں۔'' یہاں تین مختلف قسمیں اسی بات پر کھائی گئی ہیں۔ کہیں ایسا ہوتا ہے کہ وہ بات متصل تو نہیں ہوتی، جس پر قسم کھائی گئی ہو لیکن اگر غور کیا جائے تو وہ بات آگے چل کر بیان کر دی جاتی ہے۔ کہیں ایسا ہوتا ہے کہ اس قسم کے بعد جو پورا مضمون بیان کیا جاتا ہے وہ اس پر دلالت کرتا ہے، جیسا کہ سورہ قٓ میں ہے: قٓ وَالۡقُرۡاٰنِ الۡمَجِیۡدِ○ (قٓ:۱) ''ق، اور قسم ہے قرآن مجید کی۔'' یہاں قرآن مجید کی قسم اٹھانے کے بعد آخرت کا مضمون بیان ہوا ہے۔ اس پورے مضمون پر قرآن مجید گواہ ہے۔ بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ جس چیز پر قسم کھائی جاتی ہے وہ بیان نہیں ہوتی، اس کا ذکر نہیں ہوتا اور وہ حذف ہوتی ہے، جیسا کہ سورۂ شمس میں تھا۔ اگرچہ مفسرین کی رائے میں قَدۡ اَفۡلَحَ مَنۡ زَکّٰھَا○ (الشمس:۹)، دراصل قسم کا موضوع ہے۔ یہاں سورۂ لیل میں، بہت صاف صاف ذکر کر دیا گیا ہے کہ رات، جب کہ وہ چھا جائے اور دن، جب کہ وہ روشن ہو جائے، اور نر اور مادہ کی تخلیق، جس طرح اللہ تعالیٰ نے فرمائی ہے وہ بھی اس بات پر گواہ ہے کہ تمھاری کوششوں کے نتائج مختلف اور طرح طرح کے ہیں۔

قرآن مجید میں دن رات، آسمان و زمین، بارش اور کائنات کی مختلف چیزوں کو گواہی کے طور پر پیش کیے جانے کا بنیادی مقصد اپنے نظریات و تعلیمات کو بہترین اسلوب میں پیش کرنا اور مخاطب کے ذہن نشین کرنا ہے۔ دراصل قرآن مجید کے پیش نظر تعلیم کا ایسا پیچیدہ مشن ہے، جو کسی بھی استاد کے بس سے باہر ہے۔ اسے تو ہر زمانے میں، ہر زبان بولنے والے کو، ہر طرح کی علمی استعداد رکھنے والے کو، چاہے وہ بدو ہو یا کسان، پڑھا لکھا ہو یا ان پڑھ، عالم ہو یا پی ایچ ڈی اور ہر عمر کے آدمی کو خواہ چھوٹی عمر کا ہو یا بڑی عمر کا، سب کو تعلیم دینا ہے۔

اس کے پیش نظر بنیادی طور پر قرآن مجید نے تین معلم مقرر کیے ہیں، جن کی رہ نمائی میں

آدمی اگر چاہے تو قرآنی تعلیمات کو سیکھ سکتا ہے۔ ان میں ایک کائنات کے مظاہر اور مناظر ہیں کہ جو سب کی نظروں کے سامنے ہیں، جن کا انسان رات دن مشاہدہ کرتا ہے۔ ان کو کبھی آیات کہا گیا ہے، کبھی نشانیاں اور کبھی ان پر غور وفکر کی دعوت دی گئی ہے۔ دوسرا معلم تاریخ ہے۔ خواہ اپنی زندگی کی تاریخ ہو یا قوموں کی، جب کہ تیسرا معلم انسان کا اپنا نفس ہے۔ اس کے اندر ایک پوری دنیا آباد ہے۔ اس کی نفسیات، کیفیات، ذہن، دل ودماغ، جسم، غرض سب چیزوں کو معلم بنایا گیا ہے۔ پھر ایک طریقہ مجادلے، مناظرے اور دلیل کا بھی ہے۔ یہ بھی تعلیم کے لیے اختیار کیا گیا ہے۔

یہاں جن تین چیزوں کی قسم کھائی گئی ہے، اگر غور کیا جائے تو یہ تینوں چیزیں ہماری نظروں کے سامنے ہیں۔ رات روز آتی ہے اور دن بھی، اسی طرح نر و مادہ کا وجود انسانوں اور جانوروں میں بھی ہے اور پودوں اور نباتات میں بھی۔ سب اس سے واقف ہیں۔ دنیا میں تخلیق کا جتنا بھی عمل ہے وہ اسی فرق کی وجہ سے ہے۔ رات جب چھا جاتی ہے تو تاریکی اور اندھیرا ہو جاتا ہے اور یہی اندھیرا انسان کے لیے سکون، آرام اور نیند کا باعث ہے۔ جب دن روشن ہوتا ہے تو گویا زندگی اٹھ کھڑی ہوتی ہے، ایک ہنگامہ برپا ہو جاتا ہے، لوگ اپنے اپنے کاموں میں لگ جاتے ہیں۔ ایک طرف روشنی ہے تو دوسری طرف اندھیرا، ایک طرف سکون و آرام ہے تو دوسری طرف دوڑ دھوپ، ہنگامہ، عمل اور سعی۔ بظاہر یہ مختلف اور متضاد چیزیں ہیں۔ اسی طرح نر اور مادہ اگرچہ ایک ہی جنس سے ہوتے ہیں، خواہ انسانی جنس سے ہوں یا پودوں اور نباتات کی جنس سے، البتہ ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔ یہی دو مختلف اور متضاد چیزیں مل کر کائنات کی تکمیل کرتی ہیں۔ ان میں سے کوئی ایک چیز بھی اگر اپنی جگہ پر نہ ہو تو دوسری چیز کا وجود اس کے بغیر بے معنی ہے۔

یہاں جو دو متضاد چیزوں کی قسم کھائی گئی ہے، مفسرین نے ان قسموں سے دو مفہوم مراد لیے ہیں۔ ایک یہ کہ دو متضاد چیزیں اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہیں کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے ان چیزوں میں اختلاف رکھا ہے، اسی طرح اس نے انسان کے اعمال میں بھی اختلاف رکھا ہے۔ جس طرح روشنی اور تاریکی میں اختلاف ہے، اسی طرح نیکی اور بدی میں اختلاف ہے۔ اسی طرح یہ فرق سچائی اور جھوٹ، سخاوت اور کنجوسی میں اور اپنے آپ کو برائیوں سے بچانے اور لاپروائی سے برائی کے پیچھے پڑ جانے میں پایا جاتا ہے۔ دو متضاد چیزوں کی قسمیں دراصل اس

اصولی اختلاف پر دلالت کرتی ہیں۔

دوسرا مفہوم یہ ہے کہ ان سب کا ایک جوڑا ہے اور یہ متضاد چیزوں کا ہے۔ دنیا کے اندر ہر چیز کا جوڑا پایا جاتا ہے۔ قرآن مجید میں اس بات کی طرف اشارہ بھی کیا گیا ہے:

وَ مِنْ كُلِّ شَیْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَیْنِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ○ (الذّٰریٰت:۴۹)

''اور ہر چیز کے ہم نے جوڑے بنائے ہیں، شاید کہ تم اس سے سبق لو۔''

سورۂ یٰسین میں فرمایا:

سُبْحٰنَ الَّذِیْ خَلَقَ الْاَزْوَاجَ كُلَّهَا مِمَّا تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ وَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ وَ مِمَّا لَا یَعْلَمُوْنَ○ (یٰسین:۳۶)

''پاک ہے وہ ذات، جس نے جملہ اقسام کے جوڑے پیدا کیے خواہ وہ زمین کی نباتات میں سے ہوں یا خود ان کی اپنی جنس (یعنی نوعِ انسانی) میں سے یا ان اشیاء میں سے، جن کو یہ جانتے تک نہیں ہیں۔''

جب ہر چیز کا جوڑا ہے تو دنیا کا بھی جوڑا ہونا چاہیے اور وہ ہے آخرت۔ اگر آخرت نہ ہو تو دنیا کی زندگی بے مقصد، عبث اور بے کار ہو جائے۔ نیکی اور بدی کا تصور اپنی جگہ بے معنی ہو کر رہ جائے۔ اگر بدی پر پکڑ نہ ہو، اس کا نتیجہ نمودار نہ ہو تو پھر آدمی کیوں نیکی کرے اور برائی سے اجتناب کرے۔

اِنَّ سَعْیَكُمْ لَشَتّٰى○ (الیل:۴)

''درحقیقت تم لوگوں کی کوششیں مختلف قسم کی ہیں۔''

یہ متضاد قسمیں دراصل اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ انسانوں کی کوششیں بھی مختلف قسم کی ہیں۔ انسان کی بھاگ دوڑ، کوشش اور کمائی کا آپس میں گہرا تعلق ہے۔ کیوں کہ کوشش سے ہی روپے پیسے اس کے ہاتھ میں آتا ہے۔ دونوں ایک دوسرے سے متعلق چیزیں ہیں۔ کسی نے اس کا ترجمہ صرف کوشش سے کیا ہے اور کسی نے اس کا ترجمہ کمائی اور نتیجے سے کیا ہے۔ ان دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ درحقیقت ایک ہی لفظ کے بہت سارے پہلو ہوتے ہیں۔ امام ابن تیمیہؒ کے اصولِ تفسیر کے مطابق یہ متضاد معنی نہیں ہوتے، بلکہ ہر ترجمہ کرنے والا، ہر مفسر، ہر سمجھنے والا، ان میں سے کسی ایک پہلو کو سامنے رکھ کر اس کا مطلب بیان کرتا ہے۔ ان سب کو جمع کیا جائے تو

سب نکات سے مل کر ایک تفسیر بنتی ہے۔ یہاں یہ مراد ہے کہ بعض لوگ نیکی کرتے ہیں اور بعض لوگ بدی۔ ان کا نتیجہ بھی ایک دوسرے سے مختلف ہوتا ہے۔ اس لیے قرآن مجید نے یہاں فرمایا کہ بے شک تمھارے کوششیں بھی الگ ہیں اور اس کا نتیجہ بھی انجام کے لحاظ سے الگ الگ ہے اور الگ الگ ہی ہونا چاہیے۔

غور کیا جائے تو یہ بات بھی واضح ہے کہ خدا نے ہر شخص کو نیکی اور بدی کی پہچان دی ہے۔ ہم میں سے کوئی کتنا ہی برا ہو، خدا کا انکار کرنے والا ہو، دہریہ ہو، مذہب سے انکار کرتا ہو لیکن کسی کام کے اچھا یا برا ہونے میں کسی انسان کو انکار نہیں ہوسکتا۔ اس پر بحث ہوسکتی ہے کہ کون سا کام اچھا ہے، کون سا برا لیکن اچھائی اور برائی کے لفظ سے ہر شخص اور ہر قوم بہ خوبی آشنا ہے۔ اسی تصور کی بنیاد پر خاندانی زندگی منظم ہوتی ہے، قانون بنتا ہے اور معاشرہ وجود میں آتا ہے۔ کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ نیکی اور بدی کا وجود ہی نہیں ہے۔

یہ کہنا کہ نیکی کرنا اچھا کام ہے اور برائی کرنا برا کام، اس سے کسی کو بھی اختلاف نہیں ہوسکتا۔ یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ نیکی اور برائی کے تصور میں اختلاف ہوسکتا ہے اور اس میں اختلاف بھی ہے لیکن جس کو آدمی نیکی سمجھے اس کا کرنا اچھا کام، اور جس کو برائی سمجھے اس کا کرنا برا کام سمجھا جاتا ہے۔ اس پر کسی کو اختلاف نہیں۔ دنیا کی حد تک، اچھے کام کرنے والے کو اچھا انعام ملنا چاہیے اور برے کام کرنے والے کو برا بدلہ ملنا چاہیے۔ یہ بھی ایک مسلمہ اصول ہے اور اس لیے قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے کہ تمھاری کوششیں الگ الگ ہیں اور ان کا انجام بھی الگ الگ ہے۔

انسان کی مختلف اور طرح طرح کی کوششیں اور اعمال، مزاج اور افتادِ طبع کے لحاظ سے اور نوعیت اور اخلاقی طور پر بھی، ہر لحاظ سے الگ ہیں۔ جتنے بھی اچھے یا برے اعمال، جو کسی بھی ضابطۂ اخلاق میں، کسی بھی شریعت میں، یا قوموں کی زندگی میں پائے جاتے ہیں، انھیں قرآن مجید بنیادی طور پر دو صنفوں میں تقسیم کرتا ہے۔ پھر ہر صنف کے اندر اس نے مزید تین طرح کے اعمال کا ذکر کیا ہے، تین اچھے اور تین برے اعمال۔ ایسا نہیں ہے کہ ان اعمال کا ذکر یوں ہی کر دیا ہے بلکہ یہ اپنی جگہ پر، سارے اچھے اور سارے برے اعمال کی جڑ اور بنیاد کی حیثیت رکھتے ہیں۔ سب اچھے اور برے اعمال پر یہ جامع ہیں اور سب کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہیں۔ ابتدائی دور میں تفصیلی احکام نہیں دیے گئے، لہٰذا یہاں بنیادی احکام کی تعلیم دی گئی ہے کہ جن سے آدمی کا

مزاج، افتادِ طبع اور سوچ بنتی ہے اور طرزِ عمل کا تعین ہوتا ہے۔ یہ محض اعمال ہی نہیں ہیں بلکہ ان کے پیچھے ایک خاص قسم کا مزاج، سوچ اور ذہن کارفرما ہے، جو ایک مخصوص طرزِ زندگی کے لیے بنیادی محرک کا کردار ادا کرتا ہے۔ ابتدائی دور میں قرآن مجید کی تعلیم کا یہی انداز اور منہج تھا۔ اس کا بنیادی مقصد وہ سوچ پیدا کرنا تھا، جس کے نتیجے میں وہ ذہن بن سکے، جو اسلامی طرز زندگی کو عملاً اپنانے کے لیے تیار ہو اور ایسا ذہنی سانچہ بن جائے کہ بالآخر وہ سارے احکام جو بعد میں آنے والے ہیں، جن پر شریعت مشتمل ہے، اس سانچے کے اندر فٹ ہو جائیں اور آدمی کے اندر وہ استعداد، صلاحیت اور قوت پیدا ہو جائے، جس کی بنیاد پر وہ ان پر عمل کر سکے۔

فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰی وَاتَّقٰیۙ وَ صَدَّقَ بِالْحُسْنٰیۙ فَسَنُیَسِّرُهٗ لِلْیُسْرٰیؕ (الیل:۵-۷)

''پس جس نے دیا اور بچا، اور سچ مانا خوب صورت اور اچھی چیز کو۔ پھر ہم اس کو آسانی کر دیں گے آسان چیز کے لیے۔''

یہ لفظی ترجمہ ہے۔ ذرا غور کریں تو اس کے اندر بہت سے معنی پنہاں ہیں۔ پہلی بات کہی گئی: اَعْطٰی ''دیا''۔ کیا دیا؟ یہاں بیان نہیں کیا گیا۔ کس کو دیا؟ یہ بھی بیان نہیں کیا گیا۔ کتنا دیا؟ یہ بھی بیان نہیں فرمایا گیا۔ یہاں ''دینا'' مجموعی طور پر ایک انسانی رویے کے معنوں میں آیا ہے۔ اس کا تعلق انسان کے کردار، اس کے ذہن، سوچ، نہج اور طرزِ عمل سے ہے، جس کو وہ اختیار کرتا ہے۔

انسان کو بنیادی طور پر دو چیزیں سب سے بڑھ کر محبوب ہوتی ہیں: ایک، مال اور دوسرے جان۔ مال، جائداد، کاروبار، بنک بیلنس، روپیہ پیسہ، یہ چیزیں اسے سب سے بڑھ کر محبوب ہوتی ہیں۔ پھر اسے اپنی جان اور اپنا وقت محبوب ہوتا ہے۔ اپنی جان اور وقت سے بھی آدمی مال اور دنیا ہی کماتا ہے۔ اس لیے ہمارے ترجمہ کرنے والوں نے جہاں بھی اس آیت کا ترجمہ کیا ہے وہاں مال دیا، اللہ کی راہ میں خرچ کیا کے الفاظ بڑھا دیے ہیں۔ خود اسی سورہ میں آگے چل کر مال کی طرف اشارہ بھی کیا گیا ہے۔ وَمَا یُغْنِیْ عَنْهُ مَالُهٗۤ اِذَا تَرَدّٰی (الیل:۱۱) ''اور اس کا مال آخر کس کے کام آئے گا، جب کہ وہ ہلاک ہو جائے گا۔'' اسی طرح فرمایا: وَسَیُجَنَّبُهَا الْاَتْقَیۙ الَّذِیْ یُؤْتِیْ مَالَهٗ یَتَزَكّٰیۚ (الیل:۱۸) ''اور اس سے دور رکھا جائے گا وہ

نہایت پرہیزگار، جو پاکیزہ ہونے کی خاطر اپنا مال دیتا ہے۔'' تزکیے کا ذکر سورۃ شمس میں بھی آچکا ہے۔ لہٰذا اس کا ایک مطلب تو مال ہے لیکن جب قرآن مجید نے مال نہیں کہا تو کوئی ضروری نہیں ہے کہ ہم اس کو مال تک محدود کریں بلکہ اس کے اندر ہر چیز کا دینا شامل ہے، جو بھی اللہ تعالیٰ نے کسی کو بخشی ہے۔ اگر وقت دیا ہے تو وقت دینا، جان دی ہے تو جان دینا، جسم اور ذہن کی قوتیں دی ہیں تو ان کا کھپانا .... یہ سب اسی دینے میں آتے ہیں۔ دل کے اندر وسعت پیدا کرنا تاکہ دوسرے کو معاف کیا جاسکے، یہ بھی اسی کے اندر آجائے گا۔ اسی طرح اور بہت ساری چیزیں اس ضمن میں آتی ہیں۔

اصل چیز اَعطٰی ''دیا'' ہے۔ اس اَعطٰی کے پیچھے ایک پوری سیرت کارفرما ہے۔ سب سے پہلی چیز تو یہ کہ انسان یہ یقین رکھتا ہے کہ اس کے پاس کوئی چیز اس کی اپنی نہیں ہے۔ جو کچھ ہے وہ سب اللہ کی ملکیت ہے: لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ط (البقرۃ: ۲۸۴) ''آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے سب اللہ کا ہے۔'' اس کی جان، اس کا جسم، اس کی قوتیں، اس کا مال، سب کچھ اس کے پاس ایک امانت ہیں اور ان کا اصل مالک اللہ تعالیٰ ہے۔ جہاں اس کو اس بات کا حق دیا گیا ہے اور اس بات کو پسند بھی کیا گیا ہے کہ اپنے دل و دماغ، جسم و جان، مال و دولت سب چیزوں کو اپنی ذات کے لیے خرچ کرے، وہاں اسے دوسروں کے لیے جینے کی تعلیم بھی دی گئی ہے۔

ہر انسان، خاص طور پر جو اللہ کا بندہ ہو، اس کو جہاں ایک طرف اللہ پر ایمان لانے کا حکم دیا گیا ہے، وہاں اسے ناداروں کو کھانا کھلانے، یتیموں، مسکینوں، بیواؤں اور دوسرے انسانوں کے حقوق ادا کرنے کی بھی تاکید کی گئی ہے۔ قرآن مجید میں جہاں پر ایمان کا ذکر آتا ہے وہاں کھانا کھلانے کا اور دوسروں کے حقوق ادا کرنے کا ذکر بھی آتا ہے۔ جہنم میں کون جائے گا، کس کو زنجیروں سے باندھا جائے گا، کس کے گلے میں طوق پہنائے جائیں گے؟ ان سب کا تعلق بھی مسکین کو کھانا کھلانے اور مال خرچ کرنے سے ہے:

اِنَّهٗ كَانَ لَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ الْعَظِيْمِ ۝ وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ ۝ (الحاقۃ: ۳۳، ۳۴)

''یہ نہ اللہ بزرگ و برتر پر ایمان لاتا تھا اور نہ مسکین کو کھانا کھلانے کی ترغیب دیتا تھا۔''

دراصل یہ دوسری بات ہے کہ آدمی خودغرض نہ ہو۔

جب اللہ تعالیٰ نے اس امت کو برپا کیا تو اس نے کہا کہ یہ امت خودغرض نہیں ہے۔ اس کو اپنے مفاد کے لیے برپا نہیں کیا گیا ہے بلکہ فرمایا:

كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ تَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ط (آل عمران:۱۱۰)

''اب دنیا میں وہ بہترین گروہ تم ہو، جسے انسانوں کی ہدایت واصلاح کے لیے میدان میں لایا گیا ہے۔ تم نیکی کا حکم دیتے ہو، بدی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔''

لہٰذا یہ بات واضح ہے کہ اسلام کی ابتدائی تعلیمات سے لے کر دین کی تکمیل تک راہِ خدا میں خرچ کرنا، جو کچھ اللہ نے عطا کیا ہے اس کو دوسروں کو دینا بالکل بنیادی چیز ہے، جس کی تعلیم دی گئی ہے اور جس پر پورے دین کی عمارت تعمیر ہوتی ہے۔

جدید مغربی فلسفیوں میں سے بعض نے یہ بحث بھی اٹھائی ہے کہ دو قسم کے طرزِ زندگی ہیں، جس کو انگریزی میں Giving way of life اور Having way of life کہا جاتا ہے۔ 'ہیونگ وے آف لائف' یہ ہے کہ آدمی چاہتا ہے کہ ہر چیز مجھے مل جائے، جو میری خواہش ہو وہ فوراً پوری ہو۔ جدید سائنس اور ٹکنالوجی کو اس غرض کو حاصل کرنے کے لیے بروئے کار لایا جائے، ایجاد کیا جائے، مارکیٹ میں لایا جائے، جلد از جلد میرے قبضے میں آ جائے اور میں اس کو اپنے استعمال میں لاؤں اور اپنا معیارِ زندگی بہتر کروں۔ یہ طرزِ عمل فساد کا ذریعہ ہے۔ جو افراد یا اقوام اس روش کو اپناتے ہیں وہ فساد کا باعث بنتے ہیں۔ پھر آدمی دوسروں کو ان کے حق سے کم دینا چاہتا ہے اور خود اپنے حق سے زیادہ لینا چاہتا ہے۔

وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ إِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ ۝ وَ إِذَا كَالُوْهُمْ أَوْ وَّزَنُوْهُمْ يُخْسِرُوْنَ ۝ (المطففین:۱-۳)

''تباہی ہے ڈنڈی مارنے والوں کے لیے جن کا حال یہ ہے کہ جب لوگوں سے لیتے ہیں تو پورا پورا لیتے ہیں اور جب ان کو ناپ کر یا تول کر دیتے ہیں تو انھیں گھاٹا دیتے ہیں۔''

گویا جب خود لیتے ہیں تو پورا لینا چاہتے ہیں بلکہ حق سے زیادہ لینا چاہتے ہیں، مگر جب دوسروں کو تول کر دیتے ہیں تو چاہتے ہیں کہ کچھ کم کر دیں۔ یہ بھی خودغرضی کا نتیجہ ہے۔ اَعْطٰی میں جو

بات کہی گئی ہے کہ ''اس نے دیا''، اس طرزِ عمل کو اپنانے سے آدمی خودغرضی سے اپنے آپ کو بے نیاز کرلیتا ہے۔ دراصل فساد کی جڑ یہ ہے کہ آدمی خودغرض ہوجائے، جس کا ذکر آگے بھی آئے گا۔ نیکی کی اصل بنیاد راہِ خدا میں دینا ہے۔ اللہ کے دین کے لیے دینا اور انفاق فی سبیل اللہ کے لیے دینا اور انفاق فی سبیل اللہ بھی کہ جو لوگ محروم اور مانگنے والے ہیں ان کو دینا، اسی میں ہر چیز آجاتی ہے:

وَ فِیۡۤ اَمۡوَالِہِمۡ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَ الۡمَحۡرُوۡمِ ۝ (الذٰریٰت:۱۹)

''اور ان کے مالوں میں حق ہے سائل اور محروم کے لیے۔''

کسی کا کام کرنا، کسی کی حاجت روائی کرنا، حدیث میں اس کی بڑی تاکید کی گئی ہے۔ حضور ﷺ مصلّے پر امامت کے لیے کھڑے ہوتے ہیں کہ ایک بوڑھی عورت آکر آپ ﷺ کا ہاتھ پکڑ کر لے جاتی ہے، اپنا کام کراتی ہے، اس کے بعد آکر آپ ﷺ امامت کراتے ہیں۔ سبھی حضور ﷺ کا انتظار کرتے رہتے تھے۔ اسی طرح آپ ﷺ کے پاس جو کچھ مال ہوتا تھا وہ دے دیا کرتے تھے۔ آپ ﷺ کی پوری زندگی اَعۡطٰی کا مرقع تھی۔ آپ ﷺ فرمایا کرتے تھے: اَنَا قَاسِمٌ ''میں تقسیم کرنے والا ہوں۔''

عطا کرنا، دینا اور خودغرضی سے بچنا، یہ دراصل دین کی پہلی بنیاد ہے۔ اگر زندگی میں خودغرضی ہو، مال جمع کرنے، سینچ سینچ کر رکھنے، گن گن کے رکھنے اور اس کو بڑھاتے رہنے کی فکر ہو تو یہ طرزِ عمل فلاح اور تزکیے کا طرزِ عمل نہیں ہے۔ اسی بات کی طرف سورۂ ہمزہ میں یوں اشارہ کیا گیا ہے:

وَیۡلٌ لِّکُلِّ ہُمَزَۃٍ لُّمَزَۃِۣ ۝ الَّذِیۡ جَمَعَ مَالًا وَّ عَدَّدَہٗ ۝ (الھمزۃ:۱،۲)

''تباہی ہے ہر اس شخص کے لیے جو (منہ در منہ) لوگوں پر طعن اور (پیٹھ پیچھے) برائیاں کرنے کا خوگر ہے، جس نے مال جمع کیا اور اسے گن گن کر رکھا۔''

وَ اتَّقٰی ۝ (الیل:۵)

''اور (خدا کی نافرمانی سے) پرہیز کیا۔''

یہ دوسری بات ہے۔ تقویٰ کے بنیادی معنی تو بچنے کے ہیں، اور یہ اللہ تعالیٰ نے انسان کی فطرت میں رکھا ہے کہ وہ اپنے آپ کو اس چیز سے بچائے، جس سے اسے نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو۔ قرآن مجید میں جن صفات کو بھی اپنانے کی تعلیم دی گئی ہے ان میں سے کوئی بھی صفت

ایسی نہیں ہے، جو مسلط کر دی گئی ہو بلکہ ان میں سے ہر صفت کی جڑ انسان کی فطرت میں پائی جاتی ہے۔ اسی بات کو ہمارے حکما کہتے ہیں: ''جلب منفعت اور دفعِ مضرت'' یعنی جو چیز نفع پہنچانے والی ہو اس کو آدمی حاصل کرتا ہے اور جو چیز نقصان پہنچانے والی ہے اس سے آدمی بچتا ہے۔ انسان کی فطرت میں یہ بالکل بنیادی جذبہ ہے۔ پوری زندگی اور تہذیب وتمدن اسی جذبے پر استوار ہوتا ہے۔ جنگیں اسی لیے لڑی جاتی ہیں، جھگڑے اسی لیے ہوتے ہیں، صلح اسی لیے ہوتی ہے، انسان دوسروں کے کام بھی اسی لیے آتا ہے۔ بس یہ کہ نفع ونقصان کے معیار بدلتے رہتے ہیں۔ البتہ ان سب کے پیچھے بنیادی محرک نفع ونقصان کا یہی جذبہ ہے۔

یہاں اللہ تعالیٰ نے تقویٰ کا لفظ استعمال کیا تو یہ نہیں فرمایا کہ میرے غضب سے بچو، میری آگ سے بچو بلکہ اصل چیز تو یہ ہے کہ آدمی کو اس بات کی فکر ہو کہ جو چیز بھی نقصان پہنچانے والی ہو، اس سے وہ بچے۔ جب یہ یقین اور استعداد پیدا ہو جائے کہ نقصان پہنچانے والی چیز تو اللہ کی ناراضی اور اس کی نافرمانی ہے اور اسے اس چیز سے بچنا چاہیے، جو نقصان پہنچانے والی ہو، تو پھر وہ اللہ کی ناراضی سے بھی بچے گا اور اس کے غضب اور آگ سے بھی بچے گا۔ اس بات کا ذکر آگے بھی آرہا ہے لیکن یہاں بالکل بنیادی بات کہی جارہی ہے۔

اس بات کو ہم دو طرح سے سمجھ سکتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ جو تین باتیں یہاں کہی گئی ہیں، یہ تینوں دراصل ایک ہی بات کے تین پہلو ہیں۔ پھر ہم اس کا ترجمہ یوں کریں گے: فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰى جس نے دیا، وَاتَّقٰى اور دینے میں جو چیزیں خرابی پیدا کرنے والی ہیں ان سے بچا، وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰى اور بھلائی کو سچ مانا۔ حُسْنٰی کے معنی ہیں اچھی چیز۔ یہ لفظ حسن اور خوب صورتی سے نکلا ہے۔ پھر اس کے معنی یہ ہوں گے کہ جس نے اللہ کی راہ میں جان و مال لگایا اور اپنی صلاحیتوں اور قوتوں کو کھپایا اور اس کے بدلے میں اللہ نے جس اجر کا وعدہ کیا ہے اس کو اس نے سچ مانا اور سچ جانا۔

اگر ہم اَعْطٰی کو ان معنوں میں لیں کہ اللہ کی راہ میں مال دینا ہو تو پھر اس کا اہتمام ہو کہ اس میں ریاکاری اور نمود ونمائش نہ ہو اور اس سے بچا جائے۔ آدمی برا مال نہ دے بلکہ اچھا مال تنگ دلی سے نہیں بلکہ خوش دلی کے ساتھ دے اور دینے کے بعد احسان نہ جتلائے، اور تکلیف نہ دے کیوں کہ ایسا مال دینا کسی اجر کا باعث نہیں۔ پھر اِتَّقٰی کے معنی یہ ہوں گے کہ جو چیزیں مال

دینے کے عمل کو خراب کرنے والی ہیں، اللہ کو ناراض کرنے والی ہیں ان سے اپنے آپ کو بچایا جائے، اور مال دینے پر اللہ نے جس اچھے اجر کا وعدہ کیا ہے، جنت کا اور بہت سارے انعامات کا، اس پر یقین رکھا جائے کہ یہ ملے گا اور اس کو سچ جانا جائے۔ گویا یہ تینوں صفات دراصل ایک ہی صفت کے تین پہلو ہیں۔

مفسرین کی رائے میں بعض آیات کی ایک خاص نسبت اور شان نزول ہوتی ہے لیکن ان کے عام معنی بھی ہوتے ہیں۔ جیسا کہ مذکورہ بالا آیات کے ہیں۔ ان تین آیات کی شانِ نزول یہ ہے کہ یہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے بارے میں ہیں۔ اس کے بعد کی تین آیات میں کنجوسی اور اللہ تعالیٰ کے بارے میں لاپروائی کا ذکر ہے۔ وہ امیہ بن خلف جو قریش کا ایک سردار تھا اس کے بارے میں ہیں۔ امام رازیؒ کہتے ہیں کہ ہوسکتا ہے کہ ان کے بارے میں یہ آیات نازل ہوئی ہوں لیکن کوئی وجہ نہیں کہ ہم انھیں صرف ان کے ساتھ خاص کر دیں۔ دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ تعالیٰ نے کہا ہے: اِنَّ سَعْیَکُمْ لَشَتّٰیO (الیل:۴) ”درحقیقت تم لوگوں کی کوششیں مختلف قسم کی ہیں۔“ اس لحاظ سے یہ سب کے لیے اہم ہیں اور ہر زمانے کے لیے ہیں۔ اسی طرح اَعْطٰی دینے میں، مال کی تخصیص اللہ تعالیٰ نے نہیں کی ہے اور صَدَّقَ بِالْحُسْنٰی ”بھلائی کو سچ مانا“ میں بھی اچھے اجر کا ذکر صرف مال دینے کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ لہٰذا اس کے معنی یہ ہوں گے کہ ہر اس کام سے اپنے آپ کو بچایا جائے، جو اللہ کی ناراضی کا باعث ہو اور برا کام ہو، جس سے اس کو نقصان پہنچتا ہو اور جس سے اس کا نفس مٹی میں ملتا ہو۔

اللہ نے انسان کو فجور اور تقویٰ کا جو الہام کیا ہے، جس کا ذکر سورۂ شمس میں وہ فرما چکا ہے، تقویٰ دراصل ان نافرمانیوں اور فجور سے بچنے کا نام ہے۔ فجر کے معنی پھٹ جانے کے ہیں۔ یہ بھی اصطلاحی مفہوم ہے، لیکن اس کے بنیادی معنی یہ ہیں کہ آدمی اپنی حدود پھلانگ جائے، جس طرح صبح رات کی تاریکی سے پھٹ کر باہر نکل آتی ہے اور پانی پتھر کے پھٹنے سے بہہ نکلتا ہے۔ ان سب کے لیے قرآن مجید نے فجر کے مختلف صیغے استعمال کیے ہیں۔ لہٰذا تقویٰ یہ ہے کہ آدمی اپنے آپ کو فجور سے بچائے، اللہ کی نافرمانی سے بچائے اور حد سے نکلنے سے بچائے۔

وَ صَدَّقَ بِالْحُسْنٰیO (الیل:۶)

”اور بھلائی کو سچ مانا۔“

قرآن مجید کا اعجاز اور اس کا کمال ہے کہ وہ ایسے الفاظ ڈھونڈ کر استعمال کرتا ہے جن کے اندر معانی کی ایک دنیا آباد ہو، جیسے حُسن اور حَسَن۔ حُسن کے معنی خوب صورتی کے ہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ نیکی اور اس کا اللہ کے ہاں جو بدلہ ملنے والا ہے، وہ دونوں بڑی خوب صورت اور بہترین چیزیں ہیں۔ ان کی آدمی کے دل کے اندر کشش ہوتی ہے، اور کشش ہونا چاہیے۔ حسنیٰ کے معنی مفسرین نے مختلف کیے ہیں۔ بعض نے کہا کہ اس سے مراد وہ شخص ہے، جس نے راہ خدا میں مال بھی دیا، جان بھی دی، سب کچھ لگایا، برائی کو برائی سمجھا اور اپنے آپ کو اس سے بچایا اور نیکی کی تصدیق کی۔ یہاں حسنیٰ نیکی اور بھلائی کے معنوں میں آیا ہے۔ بعض نے کہا کہ حضرت ابن عباسؓ کے قول کے مطابق اس کے معنی لَآ اِلٰہَ اِلاَّ اللّٰہُ کے ہیں۔ اس لیے لَآ اِلٰہَ اِلاَّ اللّٰہُ ایمان کی بنیاد ہے اور نیک اعمال، ایمان ہی کی ساری شاخیں ہیں۔ حدیث میں ہے کہ ایمان کی ۷۲ شاخیں ہیں۔ سارے اعمال اور اخلاق ایمان ہی سے پھوٹتے ہیں۔ یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کیوں کہ اس لفظ کے معنی کئی ہیں۔

کوئی معنی بھی لیں وہ سب سمٹ کر ایک ہی بات کی طرف لوٹتے ہیں۔ بعض نے کہا کہ اس کا مطلب ساری نیکی کی باتوں کی تصدیق کرنا ہے۔ بعض کے مطابق اس میں حسنیٰ سے مراد اللہ تعالیٰ نے انسان پر جو انعامات کیے ہیں، یعنی آنکھیں دی ہیں، کان دیے ہیں، ہاتھ پاؤں دیے ہیں، مال دیا ہے، ان سب کی تصدیق کرنا ہے۔ گویا اگر آدمی اس حقیقت کو تسلیم کرے کہ یہ سب اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا انعام ہے تو اس کے معنی ہیں کہ وہ شکر کا راستہ اختیار کرے۔ شکر کا راستہ یہ ہے کہ ان نعمتوں کو اللہ کی راہ میں، اللہ کے حکم کے مطابق، اللہ کی مرضی حاصل کرنے کے لیے کھپائے، نیز دوسروں کی خدمت کرے اور اپنے آپ کو برائی سے بچائے۔

تین چھوٹے چھوٹے جملوں میں، جو ایک ایک لفظ پر مشتمل ہیں: اَعْطٰی، وَاتَّقٰی، وَ صَدَّقَ بِالْحُسْنٰی، شریعت کی بنیادوں کو سمیٹ کر جمع کر دیا گیا ہے۔ یہ قرآن مجید کا ہی اعجاز اور کمال ہے کہ چھوٹے چھوٹے بول کے اندر بڑی بڑی باتیں سمیٹ کر رکھ دیتا ہے، جنھیں ہر آدمی یاد کر سکتا ہے۔ ایک بدو، جاہل اور ان پڑھ بھی اور ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ بھی۔ پڑھا لکھا چاہے تو اس پر پوری ایک کتاب لکھ ڈالے اور ایک اَن پڑھ کے لیے اس میں اتنا علم ہے کہ وہ اس کام سے، جس سے اللہ ناراض ہوتا ہے بچ سکتا ہے، اور اگر وہ اللہ کی راہ میں اپنا مال خرچ کرے، اور اللہ

نے جس نیکی کی تعلیم دی ہے اور اچھے اجر کا وعدہ کیا ہے اس کو طلب کرے اور اس پر یقین رکھے۔ کامیابی اور نجات کے لیے بس اتنا ہی کافی ہے۔ پھر جتنا چاہے آدمی مزید عمل کرے۔

ایک پہلو یہ بھی ہے کہ ایک عمل سے دوسرے عمل کو تقویت پہنچتی ہے۔ لہٰذا جب ایک شخص اللہ کے وعدوں کو سچ جانتا ہے، اپنے آپ کو برائیوں سے بچاتا ہے تو پھر اسے راہِ خدا میں مال دینے میں بھی کوئی رکاوٹ نہ ہوگی اور وقت آنے پر وہ اپنی جان بھی فدا کر دے گا۔ اس کے اندر تقویٰ کی صفت پیدا ہوگی، جس کے نتیجے میں اس کا خدا پر ایمان بڑھے گا اور اللہ کے وعدوں کا سچا ہونے پر یقین راسخ ہوگا۔ اس طرح ایک عمل سے دوسرے عمل کو تقویت ملتی چلی جاتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اللہ نے اس عقیدے کو مزید پختہ کرنے کے لیے کہ برائی کا نتیجہ جہنم اور نیکی کا بدلہ جنت ہے، اس نے جہاں بھی تقویٰ کا ذکر کیا ہے وہاں اپنے عذاب سے بھی ڈرایا ہے اور جنت کے وعدے کا ذکر بھی کیا ہے۔ اِنَّ لِلْمُتَّقِيْنَ مَفَازًا (النباء:۳۱) ''یقیناً متقیوں کے لیے کامرانی کا ایک مقام ہے۔'' یعنی جس نے تقویٰ اختیار کیا وہ جنت پائے گا۔ یہ امر جہاں خوف خدا اور ایمان میں تقویت کا باعث ہے وہاں راہِ خدا میں استقامت کا ذریعہ بھی ہے۔

فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْيُسْرٰى (الیل:۷)

''اس کو ہم آسان راستے کے لیے سہولت دیں گے۔''

یہاں دنیا اور آخرت کی طرف اشارہ ہے، یعنی ہم اس راہ میں اس کو سہولت دیں گے اور اس کے لیے آسانیاں پیدا کر دیں گے۔ شاہ عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ نے اس کا ترجمہ کیا ہے کہ ''ہم اس کو سہج سہج پہنچائیں گے آسانی کی جگہ۔'' اب یسریٰ کے معنی جنت ہیں، جیسا کہ میں نے کہا کہ ایک ہی لفظ کے مختلف پہلو ہیں، مختلف مفسرین نے اس کے الگ الگ پہلوؤں کی طرف اشارہ کیا ہے۔ لہٰذا اس کے معنی یہ ہیں کہ جس نے دیا، اپنے آپ کو بچایا اور اللہ کے وعدوں پر یقین رکھا، اس کو ہم اتنی ہی آسانی کے ساتھ جنت دیں گے۔

فَسَوْفَ يُحَاسَبُ حِسَابًا يَّسِيْرًا ○ (الانشقاق:۸)

''اس سے ہلکا حساب لیا جائے گا۔''

گویا حساب بھی آسان ہوگا، جنت کی طرف کا راستہ بھی آسان ہوگا اور پل صراط پر

سے بھی پلک جھپکنے میں گزر جائے گا۔ اسے وہاں کسی مصیبت سے واسطہ نہیں پڑے گا یا کوئی مشکل پیش نہیں آئے گی۔ یوں اس طریقے سے وہ جنت میں پہنچ جائے گا۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا آدمی جنت میں یوں ہی پہنچ جائے گا؟ اس لیے مفسرین کے نزدیک اس کے یہ معنی بھی ہیں کہ دنیا میں جو جنت کا راستہ ہے اللہ تعالیٰ وہ بھی اس کے لیے آسان کردیں گے۔ دنیا میں جنت کا راستہ، نیکی کا راستہ ہے۔ ان نیکیوں میں سے تین بنیادی نیکیوں کا ذکر اس سورہ میں کردیا گیا ہے۔ گویا جو آدمی نیکی کی راہ اپنائے گا، اس کے لیے نیکی کا راستہ آسان کردیا جائے گا، اور اس کے لیے نیکی کرنا آسان ہوگا اور برائی کرنا مشکل۔ اللہ تعالیٰ اس کی طبیعت، اس کا مزاج ایسا بنادیں گے کہ اس کو نیکی کرنے میں سہولت نظر آئے گی اور برائی کرنے میں مشکل۔ اس طریقے سے اس کی فطرت اور مزاج کا سانچہ ہی بالآخر نیکی کے سانچے میں ڈھل جائے گا۔

اگر یہ کہا جائے کہ یہ دراصل اللہ تعالیٰ کا کام ہے، ہمارے کرنے کا کام نہیں ہے۔ اس ضمن میں ایک حدیث بھی ہے۔ حضرت علیؓ سے بخاری میں مروی ہے کہ ایک دن حضورﷺ قبرستان میں گئے۔ کوئی میت دفن ہونے والی تھی۔ آپﷺ زمین پر بیٹھ گئے۔ پھر آپﷺ نے تنکا لے کر زمین پر لکیریں بنائیں، ایسے ہی عادت کے طور پر، پھر آپﷺ نے کہا کہ ہر آدمی کا ٹھکانہ مقرر ہے، جنت یا دوزخ۔ صحابہؓ نے عرض کیا: پھر ہم عمل کیوں کریں؟ اس پر آپﷺ نے یہی آیت پڑھی اور فرمایا: جو نیکی کرے گا، اس کو نیک ٹھکانے پر پہنچنا ہے۔ اس کے لیے نیک کام کرنا سہل اور آسان ہوگا اور جس کو نہیں پہنچنا ہے اس کے لیے آسان نہیں ہوگا۔ بعض مفسرین نے سات آٹھ احادیث نقل کی ہیں، جن میں یہی موضوع ہے۔ حضورﷺ نے انھی آیات کو تلاوت کرکے فرمایا: نہیں، کوشش کرو۔ اگر تم اچھے کام کرو گے تو اس کا مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمھیں اچھے کاموں کے لیے اہل بنایا ہے۔ وہ اچھے کاموں کو تمھارے لیے آسان بنادے گا۔ اگر برے کام کرو گے تو اس کا مطلب ہے کہ تمھیں برے کاموں کا اہل بنایا ہے اور وہ برے کاموں کو تمھارے لیے آسان بنادے گا۔

وَ اَمَّا مَنْۢ بَخِلَ وَاسْتَغْنٰىۙ وَ كَذَّبَ بِالْحُسْنٰىۙ فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰىؕ

(الیل: ۸-۱۰)

''اور جس نے بخل اور (اپنے خدا سے) بے نیازی برتی اور بھلائی کو جھٹلایا، اس کو ہم سخت راستے کے لیے سہولت دیں گے۔''

یہاں تین بری صفات کا تین بھلی باتوں کے مقابلے میں ذکر کیا گیا ہے۔ حضرت شاہ عبدالقادر جیلانی علیہ الرحمہ اس کا ترجمہ کرتے ہیں: ''اور بے پروا رہا اور جس نے بھلی بات کو اور بھلے اجر کو جھوٹ جانا اور جھوٹ مانا۔'' یعنی اگر پہلے تھا ''دیا'' تو یہاں پر ہے ''نہیں دیا۔''

بخل، دل کی تنگی کا نام ہے۔ یہ پہلی چیز ہے۔ اس کے بعد پھر جیب کی تنگی بھی ہے اور سب کچھ دینے میں تنگ دلی ہے، جو آدمی کے اندر پیدا ہوتی ہے۔ بخل ان برائیوں میں سے ہے کہ جو جھوٹ کے بعد سب سے بڑی برائی ہے۔ جیسے سچائی کے بعد سخاوت سب سے بڑی نیکی ہے، اسی طرح جھوٹ کے بعد سب سے بڑی برائی بخل ہے۔ مومن کبھی بخیل نہیں ہوسکتا اور نہ کنجوس ہوسکتا ہے۔ پھر یہ کنجوسی بھی صرف مال کے بارے میں نہیں ہے بلکہ ہر چیز کے بارے میں ہے۔ جب اپنا وقت دینے کا مرحلہ آئے تو آدمی اپنا وقت نہ دینا چاہے۔ جب توجہ دینے کا مرحلہ آئے تو توجہ نہ دینا چاہے۔ کسی کا کام کرنے کے لیے محنت کرنا پڑے تو محنت نہ کرنا چاہے۔ صرف اپنے لیے محنت کرے، اپنے لیے جیے، اپنے لیے قوتیں صرف کرے، دوسروں کے لیے کنجوسی کرے اور تنگ دلی کا مظاہرہ کرے۔

یہ بات بھی واضح رہنی چاہیے کہ آدمی بس جوڑ جوڑ کے ہی رکھے تو کنجوس نہیں ہوتا ہے بلکہ آدمی جمع کرے اور خرچ کرے تو صرف اپنے ہی مشاغل پر تو وہ بھی بخیل ہے۔ شادی بیاہ ہو تو لاکھوں لگا دیے، مکان بنانا ہو تو لاکھوں کروڑوں اڑا دیے، لباس خریدنا ہو تو کھڑے کھڑے دو اڑھائی ہزار کا لباس خرید لیا، لیکن اگر کوئی فقیر ہاتھ پھیلائے تو چار آنے دینے سے بھی پہلے تحقیق کرے کہ یہ مستحق ہے یا نہیں۔ اگر مستحق ہے تو چار آنے نہیں بلکہ ایک روپے دیں گے اور اگر نہیں ہوگا تو نہیں دیں گے اور پھر پیچھے ہرکارے دوڑائیں گے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرَاۨ ۙ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ وَ يَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ وَ يَكْتُمُوْنَ مَآ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ؕ

(النساء: ۳۶، ۳۷)

''یقین جانو اللہ کسی ایسے شخص کو پسند نہیں کرتا، جو اپنے پندار میں مغرور ہو اور اپنی بڑائی

پر فخر کرے۔ اور ایسے لوگ بھی اللہ کو پسند نہیں ہیں، جو کنجوسی کرتے ہیں اور دوسروں کو بھی کنجوسی کی ہدایت کرتے ہیں اور جو کچھ اللہ نے اپنے فضل سے انھیں دیا ہے اسے چھپاتے ہیں۔"

پھر دوسری عمدہ بات یہ بتائی:

وَ مَنْ یَّبْخَلْ فَاِنَّمَا یَبْخَلُ عَنْ نَّفْسِہٖ ؕ (محمد:۳۸)

"حالاں کہ جو بخل کرتا ہے وہ درحقیقت اپنے آپ ہی سے بخل کر رہا ہے۔"

یعنی جو بچا کر رکھتا ہے اور جس کو دینا ہے اس کو نہیں دیتا، وہ دراصل اپنے آپ ہی سے کنجوسی کرتا ہے۔ اگر دے گا تو اس کے اپنے کام آئے گا، محفوظ ہو جائے گا، بنک میں جمع ہو جائے گا، اس کا اکاؤنٹ اللہ کے پاس کھل جائے گا۔ اس اکاؤنٹ سے قیامت کے روز جب اس کو ضرورت ہوگی تو وہ چیک جاری کر کے نکلوا سکتا ہے۔ اس کے مقابلے میں جو یہاں پر بچا بچا کر رکھے گا، ادھر اس کی آخری سانس آئے گی اور ادھر سب کچھ اس کے تصرف سے باہر ہو جائے گا۔ اس بات کو ایک حدیث میں یوں بیان کیا گیا ہے کہ آدمی کہتا ہے مَالِیْ مَالِیْ میرا مال، میرا مال۔ وہ کہتا ہے وہ دیکھو میرا کارخانہ کھڑا ہے، یہ میرا کاروبار ہے، یہ میرا بنک بیلنس ہے۔ درحقیقت اس کا مال وہی ہے، جو اس نے کھا لیا، یا پی لیا یا اللہ کی راہ میں دے دیا۔ بس اور کچھ اس کا نہیں۔ بلکہ دوسروں کا مال ہے، وارثوں کا مال ہے، وہی اس کو کھائیں گے اور پئیں گے وہ اس کو نہیں کھا پی سکتا اور نہ وہ اس کے کچھ کام آ سکتا ہے۔ یہ ہے بخل کی اور مال کی حقیقت!

وَاسْتَغْنٰی ۙ (الیل:۸)

"بے نیازی برتی۔"

اِسْتِغْنٰی کے معنی بے نیاز ہونا اور لاپروا ہونا کے ہیں۔ یہاں پر بھی یہ نہیں فرمایا کہ کس چیز سے بے نیاز ہوا اور کس چیز سے بے پروا ہوا؟ اگر یہ کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ سے بے نیاز ہو گیا تو پھر یہ معنی ہوں گے کہ کبھی نہیں سوچتا کہ اللہ کو کیا چیز پسند ہے اور کیا ناپسند؟ وہ کیا چاہتا ہے اور کیا نہیں چاہتا؟ اس نے کیا حکم دیا ہے اور کیا حکم نہیں دیا؟ وہ شخص اپنا سب کام کرتا ہے، مال کماتا ہے، کاروبار کرتا ہے، خرچ کرتا ہے، شادی بیاہ کرتا ہے، دن رات گزارتا ہے، سوتا جاگتا ہے لیکن بھولے سے بھی اسے یہ خیال نہیں آتا کہ اللہ تعالیٰ نے ان معاملات کے بارے میں کیا حکم دیا

ہے؟ یہ ہے استغنیٰ اور خدا سے بے نیازی۔ یہ سب سے بڑا شرک ہے۔

اگر غور کیا جائے تو جدید زمانے کا استغنیٰ اللہ سے انکار ہے۔ اس انکار کی کیا کیفیت ہے؟ اس کے بارے میں ایک مشہور فرانسیسی فلاسفر کہتا ہے کہ "لوگ کہتے ہیں کہ تم اللہ کا انکار کرتے ہو، حالاں کہ ہم اللہ کا انکار نہیں کرتے، ہمیں اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہے کہ خدا ہے یا نہیں۔ ہمیں اس کی کوئی پروا نہیں ہے، ہماری زندگی میں اس کا کوئی عمل دخل نہیں ہے۔ ہمارا اس سے کوئی واسطہ یا معاملہ نہیں ہے۔" یہ استغنیٰ کی، خدا سے بے نیازی اور انکار کی انتہائی شکل ہے، جو موجودہ دور میں پائی جاتی ہے کہ سارا کاروبار چلتا رہے بغیر یہ سوچے کہ اللہ تعالیٰ کیا چاہتا ہے۔

نیکیوں اور برائیوں کے اجر سے اور اس کی سزا سے بھی استغنیٰ ہے۔ اس کا ذکر قرآن و حدیث میں بھی آتا ہے۔ اسی طرح اپنی بھلائی اور اپنی بہتری سے اور اپنے انجام سے بے نیازی کہ کیا ہونے والا ہے، یہ بھی استغنیٰ ہے۔ اسی بات کو اللہ تعالیٰ نے ایک دوسری جگہ یوں فرمایا ہے:

وَ لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ نَسُوا اللّٰهَ فَاَنْسٰىهُمْ اَنْفُسَهُمْ ؕ (الحشر:۱۹)

"ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ، جو اللہ کو بھول گئے تو اللہ نے انھیں خود اپنا نفس بھلا دیا۔"

گویا اللہ نے انھیں ان کے نفس کے حوالے کر دیا، اس کی بھلائی سے بے نیاز کر دیا اور انھیں فراموش کر دیا۔ استغنیٰ برائیوں کی جڑ بھی ہے۔ جب آدمی لاپروا ہو جائے تب ہی وہ گناہ کرتا اور فجور میں پڑتا ہے۔ یہ فجور اس کی فطرت میں الہام کیا گیا ہے۔

وَ كَذَّبَ بِالْحُسْنٰى ۙ فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰى ۙ (الیل:۹،۱۰)

"اور جس نے بھلائی کو جھٹلایا، اس کو ہم سخت راستے کی سہولت دیں گے۔"

گویا جس نے اچھی اور نیک باتوں کے بیان پر اللہ کے وجود کو جھٹلایا، اس کے لیے بدی کی راہ آسان ہو جائے گی۔ عُسریٰ کے معنی یُسریٰ کی ہی طرح مفسرین نے مختلف معنی بیان کیے ہیں۔ عُسریٰ کے معنی دراصل یہ ہیں کہ آدمی کے لیے جہنم، جو تنگی و دشواری کی جگہ ہے، تک پہنچنے کی راہ آسان ہو جائے۔ اس کے لیے نیکی کرنا مشکل اور برائی کرنا آسان ہو جاتا ہے۔ نیکی کے لیے اس کا سینہ تنگ ہونے لگتا ہے اور دل بھینچنے لگتا ہے۔ جب وہ کسی کو مال دیتا ہے، یا کوئی نیکی کرتا ہے، یا کسی کا حق ادا کرتا ہے، یا عبادت کے لیے، نماز کے لیے خصوصاً فجر کے لیے اٹھنا، یہ سب کام اس کے لیے مشکل ہو جاتا ہے۔ لہٰذا اس کے لیے ہم آسان کر دیں گے کا مطلب یہ

ہے کہ اس کی طبیعت اور مزاج ہی ایسا بن جاتا ہے کہ نیکی کرنا اس کے لیے مشکل ہو جاتی ہے اور بالآخر وہ برائی کا مرتکب ہو کر رہتا ہے۔

وَ مَا یُغْنِیْ عَنْهُ مَالُهٗۤ اِذَا تَرَدّٰیؕ (الیل:۱۱)

''اس کا مال آخر اس کے کس کام آئے گا، جب کہ وہ ہلاک ہو جائے گا؟''

تَرَدّٰی کے معنی ''گرے گا'' بھی ہیں اور اس کے معنی موت کے بھی ہیں۔ بعض کے نزدیک اس سے مراد قبر کے گڑھے میں گرنا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آخری سانس کے بعد تو مال کچھ کام نہیں آئے گا۔ ایک حدیث میں بھی کہا گیا ہے کہ قبر تک آدمی کے ساتھ، اس کے رشتے دار جاتے ہیں، اس کا مال اور اس کے اعمال جاتے ہیں۔ رشتے دار بھی کام نہیں آسکتے، واپس آجاتے ہیں۔ مال بھی کام نہیں آتا، واپس آجاتا ہے، جب کہ صرف اعمال ساتھ جاتے ہیں اور وہی کام آتے ہیں۔

مال کی حقیقت کیا ہے؟ یہی کہ جب کوئی افتاد پڑ جائے، نقصان ہو جائے، حادثے کا شکار ہو جائے، آنکھ چلی جائے، آدمی بیمار پڑ جائے لاکھوں خرچ کر ڈالتا ہے، لیکن مال کام نہیں آتا۔ اگر کوئی رشتہ دار مر جائے یا اس دنیا سے رخصت ہو جائے تو بھی مال خرچ کر کے اسے لوٹایا نہیں جاسکتا۔ جب انسان قبر کے گڑھے میں جائے گا تو وہاں پر بھی مال کام نہیں آئے گا۔ جس مال کے لیے دنیا میں بخل کرتا ہے، کنجوسی کرتا ہے اور اللہ سے بے نیازی اور لاپروائی برتتا ہے، وہ اس کے کسی کام آنے والا نہیں ہے۔

اس سورہ کی ابتدائی گیارہ آیات میں رات اور دن کی شہادت اور نر اور مادہ کی شہادت و گواہی اس بات پر ہے کہ انسان کی کوششیں اور اعمال مختلف ہیں اور مختلف نتائج کے حامل ہیں۔ یہاں دو قسم کے طرزِ زندگی، دو طرح کی سوچ اور دو قسم کے اعمال پیش کیے گئے ہیں۔ راہِ خدا میں دینا، برائیوں سے بچنا اور نیکیوں کے اجر پر یقین رکھنا ــــ یہی دراصل دین کی بنیادی تعلیمات ہیں، جو ان پر چلے گا اس کے لیے دین کا راستہ آسان ہو جاتا ہے۔ جس کا دل تنگ ہو، کنجوسی کرے اور لاپروا رہے، جو کچھ ہوتا ہے ہوتا رہے مجھے تو اپنے کام سے غرض ہے، اللہ نے، جو وعدے کیے ہیں اور نیکیاں جن کی تعلیم دی ہے ان کو سچ نہ جانے، ان پر یقین نہ رکھے، وہ آدمی مشکلات میں گرفتار ہوتا ہے اور اس کے لیے دین پر چلنا مشکل اور بدی پر چلنا آسان ہو جاتا ہے اور بالآخر جہنم میں

جا گرتا ہے۔ وہ مال جس کی خاطر وہ یہ سب کچھ کرتا ہے اس کے کسی کام نہیں آتا۔

اِنَّ عَلَیۡنَا لَلۡهُدٰیۖ ۝ وَ اِنَّ لَنَا لَلۡاٰخِرَةَ وَالۡاُوۡلٰی ۝ فَاَنۡذَرۡتُكُمۡ نَارًا تَلَظّٰیۚ ۝ لَا یَصۡلٰهَاۤ اِلَّا الۡاَشۡقَی ۝ الَّذِیۡ كَذَّبَ وَ تَوَلّٰیؕ ۝ وَ سَیُجَنَّبُهَا الۡاَتۡقَی ۝ الَّذِیۡ یُؤۡتِیۡ مَالَهٗ یَتَزَكّٰیۚ ۝ وَمَا لِاَحَدٍ عِنۡدَهٗ مِنۡ نِّعۡمَةٍ تُجۡزٰۤی ۝ اِلَّا ابۡتِغَآءَ وَجۡهِ رَبِّهِ الۡاَعۡلٰیۚ ۝ وَلَسَوۡفَ یَرۡضٰی ۝ (الیل: ۱۲-۲۱)

"بے شک راستہ بتانا ہمارے ذمے ہے، اور درحقیقت آخرت اور دنیا، دونوں کے ہم ہی مالک ہیں۔ پس میں نے تم کو خبردار کر دیا ہے بھڑکتی ہوئی آگ سے۔ اس میں نہیں جھلسے گا مگر وہ انتہائی بدبخت، جس نے جھٹلایا اور منہ پھیرا۔ اور اس سے دور رکھا جائے گا وہ نہایت پرہیزگار، جو پاکیزہ ہونے کی خاطر اپنا مال دیتا ہے۔ اس پر کسی کا کوئی احسان نہیں ہے، جس کا بدلہ اُسے دینا ہو۔ وہ تو صرف اپنے رب برتر کی رضاجوئی کے لیے یہ کام کرتا ہے۔ اور ضرور وہ (اس سے) خوش ہوگا۔"

یہ سورۂ لیل کی آخری آیات ہیں۔ ان میں اس سوال کا جواب دیا گیا ہے کہ ہدایت کی راہ دکھانا، اور اس پر چلانا اللہ تعالیٰ کے ذمے ہے۔ پھر آخرت کے حوالے سے دو مناظر پیش کیے گئے ہیں جن میں اہل جہنم اور اہل جنت کی منظر کشی کی گئی ہے، اور خدا کی رضا و خوش نودی کے حصول کی راہ بھی سجھائی گئی ہے۔

اِنَّ عَلَیۡنَا لَلۡهُدٰی ۝ (الیل: ۱۲)

"بے شک راستہ بتانا ہمارے ذمے ہے۔"

جب اعمال مختلف ہیں، انجام مختلف ہے، آدمی دنیا میں امتحان کے لیے تنہا بھیجا گیا ہے تو اس کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ میں صحیح راستہ کیسے پاؤں گا؟ صحیح راستے پر کیسے چلوں گا اور اپنی منزل تک کیسے پہنچوں گا؟ یہاں اس کے جواب میں اطمینان دلایا گیا ہے کہ بے شک ہدایت دینا ہمارے ذمے ہے۔

ھُدیٰ اور ہدایت دونوں کے معنی ہیں راہ دکھانا، راہ پر چلانا اور منزل تک پہنچانا۔ یہ تینوں معنی اس کے اندر شامل ہیں۔ لیکن قرآن مجید نے ھدیٰ کے لفظ کو خاص طور پر اس ہدایت کے لیے استعمال کیا ہے، جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے آئے۔ کسی مخلوق کی طرف سے ہدایت کے

لیے اس نے ھدیٰ کا لفظ استعمال نہیں کیا بلکہ ہدایت کا لفظ استعمال کیا ہے۔ لہٰذا ھدیٰ کا لفظ دراصل ہدایتِ الٰہی کے معنوں میں ہے اور فرمایا کہ یہ ہمارے ذمے ہے کہ ہم راہ دکھائیں۔

امام راغب اصفہانی، جو قرآن کی لغت کے بڑے امام ہیں، فرماتے ہیں کہ ہدایت کے چار معنی ہیں۔ ایک ہدایت وہ ہے، جو آدمی کی فطرت میں بھی ہے اور جانوروں کی فطرت میں بھی اور سب کی فطرت میں ودیعت کر دی گئی ہے۔ وہ بلی، کتے، گھوڑے کا بچہ ہو یا انسان کا بچہ، پیدا ہوتے ہی وہ یہ ہدایت لے کر آتا ہے کہ زندگی کیسے گزارنا ہے، اس کو غذا کہاں سے ملے گی اور کیسے وہ اپنی زندگی سہولت کے ساتھ بسر کرے گا۔ ہدایت کا دوسرا درجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کی فطرت میں سوچنے سمجھنے، نیکی اور بدی کے درمیان فرق کرنے، حواس کے ذریعے علم حاصل کرنے، عقل کے ذریعے فیصلے کرنے اور نتیجے تک پہنچنے کی صلاحیتیں اس کو دی ہیں اور یہ ہدایت کے لیے ضروری بھی ہیں۔ اسی طرح کائنات میں، رات اور دن میں، آسمان و زمین کی پیدائش میں، بارش کے برسنے میں، رزق کے دیے جانے میں بھی اس کے لیے ہدایت کا سامان ہے اور یہ سب چیزیں اس کی طرف سے راہ دکھانے کے لیے ہیں۔ اس طرح راہ دکھانے کے لیے یہ دو چیزیں ہوئیں۔

اس کے بعد اگلا درجہ وحی کا ہے، جو اللہ کے رسولوں کے ذریعے سے پہنچتی ہے۔ فطری راہ نمائی یا عقلی سوجھ بوجھ انسان کی ہدایت و رہ نمائی کے لیے ناکافی ہیں۔ ان سے ہر آدمی حقیقت کو نہیں پا سکتا کہ صحیح راستہ کون سا ہے؟ نیکی یا برائی کیا ہے؟ یا صحیح زندگی کس طرح بسر کی جائے؟ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام سے ان کی پیدائش کے وقت ہی یہ وعدہ فرمایا تھا:

فَاِمَّا یَاْتِیَنَّکُمْ مِّنِّیْ هُدًی فَمَنْ تَبِعَ هُدَایَ فَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ٥ (البقرۃ:۳۸)

”پھر جو میری طرف سے کوئی ہدایت تمھارے پاس پہنچے تو جو لوگ میری اس ہدایت کی پیروی کریں گے، ان کے لیے کسی خوف اور رنج کا موقع نہ ہوگا۔“

حضرت آدم علیہ السلام کو یہ بتا دیا گیا تھا کہ تم بہت کمزور ہو، تمھارا ارادہ بھی کمزور ہے، اور تمھارا حافظہ بھی کمزور ہے۔ تم کو حکم دیا جاتا ہے اور تم بھول جاتے ہو۔ ایک چیز کو کرنے کا ارادہ کرتے ہو تو شیطان کے وسوسے غالب آجاتے ہیں اور تمھارا پاؤں پھسل جاتا ہے۔ اس پر

حضرت آدم علیہ السلام بہت پریشان ہوئے کہ پھر دنیا کے امتحان میں کیسے پورا اتروں گا؟ فرمایا کہ اگر لغزش ہو جائے تو توبہ کر لینا، میں قبول کر لوں گا، اور میری طرف سے جو ہدایت اترے گی اس کی پیروی کرنا، تو تمھارے لیے ہدایت کے راستے پر چلنا آسان ہو جائے گا۔

یہ ہدایت تمام انسانوں کے لیے تھی کہ غلطی ہو جائے تو توبہ کر لو اور اگر راستہ بھول جاؤ تو میرے انبیاء علیہم السلام جس راستے پر چلنے کی ہدایت دیں اس کی پیروی کرو، وہ تمھیں سیدھا راستہ دکھا دیں گے۔ ان دونوں باتوں کا سورۂ بقرہ میں ذکر آیا ہے۔ اس طرح شروع ہی میں اللہ تعالیٰ نے دونوں انتظاموں کا ذکر کر دیا، اور راستہ دکھانے کی اپنی ذمے داری انبیا کے ذریعے پوری کر دی۔

یہاں تک بات راستہ دکھانے کی تھی۔ راستے پر چلنا، اور منزل تک پہنچنا، یہ دوسری بات ہے۔ راستہ دکھانے کے بعد اس راستے پر چلنے کے لیے پہلی شرط یہ ہے کہ وہ آدمی جوان قوتوں، یعنی عقلی سوجھ بوجھ اور فطری رہ نمائی سے فیصلہ کر لے کہ میں اپنا تزکیہ کروں گا، صحیح راستے پر چلوں گا، برائیوں سے اپنے آپ کو پاک کروں گا، بھلائی اختیار کروں گا، اسے اللہ تعالیٰ سیدھا راستہ بھی دکھاتے ہیں اور اس راستے پر چلاتے بھی ہیں۔ ہاتھ پکڑ کر اسے چلاتے ہیں، اگر گر پڑتا ہے تو اٹھا کر اسے کھڑا کرتے ہیں اور توبہ کی توفیق دیتے ہیں، لیکن یہ ہدایت ہر ایک کو نہیں ملتی۔ صرف اسی کو ملتی ہے، جس کے اندر ارادہ موجود ہو، اور جو کوشش بھی کرے۔ ان دو چیزوں کا وہ سب سے مطالبہ کرتا ہے کہ ارادہ ہونا چاہیے اور کوشش بھی کی جائے۔ لہٰذا ہدایت کے لیے دو شرائط درکار ہیں: ایک ارادہ اور دوسری کوشش۔ اس کے بعد باقی مراحل اللہ کے ذمے ہیں۔

وَ الَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ؕ وَ اِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ ۝ (العنکبوت:۶۹)

”جو لوگ ہماری خاطر مجاہدہ کریں گے انھیں ہم اپنے راستے دکھائیں گے اور یقیناً اللہ نیکوکاروں کے ساتھ ہے۔“

راستہ دکھانا اور راستہ دکھانے کے بعد اس راستے پر چلانا، یہ کسی انسان کے بس میں نہیں ہے، حتیٰ کہ انبیا کے بس میں بھی نہیں ہے۔ اسی لیے قرآن پاک نے حضور ﷺ سے مخاطب ہو کر کہا کہ آپ ﷺ لوگوں کو صراطِ مستقیم کی طرف ہدایت کر دیں۔

اِنَّکَ لَتَهْدِیْٓ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ۝ (الشوریٰ:۵۲)

"یقیناً تم سیدھے راستے کی طرف رہ نمائی کر رہے ہو۔"

ایک دوسری جگہ فرمایا:

اِنَّکَ لَا تَهْدِیْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰکِنَّ اللّٰهَ یَهْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ ۚ

(القصص:۵۶)

"اے نبی ﷺ تم جسے چاہو اسے ہدایت نہیں دے سکتے، مگر اللہ جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے۔"

یہ تو اللہ کے اوپر ہے کہ وہ اپنی مشیت کے مطابق کسے ہدایت کی راہ دکھاتا ہے اور کسے نہیں دکھاتا۔ ہدایت کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے اس بات کو بھی واضح کر دیا ہے کہ ہدایت دینا اندھے کی طرح ریوڑیاں بانٹنا نہیں ہے کہ جسے چاہا دے دیا اور جسے چاہا نہ دیا۔ البتہ رزق کے معاملے میں اس نے یہ ضرور کہا ہے اور بار بار کہا ہے:

وَاللّٰهُ یَرْزُقُ مَنْ یَّشَآءُ بِغَیْرِ حِسَابٍ ۝ (البقرۃ:۲۱۲)

"رہا دنیا کا رزق، تو اللہ کو اختیار ہے، جسے چاہے بے حساب دے۔"

اور یہ بھی فرما دیا کہ دنیا کا رزق وہ جس کے لیے چاہتا ہے روک لیتا ہے اور جس کے لیے چاہتا ہے کھول دیتا ہے۔ رزق کا زیادہ یا کم ملنا، اس تقسیم میں اس کا کوئی مخصوص قانون یا ضابطہ نہیں ہے بلکہ یہ سراسر اس کی مشیت کے اوپر ہے۔ اس لیے کہ دنیا کے رزق کی اس کے نزدیک کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔ فرمایا کہ اگر ہم کو اس بات کا خدشہ نہ ہوتا کہ سارے لوگ گم راہ ہو جائیں گے تو ہم لوگوں کے مکان، ان کی چھتیں، ان کے دروازے، ان کے بستر سب سونے چاندی کا بنا دیتے، یعنی اگر ہم کافروں کو اتنی دولت دے دیتے تو پھر شاید کوئی بھی آدمی ایمان نہ لاتا۔ یہ آزمائش بڑی سخت ہو جاتی، تاہم اللہ کے ہاں دنیا اور اس کے مال و متاع کی پرکاہ کے برابر بھی وقعت نہیں ہے۔

اس کے مقابلے میں ہدایت کی بڑی قدر و قیمت ہے۔ ہدایت کے نتیجے میں سونے کے محل، بستر اور بے شمار نعمتیں ملیں گی جو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رہنے والی ہیں۔ یہ سب اسی کو ملے گا، جس کو اللہ تعالیٰ نے ارادہ دیا اور اس نے اپنے ارادے اور اختیار کا صحیح استعمال کیا اور اپنی قوت،

صلاحیتوں اور توانائیوں سے صحیح عمل کی کوشش کی۔ انسان سے ارادے اور کوشش سے زیادہ کوئی اور مطالبہ نہیں کیا گیا ہے۔ اس سے یہ مطالبہ بھی نہیں ہے کہ جہاد کرو، نماز پڑھو، دین کو قائم کرو۔ اگر کوئی مطالبہ ہے تو صرف اتنا کہ اپنا تزکیہ کرنے اور راہِ خدا میں مال دینے کا ارادہ کرو اور اس کے لیے کوشش کرو۔ ہدایت کا یہ تیسرا درجہ ہے۔

چوتھا درجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہدایت کی راہ پر چلانے کے بعد پھر جنت میں بھی پہنچاتا ہے۔ چناں چہ جنت میں جب لوگ جمع ہوں گے تو قرآن نے ان کا قول نقل کیا ہے:

وَ قَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ هَدٰىنَا لِهٰذَا ۗ وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِیَ لَوْلَاۤ اَنْ هَدٰىنَا اللّٰهُ ۚ (الاعراف:۴۳)

''اور وہ کہیں گے کہ تعریف خدا ہی کے لیے ہے، جس نے ہمیں یہ راستہ دکھایا، ہم خود راہ نہ پا سکتے تھے اگر خدا ہماری رہ نمائی نہ کرتا۔''

اس کو اگر ہم اردو میں کہنا چاہیں تو یہ راہ دکھانا اور راہ پر چلانا ہے۔ گویا وہ انسان کو عقل، حواس، فطرت اور کائنات کی ساری چیزوں کے ذریعے اور انبیا کے ذریعے راہِ دکھاتا ہے اور پھر اس راہ پر چلاتا بھی ہے۔ لیکن یہ ان کے لیے ہے، جو اس کا ارادہ بھی کرتے ہیں:

وَ یَهْدِیْۤ اِلَیْهِ مَنْ یُّنِیْبُ ۝ (الشوریٰ:۱۳)

''اور وہ اپنی طرف آنے کا راستہ اسی کو دکھاتا ہے، جو اس کی طرف رجوع کرے۔''

جو اس کی طرف رجوع کرتا ہے تو پھر اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ وہ جنت ہی میں پہنچتا ہے۔ پھر اس راہ پر چلنا اس کے لیے آسان ہو جاتا ہے، حساب کتاب اور دیگر منزلوں سے بہ آسانی گزر کر وہ جنت میں پہنچا دیا جاتا ہے۔ اس صورت میں بھی اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں کہا کہ ہم ہر ایک کے لیے راستہ آسان کر دیتے ہیں بلکہ یہ کہا کہ جس نے دیا، بچا، ڈرا اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ اپنا تعلق جوڑا، اس سے بے نیاز نہ ہوا اور سچی بات کی تصدیق کی، اس کو ہم آسان راستے کی طرف ہدایت دیتے ہیں۔

یہاں بھی یہی شرط ہے کہ تم ایک قدم آگے بڑھو گے تو میں دس قدم بڑھوں گا، تم ایک بالشت آؤ گے تو میں ایک ہاتھ آؤں گا، تم چلتے ہوئے آؤ گے تو میں دوڑتا ہوا آؤں گا۔ لیکن اگر تم اپنی جگہ سے سرکنے کے لیے ہی تیار نہیں ہو تو پھر کچھ نہیں ملے گا۔ ارادہ کرنا اور اپنی طرف سے جو قدم اٹھایا جا سکتا ہو وہ اٹھانا ضروری ہے۔ پھر اللہ کا یہ وعدہ ہے:

اِنَّ عَلَيْنَا لَلْهُدٰىO (الیل:۱۲)

"بے شک راستہ بتانا ہمارے ذمے ہے۔"

انسان جسے آزمائش میں ڈالا گیا ہے اگر وہ، وہ اعمال اختیار کرے، جو اعمال اس سورہ میں بیان کیے گئے ہیں تو اس کو ہدایت دکھانا اللہ کے ذمے ہے۔ اللہ کا وعدہ کبھی جھوٹا نہیں ہو سکتا۔ راستہ دکھانا، راستے پر چلانا اور پھر منزل تک پہنچانا اور راستے کو آسان کرنا، ان سب کی ذمے داری اس نے لے لی ہے۔ اس طرح ان سورتوں میں ہدایت وضلالت اور نیکی و بدی کی بنیادی تعلیمات کو چھوٹے چھوٹے جملوں میں بیان کیا جا رہا ہے۔

وَ اِنَّ لَنَا لَلْاٰخِرَةَ وَالْاُوْلٰىO (الیل:۱۳)

"اور درحقیقت آخرت اور دنیا دونوں کے ہم ہی مالک ہیں۔"

اگر ترجمہ زیادہ کھول کر کریں تو پھر یوں ہوگا کہ ہمارے ہی قبضے میں ہے آخرت بھی اور دنیا بھی۔ اب تک آخرت کا لفظ کہیں نہیں آیا تھا۔ یوں لگتا ہے کہ جیسے اچانک آخرت کا لفظ آ گیا ہو لیکن سننے والے دنیا اور آخرت کے تصور سے آگاہ تھے۔

اگر سورہ پر غور کیا جائے تو اس میں آخرت کا لفظ پوشیدہ ہے۔ رات اور دن کے آنے جانے سے دن رات کی گردش مکمل ہو جاتی ہے، اور نر اور مادہ کے ملنے سے انسانوں، جانوروں اور نباتات کی بقائے نسل کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ اگر دنیا کے ساتھ آخرت نہ ہو تو اعمال کے مختلف ہونے کے کوئی معنی ہی نہیں۔ ایک آدمی جھوٹ بولے اور دوسرا سچ، اگر آخرت نہ ہو تو پھر جھوٹ اور سچ بولنے کے کیا معنی ہوئے۔ ایک آدمی فیاض ہو اور اپنا مال خرچ کرے اور دوسرا آدمی کنجوس اور بخیل ہو، دونوں کے درمیان فیصلے کے لیے بھی آخرت کا ہونا ایک فطری تقاضا محسوس ہوتا ہے۔ قرآن مجید میں اس بات کی طرف یوں اشارہ کیا گیا ہے:

اَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِيْنَ كَالْمُجْرِمِيْنَ۝ (القلم:۳۵)

"کیا ہم فرماں برداروں کا حال مجرموں کا سا کر دیں؟"

گویا یہ نہیں ہو سکتا کہ اطاعت کرنے والے اور نافرمانی اور ظلم کرنے والے برابر ہو جائیں۔ کیا تم نے یہ سمجھ لیا کہ ہم نے تم کو بے کار پیدا کیا ہے اور تم ہماری طرف لوٹ کر نہیں آؤ گے؟ یہ نہ سمجھو کہ ہماری یہ آیات اگلے وقتوں کے افسانے ہیں بلکہ آخرت ایک کھلی حقیقت ہے، جسے بہر حال برپا

ہو کر رہنا ہے۔ لہٰذا نیکی اور بدی کے معنی اس وقت تک کوئی حیثیت نہیں رکھتے، جب تک دنیا کی زندگی ختم نہ ہو اور آخرت برپا نہ ہو۔

یہاں جو بات فرمائی گئی ہے کہ دنیا اور آخرت ہمارے قبضے اور ملکیت میں ہے، یہ بڑی اہم بات ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ دنیا اور آخرت میں کوئی چیز بھی ہمارے علاوہ تم کو فائدہ اور نفع نہیں پہنچا سکے گی۔ اگر تم دنیا کو سمیٹ سمیٹ کر رکھتے اور دنیا کی چیزوں کو اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے تو جان لو کہ اس دنیا میں ہمارے علاوہ کوئی ہستی تمھارے کام نہیں آسکتی اور نہ کسی کے قبضے میں ہی کچھ ہے اور آخرت میں تو کوئی بھی نہیں ہے جو تمھارے کام آنے والا ہو۔ گویا دنیا اور آخرت صرف اللہ تعالیٰ کے تصرف میں ہیں۔ اس بات کو احادیث میں بھی واضح طور پر بیان کیا گیا ہے کہ اللہ کا تم سے نیکی کرنے اور بدی سے بچنے کا مطالبہ اس لیے نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اس سے کچھ ملنے والا ہے بلکہ یہ تمھارے ہی حق میں بہتر ہے۔ لوگ پوچھتے ہیں کہ اللہ ہم سے نماز پڑھوا کر کیا لینا چاہتا ہے؟ یہ سوال بھی اکثر سننے میں آتا ہے کہ اللہ کو کیا ملے گا اگر ہم نیکی کریں گے، یا اس کا کیا جائے گا اگر ہم کسی برائی کے مرتکب ہوں؟

یہ سوال ہمیشہ انسان کے ذہن میں رہا ہے۔ اس کا جواب قرآن مجید میں بھی دیا گیا ہے اور احادیث کے اندر بھی کہ اگر تم سب کے سب نیک ہو جاؤ جتنا دنیا کا کوئی نیک ترین آدمی ہو سکتا ہے تو اللہ کی کائنات میں اتنا بھی اضافہ نہیں ہوگا، جتنا کہ ایک پانی کی بوند سے ہوتا ہے، اور اگر سب کے سب اتنے بدکار اور نافرمان ہو جاؤ جتنا کہ کوئی بدترین آدمی ہو سکتا ہے تو اس کی سلطنت میں ذرہ برابر بھی کمی نہیں ہوگی۔ جب دنیا اور آخرت اللہ کے قبضے میں ہے اور لوگوں کی نیکی یا بدی سے اس کو کوئی غرض نہیں اور اس سے اس کی بادشاہی میں ذرّہ برابر بھی فرق نہیں پڑتا، تو پھر اس کے معنی یہ بھی ہوئے کہ دنیا اور آخرت کو اگر مانگنا ہے تو ہم سے مانگو، دنیا کو ان ذرائع سے نہ تلاش کرو، جو کہ ہم نے منع کر دیے ہیں، اور آخرت کی بھلائی تلاش کرنا ہے تو وہ بھی ہم سے طلب کرو، سب کچھ ہماری ملکیت اور ہمارے قبضے میں ہے۔ لہٰذا جب دنیا اور آخرت ہمارے قبضے میں ہے تو تم نیکی کی روش اختیار کرو اور نیک بنو۔ اس طرح تم دونوں جہان کی بھلائیاں سمیٹ سکتے ہو۔

یہاں ذہن میں یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ پھر آخرت میں اعمال کا کیا انجام ہوگا؟ دنیا کے بارے میں اس نے کھول کر بیان کر دیا ہے کہ جو اچھے کام کرے گا، جس میں تین باتیں ہیں

اور جو بنیادی باتیں ہیں، یعنی جس نے دیا، ڈرا اور بچا اور جس نے نیکیوں کی تصدیق کی اس کے لیے ہم دنیا میں نیکی کے راستے پر چلنا آسان کر دیتے ہیں لیکن آخرت میں اس کے لیے کیا ہے، اور جس نے نہ دیا، بخل اور کنجوسی کی اور دوسری برائیاں اس کے اندر ہیں، اس کا آخرت میں کیا انجام ہونے والا ہے؟ اس بات کا جواب اگلی آیت میں دیا جا رہا ہے۔

فَاَنْذَرْتُكُمْ نَارًا تَلَظّٰى ۚ لَا يَصْلٰهَآ اِلَّا الْاَشْقَى ۙ الَّذِىْ كَذَّبَ وَ تَوَلّٰى ۙ (اللیل: ۱۴-۱۶)

"پس میں نے تم کو خبردار کر دیا ہے بھڑکتی ہوئی آگ سے۔ اس میں نہیں جھلسے گا مگر وہ انتہائی بدبخت، جس نے جھٹلایا اور منہ پھیرا۔"

اَنْذَرَ کے معنی ڈرانے کے، خبردار کرنے کے اور ہوشیار کرنے کے بھی ہوتے ہیں۔ تینوں کا ایک ہی مفہوم ہے کہ آدمی خبردار ہو جائے کہ اگر میں نے یہ کام کیا تو ان کا انجام کیا ہونے والا ہے۔ لہٰذا آیت کا یہ مفہوم ہوا کہ میں تم کو خبردار کرتا ہوں، ہوشیار کرتا ہوں ایک آگ سے، جو بھڑکتی ہوئی آگ ہے۔ آگ کا ذکر قرآن مجید میں بہت تفصیل سے آیا ہے اور بعض جگہ صرف آگ کہہ کر بات ختم کر دی گئی ہے۔ قرآن مجید سے معلوم ہوتا ہے کہ آگ کا عذاب، جو جلنے کا عذاب ہے، بہت تکلیف دہ ہے۔ ہمارے ادب میں، محاورے میں اور ہمارے تجربے میں یہ بات معروف ہے کہ کوئی بڑی تکلیف ہو اس کے لیے ہم جلنے کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ باطنی تکالیف ہوں یا روحانی یا نفسیاتی تکالیف، ان کے لیے غم کی آگ میں جلنا، یا جدائی کی آگ میں جلنا اور دوسرے بہت سے محاورے استعمال کیے جاتے ہیں۔ قرآن مجید نے اس بات کی وضاحت کی ہے کہ وہ ایسی آگ ہوگی، جو جلد کو بھی جلائے گی، دل کو بھی جلائے گی اور نفسیاتی طور پر بھی آدمی ندامت کی آگ میں جلے گا اور کفِ افسوس ملے گا۔ اس طرح مختلف قسم کی آگ جمع کر لی جائے گی۔ اوپر بھی آگ ہوگی اور نیچے بھی آگ ہوگی۔ غرض آگ کا بڑا ہولناک عذاب ہوگا۔ اللہ ہمیں آگ کے عذاب سے محفوظ رکھے۔

قرآن مجید نے آگ کا، جو تصور دیا ہے وہ یہ ہے کہ وہاں آدمی جو کچھ بھی چاہے گا یا جس چیز کو بھی دنیا میں پسند کرتا رہا ہے، ہر چیز اس کے بالکل برعکس ملے گی۔ اگر پیاس لگے گی تو کھولتا ہوا پانی ملے گا، بھوک لگے گی تو گرم گرم پیپ اور کانٹوں کا کھانا ملے گا، اگر آرام کرنا چاہے گا تو

آگ کا بستر ہوگا۔ ہر طرح سے ہر چیز اس کی خواہش کے مخالف ہوگی۔ اس کے مقابلے میں جنت کی تعریف بالکل اس کے برعکس ہے، جہاں آدمی کی ہر خواہش پوری کی جائے گی۔ آدمی جو بھی چاہے گا اس کی وہ تمنا پوری کردی جائے گی۔ اس کا ذکر بھی ایک بالواسطہ طریقے سے اسی سورہ کے اندر موجود ہے۔

قرآن مجید نے آگ کا جو نقشہ کھینچا ہے اور جیسے الفاظ استعمال کیے ہیں وہ ایسے نہیں ہیں کہ جیسے کوئی جامد آگ جل رہی ہو، بلکہ جیسے کوئی زندہ چیز ہو جو بھڑک رہی ہے، ابل رہی ہے، دھاڑ رہی ہے، چیخ رہی ہے، جوش مار رہی ہے اور وہ پکڑنا چاہتی ہے اور پیچھے لپکتی ہے۔ یہ سارے فعل کے صیغے ہیں، جو قرآن مجید میں مختلف جگہ استعمال ہوئے ہیں۔ یہاں پر صرف بھڑکنے کا صیغہ استعمال ہوا ہے۔ مجموعی طور پر قرآن مجید میں آگ کے لیے جتنے بھی الفاظ استعمال ہوئے ہیں یہ ظاہر کرتے ہیں کہ آگ ایک متحرک چیز ہے اور یہ پھیلتی جا رہی ہے، اور ہم خود دیکھتے ہیں کہ جب آگ بھڑک اٹھتی ہے تو کس طرح پھیلتی چلی جاتی ہے۔ یہ کوئی ساکت اور جامد چیز نہیں ہے اور اس کی دہشت اور خوف پڑھنے کے ساتھ ہی یا سنتے ہی آدمی کے حواس کے اوپر چھا جاتی ہے۔

فَاَنۡذَرۡتُكُمۡ نَارًا تَلَظّٰى ۚ (الیل:۱۴)

"میں نے تمھیں خبردار کردیا ہے، اس آگ سے جو بھڑکنے والی ہے۔"

اس آگ میں کون جائے گا!

لَا يَصۡلٰهَاۤ اِلَّا الۡاَشۡقَى ۙ (الیل:۱۵)

"اس میں وہی جائے گا، جو بڑا بد بخت ہوگا۔"

ان آیات کے بارے میں مفسرین نے مختلف حوالوں سے بہت سی بحثیں کی ہیں لیکن یہاں کسی بحث میں پڑنے کی ضرورت نہیں۔ قرآن مجید کا پیغام بڑا صاف اور واضح ہے۔

الَّذِىۡ كَذَّبَ وَ تَوَلّٰى ؕ (الیل:۱۶)

"جس نے جھٹلایا اور منہ پھیرا۔"

اللہ نے خیر کی جو دعوت دی ہے وہ انسان کی فطرت میں بھی رکھی ہے اور انبیا علیہم السلام کے ذریعے بھی دی ہے۔ اس کو نہ ماننا، اس کے اوپر عمل نہ کرنا، یہ تکذیب ہے۔ تکذیب کا لفظ قرآن مجید نے صرف زبان سے جھٹلانے کے معنوں میں استعمال نہیں کیا بلکہ عمل سے جھٹلانا بھی

تکذیب کے اندر شامل ہے۔ ہوسکتا ہے کہ زبان سے آدمی سچ بات کہہ رہا ہو لیکن اس کے باوجود جھٹلانے والا ہو۔ چناں چہ منافقین کے بارے میں قرآن پاک نے کہا ہے کہ منافقین آتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ ﷺ اللہ کے رسول ہیں لیکن اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اللہ خوب جانتا ہے کہ یہ سچ بات کہہ رہے ہیں کہ آپ ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ منافقین سچ بات کہنے اور سچائی کا اقرار کرنے کے باوجود جھوٹے ہیں۔ اس لیے کہ ان کا عمل ان کے دعوے سے مطابقت نہیں رکھتا۔

اِذَا جَآءَکَ الْمُنٰفِقُوْنَ قَالُوْا نَشْهَدُ اِنَّکَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ ۘ وَاللّٰهُ یَعْلَمُ اِنَّکَ لَرَسُوْلُهٗ ؕ وَاللّٰهُ یَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ لَکٰذِبُوْنَ ۝

(المنٰفقون:۱)

''اے نبی ﷺ، جب یہ منافق تمھارے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں'' ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ یقیناً اللہ کے رسول ہیں۔'' ہاں، اللہ جانتا ہے کہ تم ضرور اس کے رسول ہو، مگر اللہ گواہی دیتا ہے کہ یہ منافق قطعی جھوٹے ہیں۔''

منہ موڑنے کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے انبیاء علیہم السلام نے نیکی کا جو راستہ بتا دیا ہے آدمی اس سے لاپروا ہو جائے اور اس سے منہ موڑ لے۔ لیکن اگر قرآن مجید میں دوسری جگہ دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ ان دونوں صفات کی جو تفصیل کئی جگہ بیان کی گئی ہے وہ انھی حوالوں سے ہے، جو اس سورہ کے شروع میں بیان کیے گئے ہیں۔ مثال کے طور پر سورۂ ماعون میں فرمایا:

اَرَءَیْتَ الَّذِیْ یُکَذِّبُ بِالدِّیْنِ ۝ فَذٰلِکَ الَّذِیْ یَدُعُّ الْیَتِیْمَ ۝ وَلَا یَحُضُّ عَلٰی طَعَامِ الْمِسْکِیْنِ ۝ (الماعون:۱-۳)

''تم نے دیکھا اس شخص کو جو آخرت کی جزا و سزا کو جھٹلاتا ہے؟ وہی تو ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے، اور مسکین کو کھانا دینے پر نہیں اکساتا۔''

یہ تکذیب کی مثال ہے۔ تکذیب یہ ہے کہ آدمی بندوں کا جو حق اللہ تعالیٰ نے مقرر کر دیا ہے وہ نہ دے۔

تولّٰی کے بارے میں سورۂ نجم میں ہے:

اَفَرَءَیْتَ الَّذِیْ تَوَلّٰی ۝ وَ اَعْطٰی قَلِیْلًا وَّ اَکْدٰی ۝ (النجم:۳۳، ۳۴)

''اے نبیؐ، تم نے اس شخص کو دیکھا جو راہِ خدا سے پھر گیا اور تھوڑا سا دے کر رک گیا۔''

اَکۡدٰی کے معنی ہیں کھودتے کھودتے ایک دم پاتال آ جائے مزید آگے نہ کھود سکے۔ گویا دینے سے ہاتھ کھینچ لیتا ہے، جیب بھی بند ہو جاتی ہے اور دل بھی تنگ ہو جاتا ہے۔ یہ تَوَلّٰی کی تعریف ہے۔ قرآن مجید میں اس کی بے شمار مثالیں ہیں، جو دی جاسکتی ہیں۔ مراد یہ ہے کہ اللہ سے بغاوت، دعوت خیر سے منہ موڑ لینے، اور اللہ نے جو حقوق یہاں پر بیان فرمائے ہیں ان سے اعراض برتنے کا بدلہ اور سزا بھڑکتی ہوئی آگ ہے:

وَ سَیُجَنَّبُهَا الۡاَتۡقَی ۙ الَّذِیۡ یُؤۡتِیۡ مَالَهٗ یَتَزَکّٰی ۚ (الیل: ۱۷، ۱۸)

"اور اس سے دور رکھا جائے گا وہ نہایت پرہیز گار، جو پاکیزہ ہونے کی خاطر اپنا مال دیتا ہے۔"

متقی کے معنی تقویٰ اختیار کرنے والے کے ہیں اور اَتۡقٰی کے معنی ہیں: بہت تقویٰ کرنے والا۔ اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ کم تقویٰ اختیار کرنے والے کو وہ نہیں بچائے گا بلکہ یہاں بھی اس نے کمال کو ظاہر کیا ہے۔ دراصل تقویٰ کے بالکل بنیادی معنی بچنے کے ہیں۔ آدمی اس چیز سے بچتا ہے، جو اس کو نقصان پہنچانے والی ہو۔ اس سے آدمی ضرور بچتا ہے۔ یہ اس کی فطرت میں ہے۔ اگر آگ جل رہی ہو اور آپ کا ہاتھ آگ کی طرف چلا جائے تو حدت محسوس کرتے ہی ہاتھ کھنچ جائے گا۔ کیوں کہ آدمی کی فطرت میں ہے کہ آگ جلانے والی ہے۔ لیکن اگر آپ حرام چیز پیٹ میں ڈالتے ہیں تو یہ آپ بلا تکلف ڈال لیتے ہیں۔ اس لیے کہ آپ نہیں جانتے کہ آپ اپنے پیٹ میں انگارہ ڈال رہے ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ لوگ پیٹ میں آگ بھرتے ہیں اور وہ نہیں جانتے کہ پیٹ میں آگ بھر رہے ہیں۔ اس کے لیے ایمان بالغیب کی ضرورت ہوتی ہے۔

جب آدمی غیب اور قرآن مجید پر ایمان لاتا ہے تو وہ جان جاتا ہے کہ یہ وہ آگ نہیں ہے، جو جلانے والی ہے بلکہ اللہ کی نافرمانی سے آدمی جو انگارے جمع کرتا ہے وہ بالآخر اسے دوزخ کی آگ میں جلانے کا باعث ہوں گے۔ پھر اس کے اندر تقویٰ پیدا ہوتا ہے۔ اسی لیے متقین کی پہلی صفت ہی قرآن مجید میں تقویٰ بیان کی گئی ہے:

هُدًی لِّلۡمُتَّقِیۡنَ ۙ الَّذِیۡنَ یُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡغَیۡبِ ۝ (البقرۃ: ۲، ۳)

"ہدایت ہے متقین کے لیے، جو غیب پر ایمان لاتے ہیں۔"

غیب پر ایمان کے بغیر وہ تقویٰ پیدا نہیں ہو سکتا، جو قرآن مجید چاہتا ہے۔ بچنا تو انسان کی بنیادی

فطرت ہے۔ وہ ہر اس چیز سے بچتا ہے، جو اس کو نقصان پہنچانے والی ہو۔ یہ یقین کہ برے اعمال نقصان پہنچانے والے ہیں اور یہ آگ بننے والے ہیں، یہ غیب پر ایمان ہے۔ یہ ایمان جتنا مضبوط ہوتا جاتا ہے، تقویٰ بھی اتنا ہی قوی ہوتا جاتا ہے۔

قرآن مجید میں متقین کی بہت سی تعریفیں کی گئی ہیں لیکن اکثر جگہ دو چیزوں کو خاص طور پر بیان کیا گیا ہے۔ ایک اللہ تعالیٰ کا قرب اور اس سے قریب ہونے کی خواہش اور اس کے لیے راتوں کو کھڑے ہونا، نمازیں پڑھنا اور اس کی اطاعت کرنا ہے۔ دوسرے، بندوں کے لیے اپنا مال خرچ کرنا۔ سورۂ بقرہ کی ابتدا ہی میں اَلَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ (جو غیب پر ایمان لاتے ہیں) کے فوراً بعد وَ یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ وَ مِمَّا رَزَقْنٰھُمْ یُنْفِقُوْنَ (البقرۃ:۳) "نماز قائم کرتے ہیں، جو رزق ہم نے ان کو دیا ہے، اس میں سے خرچ کرتے ہیں" کا تذکرہ کرنا، اس کی ایک عمدہ مثال ہے۔ ایک دوسری جگہ فرمایا:

کَانُوْا قَلِیْلًا مِّنَ الَّیْلِ مَا یَھْجَعُوْنَ ○ وَ بِالْاَسْحَارِ ھُمْ یَسْتَغْفِرُوْنَ ○ وَ فِیْٓ اَمْوَالِھِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ ○ (الذّٰریٰت:۱۷-۱۹)

"وہ راتوں کو کم ہی سوتے تھے، پھر وہی رات کے پچھلے پہروں میں معافی مانگتے تھے، اور ان کے مالوں میں حق تھا سائل اور محروم کے لیے۔"

سورۂ سجدہ میں دونوں کا ساتھ ساتھ ذکر کیا گیا ہے:

تَتَجَافٰی جُنُوْبُھُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ یَدْعُوْنَ رَبَّھُمْ خَوْفًا وَّ طَمَعًا وَّ مِمَّا رَزَقْنٰھُمْ یُنْفِقُوْنَ ○ (السجدۃ:۱۶)

"ان کی پیٹھیں بستروں سے الگ رہتی ہیں۔ اپنے رب کو خوف اور طمع کے ساتھ پکارتے ہیں اور جو کچھ رزق ہم نے انھیں دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔"

یہاں بھی قربِ الٰہی اور مال دینے دونوں کا ذکر ساتھ ساتھ ہے لیکن یہاں دینے سے مراد صرف مال دینا نہیں ہے۔ یہاں نماز کا ذکر نہیں فرمایا لیکن اللہ کے قرب کا ذکر کیا گیا ہے۔

اس سورہ میں متقی کی تعریف یوں کی گئی ہے:

اَلَّذِیْ یُؤْتِیْ مَا لَہٗ یَتَزَکّٰی ○ (الیل:۱۸)

"جو پاکیزہ ہونے کی خاطر اپنا مال دیتا ہے۔"

گویا متقی وہ ہے، جو اپنا مال راہِ خدا میں خرچ کرتا ہے۔ یہاں تفصیل نہیں دی گئی ہے، اس لیے کہ قرآن مجید کی ابتدائی سورتوں میں تفصیل نہیں دی گئی۔ اصل چیز تو انسان کو اس سانچے میں ڈھالنا ہے کہ اس کی شخصیت، مزاج اور طبیعت خرچ کرنے والی اور دینے والی ہے نہ کہ روکنے والی۔ مَنَّاعٍ لِّلۡخَیۡرِ نہ بنے کہ مال کو روک کر بیٹھ جائے۔ ایسا نہ بنے کہ جس کے بارے میں کہا گیا: الَّذِیۡ جَمَعَ مَالًا وَّ عَدَّدَہٗ (الھمزۃ:۲) ”جس نے مال جمع کیا اور اسے گن گن کر رکھا۔“ اس کی مثال ایسی نہ ہو کہ: جَمَعَ فَاَوۡعٰی ○ (المعارج:۱۸) ”جس نے جمع کیا اور ہتھیلی کے منہ باندھ دیے“ بلکہ وہ یہ سمجھے کہ میرا کام تو دینا ہے الَّذِیۡ یُؤۡتِیۡ مَالَہٗ (الیل:۱۸) میں اس بات کی صراحت نہیں کی گئی کہ کتنا دینا ہے، کس کو دینا ہے، اور کب دینا ہے۔ یہ سوال ابھی خارج از بحث ہے۔ اصل چیز تو یہ ہے کہ آدمی خرچ کرنے کے لیے تیار ہو۔

تقویٰ کے معنی یہ نہیں ہیں کہ آدمی کوئی مخصوص وضع قطع اپنا لے، ایک خاص طرز کا لباس پہننا شروع کر دے اور ایک خاص سائز کی ڈاڑھی رکھ لے۔ تقویٰ کے معنی ہیں کہ آدمی اللہ کے قریب ہو، نیت کو اللہ کے لیے خالص کرے اور اپنا مال اللہ کی راہ میں خرچ کرے۔ اٰتی سے مراد محض مال دینا نہیں ہے بلکہ اٰتی میں مال، وقت، جان اور صلاحیتیں لگانا، سب کچھ شامل ہے۔ چوں کہ مال انسان کو زیادہ عزیز ہوتا ہے، اس لیے یہاں مال کا ذکر کیا گیا ہے:

الَّذِیۡ یُؤۡتِیۡ مَالَہٗ یَتَزَکّٰی ○ۚ (الیل:۱۸)

”وہ اپنا مال اس لیے دیتا ہے تاکہ اس کا تزکیہ ہو۔“

مال کے ضمن میں یہ دوسری بات فرمائی گئی ہے۔ یہاں مال دینے کے دو معنی ہو سکتے ہیں۔ ایک معنی تو یہ ہو سکتے ہیں کہ وہ اس طرح دیتا ہے کہ اس کا تزکیہ ہو جائے۔ تزکیہ کس چیز کا ہوتا ہے؟ یہ بہت واضح بات ہے کہ زکوٰۃ دینے سے، اللہ کی راہ میں خرچ کرنے سے مال پاک ہوتا ہے اور اس کی نشوونما بھی ہوتی ہے۔ اس حوالے سے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

یُرۡبِی الصَّدَقٰتِ ط (البقرۃ:۲۷۶)

”وہ صدقات کو بڑھاتا ہے۔“

اس کے دوسرے معنی یہ ہو سکتے ہیں کہ آدمی کے اخلاق کا تعلق بھی دل کی تنگی اور کشادگی سے ہوتا ہے۔ دل کا بخل، کنجوسی اور تنگی، غصے کا آنا، انتقام لینے کی خواہش، معاف نہ کرنا، گالی

دینے پر اتر آنا، حق مارنا، ان سب کا تعلق دل کی تنگی، بخل اور مزاج کی کنجوسی سے ہے۔ آدمی کسی کو معاف نہیں کرتا کہ طبیعت نہیں مانتی، جس نے گالی دے دی ہے اسے کیوں معاف کرے، اس سے کیوں مسکرا کر بات کرے، اس کے لیے تو کشادہ دلی اور اعلیٰ ظرفی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی طرح جیب کھول کر مال دینے کے لیے بھی بڑا وسیع ظرف درکار ہوتا ہے۔ اس سے دل کا تزکیہ ہوتا ہے اور دل پاک ہوتا ہے۔ لہٰذا اس کے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ وہ اس لیے مال دیتا ہے تاکہ اس کا مالی و اخلاقی، ہر لحاظ سے تزکیہ ہو جائے۔

وَمَا لِاَحَدٍ عِنْدَهٗ مِنْ نِّعْمَةٍ تُجْزٰٓىۙ (الیل:۱۹)

''اس پر کسی کا کوئی احسان نہیں ہے، جس کا بدلہ اسے دینا ہو۔''

یہاں ایک بڑی خوبی کا تذکرہ کیا جا رہا ہے اور وہ یہ کہ وہ اس لیے نہیں دیتا کہ اس کے اوپر کوئی احسان ہے، جس کا بدلہ دینا مقصود ہو۔ اس کے ایک معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ وہ دے کر کسی کے اوپر کوئی احسان نہیں رکھتا کہ جس کا بدلہ دیا جائے، نہ وہ کسی کے بدلے کی نیت سے دیتا ہے اور نہ کسی سے بدلہ ہی چاہتا ہے۔ اس میں کوئی لین دین شامل نہیں ہے بلکہ یہ کام خلوص دل سے کیا جاتا ہے تاکہ اس سے اس کا رب راضی ہو جائے۔ نیت کی پاکی ہو تو آدمی دینے کے لیے آمادہ بھی ہوتا ہے اور ایسا دینا اللہ کے ہاں مقبول بھی ہوتا ہے، اور اگر نیت پاک نہ ہو تو یہ اس کے ہاں مقبول نہیں ہوتا۔

مشہور حدیث ہے کہ حضرت ابوہریرہؓ نے کہا کہ میں نے حضورﷺ کو یہ فرماتے سنا کہ ''قیامت کے دن سب سے پہلے ایک ایسے شخص کے خلاف فیصلہ سنایا جائے گا، جس نے شہادت پائی ہوگی۔ اُسے خدا کی عدالت میں حاضر کیا جائے گا۔ پھر خدا اُسے اپنی سب نعمتیں یاد دلائے گا اور وہ انھیں تسلیم کرے گا۔ تب اللہ تعالیٰ اس سے پوچھے گا کہ: ''تو نے میری نعمتیں پا کر کیا کام کیے؟'' وہ عرض کرے گا: ''میں نے تیری خوش نودی کی خاطر تیرے دین سے لڑنے والوں کے خلاف جنگ کی، یہاں تک کہ میں نے اپنی جان دے دی۔''

خدا اس سے کہے گا: ''تو نے یہ بات غلط کہی کہ میری خاطر جنگ کی، تو نے تو صرف اس لیے جنگ کی (اور جانبازی دکھائی) کہ لوگ تجھے جری اور بہادر کہیں، سو دنیا میں تجھے اس کا صلہ مل گیا۔''

پھر حکم ہوگا کہ اس ''مردِ شہید'' کو منہ کے بل گھسیٹتے لے جاؤ اور جہنم میں ڈال دو۔ چناں چہ اسے جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔

پھر ایک دوسرا شخص خدا کی عدالت میں پیش کیا جائے گا، جو دین کا عالم و معلم ہوگا۔ اُسے خدا اپنی نعمتیں یاد دلائے گا اور وہ انھیں تسلیم کرے گا۔ تب اس سے کہے گا: ''ان نعمتوں کو پاکر تو نے کیا عمل کیے۔'' وہ عرض کرے گا: ''خدایا، میں نے تیری خاطر تیرا دین سیکھا اور تیری خاطر دوسروں کو اس کی تعلیم دی اور تیری خاطر قرآن مجید پڑھا۔''

اللہ تعالیٰ فرمائے گا: ''تم نے جھوٹ کہا، تم نے تو اس لیے علم سیکھا تھا کہ لوگ تمھیں عالم کہیں اور قرآن اس غرض سے تم نے پڑھا تھا کہ لوگ تمھیں قرآن کا جاننے والا کہیں، سو تمھیں دنیا میں اس کا صلہ مل گیا۔''

پھر حکم ہوگا کہ اس کو چہرے کے بل گھسیٹتے ہوئے لے جاؤ اور جہنم میں پھینک دو۔ چناں چہ اسے گھسیٹتے ہوئے لے جا کر جہنم میں پھینک دیا جائے گا۔

تیسرا آدمی وہ ہوگا، جس کو اللہ نے دنیا میں کشادگی بخشی تھی اور ہر قسم کی دولت سے نوازا تھا۔ ایسے شخص کو خدا کی جناب میں پیش کیا جائے گا اور وہ اپنی سب نعمتیں گنوائے گا اور وہ ساری نعمتوں کا اقرار کرے گا کہ ہاں یہ سب نعمتیں اسے دی گئی تھیں۔ تب اس سے اس کا رب پوچھے گا: ''میری نعمتوں کو پا کر تو نے کیا کام کیے؟'' وہ جواب میں عرض کرے گا: ''جن جن راستوں میں خرچ کرنا تیرے نزدیک پسندیدہ تھا ان سب راستوں میں، میں نے تیری خوش نودی کے لیے خرچ کیا۔''

اللہ تعالیٰ فرمائے گا: ''جھوٹ کہا، تو نے یہ سارا مال اس لیے لٹایا تھا کہ لوگ تجھے سخی کہیں، سو یہ لقب تجھے دنیا میں مل گیا۔''

پھر حکم ہوگا: اسے چہرے کے بل گھسیٹتے ہوئے لے جاؤ اور آگ میں ڈال دو، چناں چہ اسے لے جا کر آگ میں ڈال دیا جائے گا۔ (مسلم)

اس بات کو سورۂ دھر میں یوں ذکر کیا گیا ہے:

وَ يُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰی حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّ يَتِيْمًا وَّ اَسِيْرًا ○ اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا ○ (الدھر:۸،۹)

''اور اللہ کی محبت میں مسکین اور یتیم اور قیدی کو کھانا کھلاتے ہیں (اور ان سے کہتے

ہیں کہ) ہم تمھیں صرف اللہ کی خاطر کھلا رہے ہیں، ہم تم سے نہ کوئی بدلہ چاہتے ہیں نہ شکر۔"

گویا جو کچھ بھی ملنا ہے، اللہ سے ملنا ہے۔

اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْاَعْلٰىۚ ۝ (الیل:۲۰)

"وہ تو صرف اپنے رب برتر کی رضاجوئی کے لیے یہ کام کرتا ہے۔"

تقویٰ کا ایک پہلو اگر خدا سے ڈرنا ہے تو دوسرا پہلو اللہ سے گہرا قلبی تعلق اور لگاؤ ہے، اس کو خوش کرنے کی فکر اور اس کی خوش نودی پر نظر رکھنا ہے۔ اِبْتِغَاءَ کا لفظ بَغٰی سے نکلا ہے اور اسی سے بغاوت بنا ہے۔ بغاوت کے معنی ہوتے ہیں آدمی کا حد سے نکل جانا۔ اسی طرح بَغٰی کا لفظ قرآن مجید میں کسی کام کو کرتے ہوئے حد سے نکل جانے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ بدکاری کے لیے بھی یہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔ اس لیے کہ آدمی اپنی خواہش پوری کرنے کے لیے حد سے نکل جاتا ہے۔ یہ لفظ بہت سے کاموں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اِبْتِغَاءَ کے معنی ہوتے ہیں کسی چیز کو حاصل کرنے کے لیے پوری کوشش کرنا۔ اس کے معنی صرف زبانی دعوے کے نہیں ہیں کہ نظر محض اللہ کی رضا پر ہو، بلکہ اس کے لیے ارادہ بھی ہو اور ہر ممکنہ کوشش بھی۔

وجہ چہرے کو کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا انسانی چہرے کی طرح کوئی چہرہ نہیں ہے اور نہ ہی انسان کی ذات کی طرح اس کی کوئی ذات ہوتی ہے۔ پھر وجہ کے کیا معنی ہوئے؟ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ اس کے معنی خدا کی ذات کے ہیں لیکن بعض کہتے ہیں کہ اس کے معنی اللہ کی خوش نودی اور اس کی رضا کے ہیں، جو میری نظر میں زیادہ بہتر معنی ہیں۔ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ آپ کی رضا چاہیے، یا یہ کہتے ہیں کہ بس آپ کی نگاہ چاہیے تو اس کے معنی ہیں کہ آپ ہم سے خوش ہو جائیں اور جو کام ہم نے کیا ہے اس کو دیکھ کر آپ کا چہرہ کھل اٹھے۔ کسی کا چہرہ کھل اٹھے تو ہم خوش ہو جاتے ہیں۔ اگر ہم اپنے ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آئیں، کسی انسان، کسی ساتھی یا کسی افسر کے ساتھ احسان کریں اور اس کا چہرہ کھل اٹھے تو ہم سمجھتے ہیں کہ ہم نے اپنا مقصد حاصل کر لیا ہے۔ اللہ کا چہرہ ایسا بھی نہیں ہے کہ کھل اٹھنے کا سوال ہو لیکن وہ ہم کو سمجھانے کے لیے اور بات کو ہماری زبان میں ادا کرنے کے لیے اور اس کو ہمارے دل میں اتارنے کے لیے یہ الفاظ استعمال کرتا ہے۔ وہ ہنستا ہے، بات کرتا ہے، اس کے ہاتھ بھی ہیں جو وہ پھیلاتا ہے، یہ سب

باتیں اس لیے نہیں ہیں کہ اللہ کی یہ ساری چیزیں واقعی ہیں۔ البتہ اس کے ساتھ یہ بھی واضح کردیا:

لَیۡسَ کَمِثۡلِہٖ شَیۡءٌ ۚ (الشوریٰ:۱۱)

''کائنات کی کوئی چیز اس کے مشابہ نہیں۔''

ان سب چیزوں پر ایمان رکھنا ضروری ہے اور یہ سوال آدمی نہ کرے کہ یہ کیا ہے؟ کیسا ہے؟ کیوں ہے؟ دراصل قرآن نے ہمیں سمجھانے کے لیے اس طرح بیان کیا ہے۔

یہاں اعلیٰ کا لفظ آیا ہے۔ اعلیٰ کے معنی ہیں بہت بلند اور اونچی چیز۔ عربی زبان کے لحاظ سے اعلیٰ کا لفظ چہرے کی صفت بھی ہوسکتا ہے اور یہ رب کی صفت بھی ہوسکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ایک جگہ چہرے کے لیے بھی اسے استعمال کیا ہے:

کُلُّ مَنۡ عَلَیۡہَا فَانٍ ۚ﴿ۖ﴾ وَّ یَبۡقٰی وَجۡہُ رَبِّکَ ذُو الۡجَلٰلِ وَ الۡاِکۡرَامِ ﴿ۚ﴾ (الرحمٰن:۲۶،۲۷)

''ہر چیز جو اس زمین پر ہے فنا ہوجانے والی ہے سوائے تیرے رب کے اس چہرے، جو بڑے اکرام اور جلال والا چہرہ ہے۔''

گویا یہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں ہے کہ وہ اعلیٰ ہے۔ اس کی توجہ اور نظرِ کرم بھی اہم ہے اور اس کی رضا و خوش نودی بھی بڑی بلند پایا ہے۔

بعض لوگوں نے اس کے معنی یہ کیے ہیں کہ اس کے معنی دراصل اعمالِ صالح ہیں، جن سے اللہ کی خوش نودی حاصل ہوتی ہے۔ اس لیے فرمایا کہ کُلُّ مَنۡ عَلَیۡہَا فَانٍ (الرحمٰن:۲۶) یعنی دنیا کی ہر چیز مٹ جائے گی، فنا ہوجائے گی۔ مزید فرمایا: کُلُّ شَیۡءٍ ہَالِکٌ اِلَّا وَجۡہَہٗ ؕ (القصص:۸۸) ''ہر چیز ہلاک ہونے والی ہے سوائے اس ذات کے۔'' گویا سوائے صالح اعمال کے، جن سے اللہ کی رضا اور خوش نودی حاصل ہوتی ہے دنیا کا مال و اسباب، کائنات ہر چیز مٹ جائے گی۔ صرف یہی ایک چیز باقی رہے گی۔ لہٰذا اعمال صالحہ بھی اس سے مراد ہیں۔ دراصل اللہ کی رضا یہی چیز ہے۔ سورہ کی ابتدا میں اللہ نے فرمایا ہے کہ جس نے حسین، اچھی اور خوب صورت چیز کی تصدیق کی، اللہ کی فرماں برداری کی، مال دیا، اس کے غضب سے بچا، اس کی باتوں کو سچ مانا، اس پر اللہ نے اجر کا وعدہ کیا اور سب سے بڑھ کر تو اس کی رضامندی ہے۔

وَ رِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ ؕ (التوبۃ:۷۲)

"سب سے بڑھ کر اللہ کی خوش نودی انھیں حاصل ہوگی۔"

سب سے بڑی نعمت، جو آدمی کو مل سکتی ہے وہ اللہ کی خوش نودی ہے۔ اس کے بغیر آدمی کا دل اس طرح نہیں کھل سکتا اور نہ اس میں اتنی وسعت پیدا ہوسکتی ہے کہ جو اللہ نے دیا ہو وہ اس کی راہ میں قربان کردے۔ جب اس بات پر یقین ہوجائے کہ اللہ کی خوش نودی اور اجر مجھے ملنے والا ہے تو پھر آدمی کی جیب بھی کھل جاتی ہے اور اعلیٰ ظرفی، وسعت اور کشادگی بھی پیدا ہوجاتی ہے۔

حضرت عثمان غنیؓ کا واقعہ ہے کہ ایک دفعہ مدینہ کے اندر بڑا زبردست قحط پڑا۔ حضرت عثمان غنیؓ کا ایک ہزار اونٹ کا قافلہ آیا، جس میں کھانے پینے کا سامان، کپڑے اور بہت ساری چیزیں تھیں۔ یوں سمجھیے کہ چار پانچ ویگنیں بھر کر مال آ گیا، اور آج کے زمانے میں آپ سمجھیں کہ وہ سول امپورٹر تھے اور ان کا سارا مال مدینہ پہنچ گیا۔ سارے مدینے کے تاجر جمع ہو گئے، جن میں ریٹیلر اور ڈسٹری بیوٹرز بھی تھے اور کہنے لگے کہ لائیے آپ اپنا مال ہمیں دیجیے۔ انھوں نے کہا کہ کیا قیمت لگاؤ گے؟ لوگوں نے قیمت لگانا شروع کی۔ روایات میں آتا ہے کہ انھوں نے پانچ فیصد سے دس فیصد تک قیمت لگائی۔ آج کل تو ہنسی آتی ہے کہ دس فی صد پر کون مال بیچتا ہے لیکن روایت میں آتا ہے کہ وہ آخر میں دس فی صد تک پہنچے۔ جب لوگ قیمت لگاتے تو وہ کہتے کہ مجھے تو ایک تاجر اس سے بھی زیادہ قیمت دے رہا ہے۔ پھر وہ اور بڑھاتے تو وہ کہتے کہ مجھے تو ایک تاجر اس سے بھی زیادہ قیمت دے رہا ہے۔ جب وہ آخری حد تک پہنچے تو لوگوں نے کہا کہ ہم سب تاجر تو یہاں پر جمع ہیں۔ مدینہ کا وہ کون سا ایسا تاجر ہے، جو باہر رہ گیا اور آپ کو اس سے بھی زیادہ قیمت دے رہا ہے، تو انھوں نے کہا کہ ایک تاجر کہتا ہے کہ میں ایک کے ۷۰۰ دوں گا۔ کیا اس کا تم مقابلہ کرسکتے ہو؟ اس کے بعد انھوں نے پورے ایک ہزار اونٹ لے جاکر حضرت عمرؓ کے سپرد کردیے اور کہا کہ یہ سارا مال قحط زدہ لوگوں میں تقسیم کردیجیے۔ یہ انفاق صرف وَ صَدَّقَ بِالْحُسْنٰى سے اور ابْتِغَاءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْاَعْلٰى سے پیدا ہوسکتا ہے۔

یہ تو ایک مال دار اور دولت مند آدمی کا دینا تھا۔ مگر جو مزدور اور کسان تھے، ان کے حال پر بھی ذرا غور کیجیے کہ حضور ﷺ غزوۂ تبوک پر جا رہے تھے، جہاد درپیش تھا، روایات میں آتا ہے کہ مزدور رات بھر جاگ کر کھجور کے باغات میں اور کھیتوں میں سینچ سینچ کر پانی دیا کرتے تھے اور صبح کو

دو صاع (سوا دو سیر یا اڑھائی سیر) کھجوریں مزدوری کے عوض ملا کرتی تھیں، ان میں سے آدھی حضور ﷺ کے ہاتھ پر رکھ دیتے تھے کہ اس سے آپ ﷺ جہاد کا سامان خرید لیں اور آدھی اپنے اہل وعیال کے لیے لے جاتے تھے۔ یہ ان کا انفاق تھا جو بالکل قلاش لوگ تھے۔ اس لیے جس کو اللہ کے وعدوں پر اور ان خوب صورت چیزوں پر، جو اللہ نے محفوظ کر رکھی ہیں یقین ہوگا، اور جس کے سامنے صرف اپنے رب اعلیٰ کی خوش نودی اور رضا مندی ہوگی، صرف وہی اس طرح سے انفاق کر سکتا ہے۔

وَ لَسَوْفَ يَرْضٰى ۝ (الیل:۲۱)

''اور ضرور وہ (اس سے) خوش ہوگا۔''

اس تمام کے نتیجے میں یہ وہ وعدہ ہے، جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں سے کیا ہے۔ کچھ نے اس کا ترجمہ یہ کیا ہے کہ عن قریب وہ راضی ہوگا اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ راضی ہو جائے گا۔ گویا جب وہ اس طرح اللہ کی راہ میں دے گا، صرف اس کی خوش نودی کے لیے دے گا، تو وہ اس سے راضی ہو جائے گا۔ کچھ نے اس کا ترجمہ یہ کیا ہے کہ اللہ اس کو دے کر اتنا نہال کر دے گا کہ وہ آدمی خوش ہو جائے گا۔ دونوں ہی معنی ہو سکتے ہیں۔ بیک وقت بھی دونوں معنی اس طرح ہو سکتے ہیں کہ بندے کی خوش نودی تو یہ ہے کہ وہ اللہ کی رضا حاصل کرے اور جب اللہ راضی ہو جائے گا تو اس سے زیادہ اس کو اور کیا چاہیے۔ جب اللہ راضی ہو گیا تو پھر تو سب کچھ اسی کا ہے، یعنی جنت بھی اس کی ہے اور جنت کی ساری نعمتیں بھی اس کی ہیں۔ جب اللہ تعالیٰ اس سے خوش ہو جائے گا، تو سب کچھ مل سکتا ہے اور بندے کو جب اللہ سب کچھ دے دے گا، جو وہ چاہتا ہے تو پھر بندہ بھی نہال ہو جائے گا اور خوش ہو جائے گا۔

اور یہ آخری بات ہے، جس پر یہ سورہ ختم ہو جاتی ہے۔

ابتدا سے اگر آپ غور کریں تو اللہ تعالیٰ نے ایک سلسلۂ کلام شروع کر رکھا ہے اور آگے بھی آپ دیکھیں گے کہ سورۃ الناس تک ایک تسلسل سے یہ سلسلہ چلے گا۔ لیکن ہر بات اپنی جگہ پر مربوط ہے۔

پہلے انسان کی پوزیشن بتائی۔ اس کو اس کی برائی اور تقویٰ دونوں کی پہچان دے دی گئی۔ پھر جس نے اپنا تزکیہ کیا وہ کامیاب ہوا اور جس نے نہیں کیا وہ برباد ہوا۔ اس کے بعد

فرمایا کہ اب تزکیے کے لحاظ سے اعمال اور نتائج مختلف ہوں گے۔ کون سے اعمال سے تزکیہ ہوتا ہے: دینے سے ہوتا ہے، مال دینے سے، جان دینے سے اور وقت دینے سے۔ اللہ نے، جو کچھ دیا ہے اس کی خاطر دینے سے تزکیہ ہوتا ہے۔ اسی میں فلاح ہے۔ فلاح کی آخری معراج یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو اتنا بخشے گا کہ آدمی نہال ہو جائے گا، خوش ہو جائے گا، اور آدمی اتنا پالے گا کہ پھر کچھ اور مانگنے کو نہیں رہے گا۔ یہ فلاح و تزکیہ ہے۔ پھر اس کی تفسیر آئی کہ کون ہے، جس نے اس کو مٹی میں ملا دیا؟ وہ جس نے اپنے مال کو سمیٹ سمیٹ کر رکھا، کنجوسی کی اور جس نے بے پروائی کی۔ صبح سے شام تک کام کرتا رہا۔ اس نے سوچا ہی نہیں کہ اس کا اللہ کے ہاں کیا انجام ہوگا؟ اس نے دراصل اپنے آپ کو برباد کیا۔ اس کے لیے اب یہی کام آسان ہوا کہ برائیاں کرتا رہے اور اس کا انجام خراب ہو۔ دنیا میں قومِ ثمود کا حشر دکھایا تھا تو آخر میں فرمایا کہ بھڑکتی ہوئی آگ ہے۔ یہ ہے اس کا انجام۔

یہ چیزیں ہمارے یاد رکھنے کی ہیں۔ یہ نمازوں میں بھی ہم ہر وقت پڑھتے ہیں۔ یہ بات ہر وقت یاد رکھنے کی ہے کہ کیا چیزیں اللہ کو پسند ہیں اور کیا ناپسند۔ یہ کوئی لمبے چوڑے احکام نہیں کہ آپ جا کر مولوی صاحب سے پوچھیں۔ یہ تو سیدھی سیدھی باتیں ہیں: دینا اور نہ دینا، فکر کرنا اور نہ کرنا، بچنا اور نہ بچنا، ڈرنا اور نہ ڈرنا، انھی باتوں کی تعلیم دی جا رہی ہے۔ انھی بنیادوں پر وہ کردار اور سیرت بنی، جو مطلوب تھی، خاندان تشکیل پایا، نکاح و طلاق اور سود و دیگر احکام اترے، معاشرہ بنا، ریاست وجود میں آئی اور بالآخر دنیا میں اسلام غالب آیا۔ خیال رہے کہ اس سب کی بنیاد سیرت و کردار ہے۔ اگر یہ سیرت و کردار ہمارے اندر پیدا نہیں ہوگا تو ہم خواہ کتنی ہی لاف زنی کر لیں، کتنے ہی نعرے لگائیں، کتنے ہی دعوے اور تقریریں کریں کہ اسلام غالب آئے گا۔ وہ اس کردار کے بغیر کبھی غالب نہ آئے گا، جس کا ذکر چھوٹے چھوٹے جملوں میں اس سورہ میں کیا گیا ہے؟

اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ کو عمل کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

ﷺ

خلاصۂ سورۃ الیل

سورۂ لیل، سورۂ شمس سے متصل ہے۔ اس کا سلسلۂ مضامین بھی سورۂ شمس کی طرح دین کی بنیادی تعلیمات پر مشتمل ہے۔ اس سورہ میں بھی انسان کی حیثیت اور مقام، نیکی اور بدی کی پہچان اور اختیار کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ ہمارے علم کی حد تک یہ اختیار اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ مخلوقات میں سے صرف انسان کو حاصل ہے، باقی تمام مخلوق اس کے حکم کی پابند ہے۔ چوں کہ اس نے انسان کو نیکی اور بدی کا اختیار دیا ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ کے سامنے وہ جواب دہ بھی ہے۔ لہٰذا یہ ضروری ہے کہ جو شخص نیک عمل کرے اس کے عمل کا اچھا بدلہ دیا جائے، اور جو برا عمل کرے اس کو برا۔

اگر ان میں سے کوئی بھی چیز اپنی جگہ پر موجود نہ ہو تو قرآن مجید، رسالت، نبوت، دین کی تعلیم، نیکی و بدی اور جنت و دوزخ اور آخرت کے لیے کوئی بنیاد باقی نہیں رہتی۔ اس لیے اگر ہم یہ کہیں کہ سورۂ شمس، جہاں سے ہم نے قرآن کو سمجھنے کا آغاز کیا ہے، یہی دراصل دین کی بنیاد بھی ہے تو یہ بات صحیح ہوگی۔

ان دونوں سورتوں میں بہت مماثلت پائی جاتی ہے۔ پہلی سورہ، سورۂ شمس کا آغاز سورج، چاند، دن، رات اور آسمان کو گواہی اور شہادت کے طور پر پیش کر کے کیا گیا ہے، جب کہ اس سورہ کا آغاز بھی رات اور دن کی گواہی سے ہوتا ہے۔ اگر سورۂ شمس میں انسانی نفس کو، جس طرح اللہ تعالیٰ نے اسے بنایا ہے، گواہی کے طور پر پیش کیا گیا ہے، تو اس سورہ میں نفس انسانی کا یہ پہلو کہ اس نے نر اور مادہ کی تخلیق کی اور کائنات کی ہر چیز جو اس نے پیدا کی ہے، کا ذکر کیا گیا ہے۔ ان دونوں سورتوں کے بارے میں اکثر مفسرین نے لکھا ہے کہ یکساں، ہم آہنگ اور ایک

دوسرے کے لیے جوڑے کی حیثیت رکھتی ہیں۔ بعض احادیث سے ثابت ہے کہ نبی کریم ﷺ ان دونوں کو اکٹھا پڑھا کرتے تھے۔ طبرانی کی روایت کے مطابق آپ ﷺ نے نمازِ ظہر میں پہلی رکعت میں سورۂ شمس پڑھی اور دوسری رکعت میں سورۂ لیل تلاوت کی۔ اسی طرح کئی دوسری سورتوں کے بارے میں بھی آپ ﷺ کا یہی معمول تھا، مثلاً سورۂ جمعہ اور سورۂ منافقون، سورۂ اعلیٰ اور سورۂ غاشیہ کو بھی آپ ﷺ عموماً ایک ساتھ تلاوت کیا کرتے تھے۔

یہ بات بھی پیشِ نظر رہے کہ یہاں ایک ہی مضمون کو دہرانے کے لیے متصلاً ایک اور سورہ نہیں رکھ دی گئی ہے بلکہ جو بات سورۂ شمس میں کہی گئی تھی اس بات کو مزید آگے بڑھایا گیا ہے۔ شمس میں اگر یہ بات کہی گئی تھی کہ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا ۝ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا ۝ (الشمس:۹،۱۰) ''یقیناً فلاح پا گیا وہ، جس نے نفس کا تزکیہ کیا اور نامراد ہوا وہ جس نے اس کو دبا دیا۔'' تو اس سورہ میں ان بنیادی اعمال کی تفصیل ہے، جن سے آدمی کا تزکیہ ہوتا ہے اور وہ فلاح پا سکتا ہے، نیز ان اعمال کی نشان دہی کی گئی ہے، جن سے وہ اپنے آپ کو برباد اور تباہ کر سکتا ہے۔ سورۂ شمس میں اگر قوموں کی اجتماعی زندگی میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی، طغیانی، سرکشی اور بغاوت کی روش اپنانے اور اس کے نتیجے میں قومِ ثمود کی تباہی کا ذکر ہے، تو یہاں دنیا میں زندگی گزارنے کے دو طریقے اور ان کی پیروی کا انجام بتایا گیا ہے۔ یہ دراصل اس سورہ کا مرکزی مضمون ہے اور اس لحاظ سے اس میں بڑی بنیادی تعلیم دی گئی ہے۔

ان مختصر سورتوں کی اہمیت یہ ہے کہ یہ چھوٹے چھوٹے بول پر مشتمل ہیں۔ جس طرح مصرع، کہاوتیں، ضرب المثل آدمی کی زبان پر چڑھ جاتے ہیں، اسی طرح یہ بھی آدمی کی زبان پر آسانی کے ساتھ چڑھ جاتی ہیں۔ کثرت سے ان کی تلاوت ہوتی ہے۔ چوں کہ ہم ان کے مضامین سے غافل ہوتے ہیں، اس لیے پتا نہیں چلتا کہ زندگی کے بارے میں کتنی اہم باتیں ان سورتوں میں بیان کی گئی ہیں۔ چھوٹے چھوٹے جملوں میں وہ ساری باتیں جو کہ جاننا ضروری ہیں، بیان کر دی جاتی ہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ یہ سورتیں مکی زندگی کے ابتدائی دور میں نازل ہوئی ہیں۔ ان میں احکام کی تفصیلات بیان نہیں کی گئیں۔ شراب، سود اور پردے سے متعلق اور دیگر احکام، یہ سب بہت بعد میں نازل ہوئے۔ البتہ ان سورتوں میں ان احکام کا بوجھ اٹھانے کے لیے، جس سیرت،

جس مزاج، جس کردار اور جس اخلاق کی ضرورت ہے، اس کی تعمیر کی گئی ہے اور اس کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ اس لیے وہ الفاظ استعمال کیے گئے ہیں جو بڑی جامعیت کے حامل ہیں اور پوری سوچ، مزاج اور طرزِ زندگی کا احاطہ کیے ہوئے ہیں، مثلاً ایک لفظ طغیان یا طَغٰی (الشمس:۱۱) ''اپنی حدود سے باہر نکل جانا'' استعمال ہوا ہے۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جب تک آدمی اپنی حدود کے اندر رہنا نہیں سیکھے گا وہ اللہ کے احکام پر عمل نہیں کر سکتا۔ اسی طرح ایک لفظ ہے: زَکّٰھَا (الشمس:۹) ''جس نے تزکیہ کیا۔'' اس میں تزکیۂ نفس کی تعلیم دی گئی ہے کہ جس نے اس بات کی فکر کی کہ اپنے آپ کو برائیوں سے بچائے اور بھلائیوں کو نشو و نما دے، وہ کامیاب ہو گیا، اور جس نے اس بات کی فکر اور پروا نہ کی وہ فلاح اور کامیابی کی راہ پر نہیں چل سکتا۔

یہ ایک کھلی حقیقت ہے کہ خواہ کتنے ہی احکام سنائے جائیں، کتنے ہی قوانین نافذ کیے جائیں، کتنے ہی وعظ ہوں جس طرح سے مساجد میں آج ہزاروں وعظ اور ہزاروں درس ہوتے ہیں، چوں کہ بنیاد غائب ہے اس لیے وہ موثر نہیں ہوتے۔ جب تک بنیادی سوچ پیدا نہ ہو، آدمی کو فکر اور پروا نہ ہو، وہ اپنی حدود میں رہنا نہ سیکھے، اپنے آپ کو ان چیزوں سے بچانے کی استعداد نہ پیدا کرے، جو اس کو تباہ و برباد کرنے والی ہیں، اس وقت تک بھلائی کی راہ ہموار نہیں ہو سکتی۔

⁂

سورۃ الضُّحٰی

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ۝

وَالضُّحٰی ۝۱ وَالَّیۡلِ اِذَا سَجٰی ۝۲ مَا وَدَّعَکَ رَبُّکَ وَمَا قَلٰی ۝۳ وَلَلۡاٰخِرَۃُ خَیۡرٌ لَّکَ مِنَ الۡاُوۡلٰی ۝۴ وَلَسَوۡفَ یُعۡطِیۡکَ رَبُّکَ فَتَرۡضٰی ۝۵ اَلَمۡ یَجِدۡکَ یَتِیۡمًا فَاٰوٰی ۝۶ وَوَجَدَکَ ضَآلًّا فَہَدٰی ۝۷ وَوَجَدَکَ عَآئِلًا فَاَغۡنٰی ۝۸ فَاَمَّا الۡیَتِیۡمَ فَلَا تَقۡہَرۡ ۝۹ وَاَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنۡہَرۡ ۝۱۰ وَاَمَّا بِنِعۡمَۃِ رَبِّکَ فَحَدِّثۡ ۝۱۱ ع ۱۸

اللہ کے نام سے، جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔

’’قسم ہے روزِ روشن کی اور رات کی جب کہ وہ سکون کے ساتھ طاری ہو جائے۔ (اے نبیؐ) تمھارے رب نے تم کو ہرگز نہیں چھوڑا اور نہ وہ ناراض ہوا۔ اور یقیناً تمھارے لیے بعد کا دور پہلے دور سے بہتر ہے، اور عن قریب تمھارا رب تم کو اتنا دے گا کہ تم خوش ہو جاؤ گے۔ کیا اس نے تم کو یتیم نہیں پایا اور پھر ٹھکانا فراہم کیا؟ اور تمھیں ناواقف راہ پایا اور پھر ہدایت بخشی۔ اور تمھیں نادار پایا اور پھر مال دار کر دیا۔ لہٰذا یتیم پر سختی نہ کرو، اور سائل کو نہ جھڑکو، اور اپنے رب کی نعمت کا اظہار کرو۔‘‘

تشریح: سورۂ ضحٰی گیارہ آیات پر مشتمل ہے۔ پہلی دو آیات میں دن اور رات کی قسم کھائی گئی ہے۔ اگلی تین آیات میں اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ سے محبت اور شفقت کے ساتھ وعدے فرمائے ہیں۔

اس کے بعد حضور ﷺ کی ذات مبارک پر اللہ تعالیٰ کے جو احسانات رہے ہیں، ان کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ آپ ﷺ یتیم تھے، اللہ نے آپ ﷺ کی پرورش فرمائی۔ آپ ﷺ کو راہ کی تلاش تھی، اللہ نے آپ ﷺ کو راہ دکھائی۔ آپ ﷺ نادار تھے، اللہ نے آپ ﷺ کو غنی کر دیا وغیرہ۔ آخری تین آیات میں ہدایت کی گئی ہے کہ یتیم کا حق نہ مارنا، اس کو نہ جھڑکنا اور نہ دبانا۔ سائل کو خالی ہاتھ نہ لوٹانا اور نہ اس کو جھڑکنا۔ آخر میں فرمایا گیا کہ تمھارے رب نے تم پر جو نعمت فرمائی ہے، اس کو بیان کرتے رہنا۔ یہ پوری سورہ اللہ اور اس کے محبوب بندے محمد ﷺ کے درمیان گفتگو پر مبنی ہے۔

قرآنی سورتوں کے باہمی ربط کے حوالے سے پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر ہر سورہ پچھلی سورہ سے مربوط ہے، آنے والی سورہ سے بھی اور گزشتہ سورہ سے بھی، تو اچانک یہ حضور ﷺ سے خطاب کیوں شروع ہو گیا؟ نیز کیا اس میں عام مسلمانوں کے لیے بھی کوئی رہ نمائی ہے؟ اس حوالے سے گزشتہ سورتوں کا جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔ سورۂ شمس پر اگر غور کیا جائے تو اس میں اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا ہے کہ ہر انسان اپنی فطرت، طبیعت اور مزاج میں ہدایت کا سامان لیے ہوئے ہے۔ نیکی بدی اور اچھائی برائی کی پہچان اسے ودیعت کی گئی ہے۔ وہ اپنی ذات اور زندگی کے لیے ذمے دار بنایا گیا ہے اور اسے انتخاب و اختیار کی آزادی دی گئی ہے۔ اس اختیار کو استعمال کر کے اگر وہ نیکی کی راہ اختیار کرے گا تو کامیاب ہوگا۔ جیسا کہ قرآن نے کہا: قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى ۝ (الاعلیٰ: ۱۴) "فلاح پا گیا وہ، جس نے پاکیزگی اختیار کی۔" اس کے مقابلے میں اگر اس نے اپنے نفس کو برائیوں کے نیچے دبا دیا تو وہ نامراد ہوگا اور نقصان میں رہے گا۔

اس کے بعد سورۂ لیل ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ انسان کی کوششیں مختلف نوعیت کی ہوتی ہیں، اخلاقی طور پر بھی، اپنی حقیقت کے اعتبار سے بھی اور اپنے نتائج کے اعتبار سے بھی۔ اس بنیاد پر اللہ نے اعمال کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ اعمال کی ایک قسم وہ ہے، جس سے نیکی یا جنت کی راہ آسان ہوتی ہے، اور دوسری قسم وہ ہے، جس کے نتیجے میں انسان برائی یا جہنم کی راہ پر چل نکلتا ہے۔ آخرت میں بھی ان دونوں گروہوں کا انجام مختلف ہوگا۔ ایک کے لیے بھڑکتی ہوئی آگ ہے اور دوسرے کے لیے اللہ کی طرف سے ہدیہ، تحفہ اور عنایات ہیں، جن کو پا کر وہ خوش ہو جائے گا۔

سورۂ لیل میں یہ بات بھی کہی گئی ہے کہ اِنَّ عَلَيْنَا لَلْهُدٰى ۝ (الیل: ۱۲) "بے شک راستہ بتانا ہمارے ذمے ہے۔" گویا اللہ تعالیٰ یہ فرما رہے ہیں کہ یہ راستہ ہم نے تمھاری فطرت

اور طبیعت میں نیکی کی پہچان رکھ کر بھی بتایا ہے اور یہ راستہ ہم نے رات اور دن، سورج اور چاند، آسمان سے برسنے والی بارش اور زمین سے اُگنے والی کھیتی سے بھی سمجھایا ہے۔ ان سب میں تمھارے لیے ہمارے راستے کی نشانیاں ہیں۔ اس کے علاوہ ہم نے انبیا علیہم السلام بھیجے جنھوں نے اس بات کی تعلیم دی کہ اللہ کی بندگی کیسے کی جائے، اس کے احکام کیا ہیں، جن کی پابندی کرنا چاہیے، نیز زندگی کیسے گزاری جائے؟ ان انبیا علیہم السلام میں حضرت محمد ﷺ سب سے آخری نبی اور ہادی ہیں۔

اس پس منظر میں دیکھا جائے تو سورۂ ضحیٰ میں اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری نبی حضرت محمدؐ کو مخاطب فرما کر ہدایت فرمائی ہے کہ جو فریضہ، ذمے داری اور کام اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کے سپرد کیا ہے، اسے کیسے انجام دیا جائے، لوگوں تک ہدایت کیسے پہنچائی جائے اور کیا طریقۂ کار اپنایا جائے؟ نیز اس سلسلے میں آپ ﷺ کی روش اور کردار کیا ہونا چاہیے؟ اس طرح سورۂ ضحیٰ کا گزشتہ سورتوں کے ساتھ ایک ربط اور تسلسل قائم ہو جاتا ہے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر یہ پوری سورہ اللہ کے نبی ﷺ سے خطاب پر مبنی ہے تو اس میں ہمارے لیے کیا ہدایت و رہنمائی ہے؟ اگر غور کیا جائے تو اس کے اصل مخاطب مسلمان ہیں۔ نبی آخر الزماں ﷺ کے امتی ہونے کے ناطے جو بات بھی آپ ﷺ سے کہی جا رہی ہے، دراصل اس کے مخاطب ہم ہیں۔ یہ ہمارا ایمان ہے کہ آپ ﷺ اللہ کے آخری نبی ہیں اور آپ ﷺ کے بعد کوئی نبی نہیں آنے والا ہے۔

ختم الرسل حضرت محمدؐ کی بعثت کے بعد انسانوں تک ہدایت پہنچانے کی ذمے داری اللہ نے اس طرح پوری کی:

وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَ يَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ؕ (البقرۃ: ۱۴۳)

”اور اسی طرح تو ہم نے تم مسلمانوں کو ایک امت وسط بنایا ہے تاکہ تم دنیا کے لوگوں پر گواہ ہو اور رسول تم پر گواہ ہو۔“

گویا ہم نے تم کو امت وسط اس لیے بنایا ہے کہ جس طرح اللہ کے رسول ﷺ نے تم تک دین پہنچایا، اسے پیش کیا اور اس کی گواہی دی، اسی طرح تمام انسانوں تک ہر قوم، ہر نسل اور ہر

جگہ تا قیامت دین پہنچانے کی ذمے داری اب تمھاری ہے۔ اس لحاظ سے اس سورہ کے اصل مخاطب مسلمان ہیں۔ اب یہ مسلمانوں کی ذمے داری ہے کہ وہ نبی آخر الزماں ﷺ کے جانشین ہونے کے ناطے، قرآن کے پیغام کو عام کریں اور عامۃ الناس تک کما حقہ ہدایت پہنچانے کی ذمے داری پوری کریں۔ اس سورہ میں فریضۂ اقامت دین کی ادائیگی کے لیے ہدایات ورہنمائی دی گئی ہے۔

اس سے بڑھ کر بات یہ ہے کہ ہمارے لیے محبوب ترین ذات، آپ ﷺ کی ذات ہے۔ اس لیے کہ ہمیں جو کچھ آپ ﷺ سے ملا، وہ کہیں اور سے نہیں ملا۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ کی بے شمار نعمتیں ہمیں میسر ہیں مگر وہ چیز جس سے ہماری زندگی صحیح راہ پر لگ سکتی ہے، جس سے ہمارے لیے جنت کی راہ آسان ہو سکتی ہے، جس سے ہماری چند گھنٹوں یا چند برسوں پر محیط عارضی زندگی ابدی آرام وراحت میں بدل سکتی ہے، وہ نسخہ صرف آپ ﷺ ہی نے ہمیں بتایا اور محض بتایا ہی نہیں بلکہ اس پر عمل کر کے بھی دکھایا۔ ورنہ ہم سب اندھیروں میں بھٹک رہے ہوتے اور گمراہی میں اپنی زندگی گزار رہے ہوتے۔ یہی وجہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے بار بار فرمایا کہ اپنی جان، مال اور اولاد بلکہ اپنے آپ سے بڑھ کر مجھ سے محبت کرو۔ حلاوتِ ایمان یا ایمان کی مٹھاس کی نشانی یہ ہے کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ ہمیں ان سب چیزوں سے بڑھ کر پیارے اور محبوب ہو جائیں۔ جہاں اللہ کے پیارے اور محبوب کا ذکر ہو، وہ چیز تو ویسے ہی ہمارے لیے بہت اہم اور قیمتی چیز ہے۔

سورۂ ضحیٰ میں بنیادی طور پر دو قسم کی چیزوں کا تذکرہ کیا گیا ہے اور مختلف مثالوں سے اس کو واضح کیا گیا ہے۔

وَالضُّحٰی ۝ وَالَّیْلِ اِذَا سَجٰی ۝ (الضحی: ۱، ۲)

''قسم ہے روزِ روشن کی اور رات کی، جب کہ وہ سکون کے ساتھ طاری ہو جائے۔''

سورہ کا آغاز روزِ روشن اور رات کی قسم کھا کر ہو رہا ہے۔ وَالضُّحٰی کے معنی دن کا وہ خاص وقت ہے جب کہ سورج چڑھ چکا ہو مگر زوال کو نہ پہنچا ہو۔ بعض لوگوں نے اس سے پورے دن کا مفہوم مراد لیا ہے، یعنی روزِ روشن، جب کہ بعض نے اس سے مراد دن کی روشنی لی ہے۔ یہاں مقصود یہ بحث نہیں ہے کہ اس کا اصل مفہوم کیا ہے بلکہ یہ ہے کہ یہ قسم کیوں کھائی گئی ہے۔

عام طور پر آدمی قسم اس چیز کی کھاتا ہے، جو اس سے زیادہ برتر، طاقت ور یا موثر ہو۔ ہم اللہ کی قسم اس لیے کھاتے ہیں کہ اللہ ہم سے اعلیٰ و برتر ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے

اپنی مخلوق کی قسم کیوں کھائی جو کہ کسی صورت میں اس سے برتر نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قسم کھانے کا ایک مقصد کسی چیز کی سچائی پر گواہی دینا بھی ہوتا ہے۔ گواہ ہمیشہ قسم کھا کر گواہی دیتا ہے۔ اللہ کی قسم کوئی شخص اس لیے کھاتا ہے کہ وہ اس چیز کی سچائی پر اللہ تعالیٰ کو گواہ بنا رہا ہوتا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ جو حقائق ہمارے سامنے رکھ رہا ہے، ان کی حقانیت اور سچائی پر وہ ان چیزوں کو بطورِ گواہ پیش کرتا ہے، جن کی وہ قسم کھاتا ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے متعدد مقامات پر اسی اصول کے تحت اس قسم کی قسمیں اٹھائی ہیں، مثلاً سورۂ تین اور سورۂ عصر میں انجیر اور زمانے کی قسم وغیرہ۔

سورۂ ضحیٰ میں دن اور رات کی قسم بھی اس لیے کھائی گئی کہ یہ ان باتوں کی سچائی اور حقانیت پر گواہ ہیں جن کا ذکر اس سورہ میں کیا جارہا ہے۔

اس سورہ میں قسم اٹھانے کے ضمن میں مفسرین نے بہت سے علمی سوالات اٹھائے ہیں، مثلاً اس سے پہلی سورہ میں پہلے رات کی قسم کھائی گئی اور پھر دن کی۔ لیکن یہاں پہلے دن کی قسم کھائی گئی اور پھر رات کی۔ اس کی کیا حکمت ہے؟ اس حوالے سے مفسرین نے تفصیلی بحث کی ہے لیکن اصل بات جاننے کی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم سے کیا فرما رہا ہے، کیا ہدایت دے رہا ہے اور ہمیں کیا کرنا چاہیے؟ یہ بات جاننے کے لیے اس علمی بحث میں پڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ اپنے کلام کے ذریعے ہم سے براہِ راست مخاطب ہے۔ اگر ہم نکتہ آفرینی یا علمی بحث میں اُلجھ کر رہ جائیں تو پھر ہدایت کا پہلو متاثر ہو جاتا ہے جو قرآن کا اصل منشا ہے۔ اس لیے یہاں ان تمام سوالات کے تذکرے کی ضرورت نہیں جو انسان اپنی ذہنی تسکین اور علمی بحث کے لیے اٹھاتا ہے، اور جن کا ذکر تفسیروں میں موجود ہے۔ البتہ یہ بنیادی سوال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہاں دن اور رات کی قسم کس وجہ سے کھائی ہے؟ قرآن مجید میں جہاں جہاں بھی قسم کھائی گئی ہے وہاں یہ سوال ضرور پیدا ہوتا ہے۔ اس بنیادی بات کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔

قرآن مجید میں مختلف مقامات پر مختلف انداز میں قسم اٹھائی گئی ہے۔ کہیں عبارت سے متعلق قسم کھائی جاتی ہے، مثلاً سورۂ لیل میں اس انداز میں قسم کھائی گئی ہے:

وَالَّيْلِ اِذَا يَغْشٰى ۝ وَالنَّهَارِ اِذَا تَجَلّٰى ۝ وَمَا خَلَقَ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰٓى ۝ اِنَّ سَعْيَكُمْ لَشَتّٰى ۝ (الیل: ۱-۴)

"قسم ہے رات کی، جب کہ وہ چھا جائے، اور دن کی، جب کہ وہ روشن ہو، اور اس ذات کی جس نے نر اور مادہ کو پیدا کیا، درحقیقت تم لوگوں کی کوششیں مختلف قسم کی ہیں۔"

یعنی تمھاری کوششیں اسی طرح مختلف ہیں، جس طرح رات اور دن یا نر اور مادہ مختلف ہیں۔ کسی جگہ قسم کھانے کا تذکرہ متعدد آیات کے بعد کیا جاتا ہے۔ کسی جگہ پوری سورۂ ایک مضمون پر مشتمل ہوتی ہے، جس پر قسم شہادت کا ثبوت فراہم کرتی ہے۔ مثلاً سورۂ قیامہ میں ان الفاظ میں قسم کھائی گئی:

لَآ اُقْسِمُ بِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۙ وَلَآ اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ ۭ (القیمۃ:۱،۲)

"نہیں، میں قسم کھاتا ہوں قیامت کے دن کی اور نہیں، میں قسم کھاتا ہوں ملامت کرنے والے نفس کی۔"

پوری سورہ میں قیامت کا تذکرہ ہے، جس کی حقانیت اور سچائی کو ثابت کرنے کے لیے یہ قسم اٹھائی گئی ہے۔ ان تمام مقامات پر اللہ تعالیٰ اپنی بات کی سچائی کو ثابت کرنے کے لیے بطور گواہی اور شہادت یہ مختلف قسمیں اٹھاتا ہے نہ کہ ان کی عظمت کی بنا پر۔

سورۂ ضحیٰ میں، دن اور رات کی قسم سورہ کے مضمون سے متعلق ہونے کی بنا پر کھائی گئی ہے۔ دن اور رات کی گواہی دے کر اللہ تعالیٰ اپنے محبوب بندے کو یہ بات سمجھا رہے ہیں کہ جس طرح دن اور رات میں تغیر و تبدل ہوتا ہے، اسی طرح حالات میں بھی تبدیلی آنا فطری امر ہے۔ راہِ حق میں مشکلات پیش آ رہی ہیں، لوگ بات سننے کے روادار نہیں بلکہ رکاوٹیں کھڑی کر رہے ہیں تو یہ کوئی ایسی پریشانی کی بات نہیں۔ حق بہرحال غالب آ کر رہے گا۔ اللہ کی مدد تمھارے شاملِ حال ہے۔ اس کا وعدہ پورا ہو کر رہے گا۔ آپ ﷺ حق کی دعوت دیتے چلے جایئے۔ آپ ﷺ کا رب آپ ﷺ کے ساتھ ہے۔ وہ ناراض نہیں ہوا۔

مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰى ۭ (الضحیٰ:۳)

"(اے نبی ﷺ) تمھارے رب نے تم کو ہرگز نہیں چھوڑا اور نہ وہ ناراض ہوا۔"

اس آیت کے حوالے سے تفاسیر میں عموماً یہ واقعہ بیان کیا جاتا ہے کہ پہلی وحی کے نزول کے بعد نزولِ وحی میں کچھ وقفہ آ گیا تھا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ پہلی وحی کے بعد نہیں بلکہ کچھ عرصہ گزرنے کے بعد یہ وقفہ آیا تھا۔ اس وقفے کی مدت مختلف بیان کی گئی ہے۔ بعض لوگوں کے خیال میں یہ مدت ۱۱ دن تھی۔ بعض کے خیال میں ۱۵ یا ۴۰ دن تھی۔ اس مدت کے

دوران حضور ﷺ بہت پریشان ہو گئے تھے۔ کیوں کہ حضور ﷺ اپنے آقا کے جس کام کی انجام دہی کے لیے کھڑے ہوئے تھے، اس کام کا بنیادی سہارا اور دل کے اطمینان و تسلی کا تمام تر انحصار اس گفتگو پر تھا، جو آپ ﷺ کی اپنے محبوب رب سے ہوا کرتی تھی۔ چناں چہ جب یہ سلسلہ رک گیا تو آپ ﷺ کو پریشانی ہوئی کہ کہیں میرا اللہ مجھ سے ناراض تو نہیں ہو گیا؟ کہیں مجھ سے کوئی غلطی یا قصور تو سرزد نہیں ہو گیا؟ اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے یہ سورہ نازل فرمائی اور فرمایا کہ نہیں، تمھارے رب نے نہ تمھیں چھوڑا ہے اور نہ وہ تم سے ناراض ہوا ہے۔ یہ اس سورہ کی شانِ نزول ہے۔

یہاں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ اگر ہمیں یہ بات نہ بھی معلوم ہو کہ یہ آیات اس وقت نازل ہوئی تھیں جب ایک عرصے تک نبی کریم ﷺ پر وحی کا نزول نہ ہوا تھا، تب بھی قرآن کے پیغام کو سمجھنے، اس سے ہدایت حاصل کرنے اور اس پر عمل کرنے میں ہمیں کوئی رکاوٹ یا مشکل پیش نہیں آئے گی۔

قرآن کی مختلف سورتوں کی شانِ نزول کے بارے میں، مفسرین اور علماء نے جن میں امام ابن تیمیہ علیہ الرحمہ اور شاہ ولی اللہ علیہ الرحمہ جیسے جید علماء شامل ہیں، یہ لکھا ہے کہ جب کوئی واقعہ کسی آیت کی شانِ نزول میں بیان کیا جاتا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ یہ واقعہ اس آیت کے نزول کا سبب بنا بلکہ اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ اس آیت کے مفہوم کا اطلاق اس واقعے پر بھی ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں ایسا بھی دیکھنے میں آتا ہے کہ آیات تو مکہ میں اترتی ہیں مگر واقعہ مدینہ میں پیش آتا ہے۔

قرآن کی شانِ نزول کے بارے میں شاہ ولی اللہ علیہ الرحمہ کے یہ الفاظ قرآن مجید کو سمجھنے کے لیے بڑے قیمتی اور انقلابی ہیں کہ قرآن مجید کی شانِ نزول صرف ایک ہے اور وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ انسان کو راہِ ہدایت دکھانا چاہتا ہے۔ اس کے باطل عقائد و نظریات اور افکار کی تردید کرنا چاہتا ہے اور اسے حق کی راہ پر چلانا چاہتا ہے۔ صرف اہل مکہ و مدینہ یا صحابہ کرامؓ کو ہی نہیں بلکہ ہر زمانے میں، ہر قوم کو راہِ حق دکھانا چاہتا ہے۔ لہٰذا قرآن کی شانِ نزول، انسان کے گمراہ و باطل نظریات کی تردید اور اللہ کی طرف سے انسانوں کی ہدایت و رہنمائی کی ذمے داری کی ادائیگی کا نام ہے۔ فی الحقیقت یہی قرآن کی شانِ نزول ہے۔

لہٰذا قرآن میں اس قسم کے جتنے بھی واقعات آتے ہیں، وہ یہ بتاتے ہیں کہ یہ ایک

خاص واقعہ ہے، جس پر اس آیت کا اطلاق ہوتا ہے۔ یقیناً نزولِ وحی میں وقفہ آنے پر حضورﷺ کے رنج وغم اور پریشانی میں اضافہ ہوا ہوگا، اس پر بھی اس آیت کا اطلاق ہوتا ہے۔

فی الواقع اصل بات یہ ہے کہ نبی کریمﷺ مکہ میں دعوت کا جو کام کر رہے تھے، قرآن کے جس پیغام کو عام کر رہے تھے، اس راہ میں آپﷺ کو سخت مصائب، مخالفتوں اور مشکلات کا سامنا تھا۔ لوگ آپﷺ کا مذاق اڑاتے تھے، بات سننے کو تیار نہ تھے۔ کوہِ صفا پر چڑھ کر آپﷺ نے پوری قوم کو پکارا۔ لوگ آئے مگر مذاق اڑا کر چلے گئے۔ گھر میں اپنے قبیلے، رشتے داروں اور حقیقی چچا وغیرہ کی دعوت کی مگر انھوں نے بھی بات نہ سنی، الٹا مذاق اڑایا۔ لوگ تمسخر اڑاتے تھے، پتھر پھینکتے تھے اور راہ میں کانٹے بچھاتے تھے۔ اسی قسم کی بہت سی مشکلات و پریشانیوں کا آپﷺ کو سامنا تھا۔ ان حالات میں جو آدمی یہ سمجھتا ہو کہ وہ اس رب کائنات کا نمائندہ، سفیر اور پیغام بر ہے، جس کے اختیارات ہر چیز پر حاوی ہیں مگر وہ بے یار ومددگار نظر آتا ہو، ہر ایک اس کی مخالفت پر تلا بیٹھا ہو اور اس پر چڑھ دوڑا ہو، تو اس کا مضطرب اور پریشان ہونا فطری امر تھا۔ خاص طور پر وادی طائف میں جب لوگ آپﷺ پر پتھر برسا رہے تھے اور آپﷺ کا خون بہہ رہا تھا، اس وقت آپﷺ نے جو دعا فرمائی تھی کہ اے اللہ تو نے مجھے کہاں چھوڑ دیا ہے، مجھے بے وطن کر دیا ہے اور میرے دشمن کو مجھ پر قابو دے دیا ہے، وہ اسی ذہنی کیفیت کی عکاسی کرتی ہے۔ پھر انسان کو خیال بھی آتا ہے کہ کہیں مجھ سے کوئی کوتاہی یا غلطی سرزد نہ ہوگئی ہو، آخر مجھے کیوں بے یار ومددگار چھوڑ دیا گیا؟ یہ سب کچھ کیوں پیش آرہا ہے؟

اس بات کو جاننے کے لیے ہمیں کسی مخصوص واقعے یا شانِ نزول کو سمجھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ جو شخص بھی حضورﷺ کی سیرت سے، مکی زندگی کے حالات اور سورۂ ضحیٰ کے نزول کے وقت حالات سے واقف ہے، وہ اس بات کو بخوبی سمجھ سکتا ہے کہ ایک پیغمبر، داعی حق اور مصلح جو اپنی قوم کی اصلاح کرنا چاہتا ہو، ان حالات میں کس قسم کی ذہنی کیفیت سے دوچار ہوا ہوگا۔ لوگ کیوں میرا مذاق اڑاتے ہیں؟ میری بات کیوں نہیں سنتے؟ کیوں میرا ساتھ نہیں دیتے؟ اور میرا رب جو میرے ساتھ ہے اور جس نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ تم میری نگاہوں میں ہو، تم جہاں بھی ہو، میں تمھارے پاس ہوں، آخر وہ کہاں چلا گیا ہے؟ لوگ میری بات کیوں نہیں مان لیتے ہیں، جب کہ یہ بات صاف، سچی اور کھری ہے؟ لوگ حق بات کی مخالفت کیوں کرتے ہیں؟ یہ تمام سوالات اسی

اضطرابی کیفیت کی عکاسی کرتے ہیں۔

قرآن مجید نے متعدد مقامات پر اس قسم کی کیفیت پر نبی ﷺ کو رہ نمائی دی ہے مگر اس موقعے پر بہت ہی محبت، شفقت اور تسلی بھرے انداز میں فرمایا گیا ہے کہ نہیں، اے نبی ﷺ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ تمھارے رب نے نہ تمھیں چھوڑا ہے اور نہ وہ ناراض ہوا ہے۔ وَدَّعَکَ کا مفہوم اردو زبان میں وداع سے ادا ہوتا ہے، یعنی نہ تمھارے رب نے تمھیں وداع کیا یا چھوڑا ہے اور نہ وہ تم سے ناراض ہوا ہے۔

اس سورہ میں رات اور دن کا تذکرہ کر کے یہ سمجھایا گیا ہے کہ رات اور دن کے آنے جانے پر غور کرو۔ دن کے بعد رات ہو یا روشنی کے بعد تاریکی آجائے، دن گھٹ جائیں یا راتیں طویل ہو جائیں، یہ تغیر و تبدل، تبدیلی کی علامت اور اللہ کی رحمت کا نتیجہ ہے۔ روشنی اور تاریکی انسانوں، حیوانوں اور نباتات، سب کی تعمیر و ترقی، نشو و نما اور زندگی کے لیے ضروری ہے۔

جس طرح دن اور رات یا روشنی اور تاریکی ایک دوسرے سے مختلف حالتیں ہیں، اسی طرح اگر اقامتِ دین کے لیے حالات سازگار نہیں ہیں، مخالفتوں اور پریشانیوں کا سامنا ہے تو یہ فطری امر ہے۔ اس راہ میں کہیں سختی ہوگی تو کہیں نرمی، کوئی ایمان لائے گا اور کوئی نہیں لائے گا، کوئی ٹھکرا دے گا، کہیں مایوسی کا سامنا کرنا ہوگا تو کہیں امید کی کرن بھی نظر آئے گی۔

موسموں کے آنے جانے اور دن اور رات کے ہیر پھیر میں، یہی سبق پوشیدہ ہے۔ عسر اور یسر، تنگی اور آسانی میں بھی یہی سبق پوشیدہ ہے۔ ان سب میں اللہ کی حکمت کارفرما ہے۔ پس جو رات اور دن اور حالات کے تغیر و تبدیل پر غور کرے گا وہ اس بات کو پا جائے گا کہ حالات سدا یکساں نہیں رہتے۔ تبدیلی آ کر رہے گی۔ لہٰذا اے نبی ﷺ اگر وحی نہیں اتر رہی، دشمن چڑھ دوڑا ہے، مخالفین کے مقابلے میں دوست احباب اور ساتھیوں کی تعداد کم ہے، تم اپنے آپ کو بے یار و مددگار پاتے ہو، تو یہ اس وجہ سے نہیں ہے کہ تمھاری دعوت سچی نہیں ہے یا اللہ تم سے ناراض ہو گیا ہے اور اس نے تمھیں چھوڑ دیا ہے۔ درحقیقت یہ دعوت کی راہ کے فطری مراحل اور سنگ میل ہیں۔ یہ مراحل تمھاری تربیت اور دعوت کے کام کو آگے بڑھانے کے لیے آتے رہیں گے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ لوگوں کی مخالفت سے بات دبتی نہیں بلکہ اور ابھر کر سامنے آتی ہے۔ مخالفانہ پروپیگنڈہ پیغام کو عام کرنے کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ نبی کریم ﷺ کو یہ بات سمجھائی گئی اور تسلی دی گئی

کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے کہ تم سے کوئی قصور ہو گیا یا غلطی سرزد ہو گئی ہے، جس کی وجہ سے اللہ ناراض ہو گیا ہے۔ اگر تمھارے ذہن میں ایسی کوئی بات ہے تو اس کی کوئی حقیقت نہیں۔ اطمینان رکھو، اللہ تمھارے ساتھ ہے۔ وہ اپنے وعدے پورے کر کے رہے گا، حق بہرحال غالب آ کر رہے گا۔

یہاں لفظ رَبُّکَ استعمال ہوا ہے۔ قرآن مجید میں رَبُّکَ کا لفظ مختلف جگہوں پر مخصوص معنوں میں استعمال ہوتا ہے اور آیت کے سیاق وسباق کی نسبت سے معنی کا تعین ہوتا ہے۔ یہاں رب کے معنی پرورش کرنے والے کے ہیں۔ اگلی آیات میں اس بات کی وضاحت بھی کی گئی ہے کہ اے نبی ﷺ تم یتیم تھے تو اللہ تعالیٰ نے تمھاری پرورش کی۔ تم نادار تھے تو تمھیں غنی کر دیا۔ تم راہ حق کی تلاش میں تھے تو تمھیں سیدھی راہ دکھائی۔ اس طرح اللہ نے تمھاری جسمانی اور روحانی دونوں طرح سے پرورش کی اور تمھیں اس مقام عظیم تک پہنچایا کہ تمھیں اللہ کے پیغام بر ہونے کا اعزاز حاصل ہوا۔ اس لیے وہ تم سے کیوں ناخوش یا ناراض ہو گا اور تمھارا ساتھ کیوں چھوڑ دے گا؟ ایسے رحیم وکریم رب اور آقا سے یہ کیسے توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ تم سے اپنے دین کی سربلندی کا کام لے اور تمھیں تن تنہا چھوڑ دے! یہ پیغام صرف حضور ﷺ کے لیے ہی نہیں ہے بلکہ ہمیشہ کے لیے ان سب لوگوں کے لیے ہے جو دعوتِ دین اور اقامتِ دین کا فریضہ سرانجام دینے کے لیے اٹھیں۔

وَ لَلْاٰخِرَةُ خَیْرٌ لَّکَ مِنَ الْاُوْلٰیؕ۝ (الضحیٰ:۴)

”اور یقیناً تمھارے لیے بعد کا دور پہلے دور سے بہتر ہے۔“

اس آیت میں اللہ تعالیٰ اپنے نبی ﷺ کو تسلی دیتے ہوئے آنے والے دور میں کامیابی کی بشارت دیتا ہے۔ یہاں آخرت اور اولیٰ کے مفہوم کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ آخرت کے معنی بعد میں آنے والی چیز جب کہ اولیٰ کے معنی ہیں پہلی یا شروع میں آنے والی چیز۔ سمجھنے والوں نے اسے دو طرح سے سمجھا ہے۔ بعض نے کہا کہ اولیٰ کے معنی دنیا اور آخرت کے معنی وہ آخرت جو موت کے بعد پیش آنے والی ہے اور آخرت میں جو اجر، درجات اور انعامات ملنے والے ہیں، وہ اس سے بہت بہتر ہیں جو کہ دنیا میں ملنے والے ہیں۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہاں آخرت سے مراد دنیا کی بہتری ہے اور دنیا میں کامیابی کی بشارت دی گئی ہے، یعنی مکہ میں مسلمانوں کو جو ظلم وستم، جبر وتشدد، استہزا، تمسخر اور تحقیر کا

سامنا ہے، بعد میں آنے والا دور اس سے بہت بہتر ہوگا۔ گویا نبی کریم ﷺ کو خوش خبری دی جا رہی ہے کہ اسی دنیا میں تم بہت جلد اپنی آنکھوں سے دیکھ لو گے کہ موجودہ حالات بدل جائیں گے، تمھارا مشن پایۂ تکمیل کو پہنچے گا اور حق غالب آ کر رہے گا۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ اس کی کیا ضرورت ہے کہ ہم اس آیت کا مفہوم دنیا یا آخرت کے لیے محدود کر دیں کہ یا تو یہ دنیا کے لیے ہے اور یا پھر آخرت کے لیے۔ اس مفہوم میں دنیا اور آخرت دونوں شامل ہیں۔ آخرت کے لفظ میں دنیا بھی آتی ہے اور مرنے کے بعد کی زندگی بھی۔

چناں چہ دنیا نے دیکھا کہ کچھ ہی مدت بعد نبی کریم ﷺ کی زندگی ہی میں آپ ﷺ کا پیغام عام ہوا۔ لوگوں کی ایک بڑی تعداد نے اسے قبول کر لیا۔ جہاں سے آپ ﷺ کو نکالا گیا، وہاں آپ ﷺ فاتح کی حیثیت سے داخل ہوئے۔ عرب کی سرزمین جو سمندر کے ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک مختلف ٹکڑیوں میں بٹی ہوئی تھی اور تاریخ میں کبھی یکجا نہ ہوئی تھی، وہ ایک مضبوط ملک بن گئی۔ عرب قوم ایک زندہ قوم بن کر اٹھی۔ لوگوں کے اخلاق و اطوار بدل گئے۔ حضور اکرم ﷺ کی صحبت اور تربیت سے اور اسلامی تعلیمات کی وجہ سے وہ اجڈ اور گنوار نہ رہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کے پیغام اور دعوت کو قبول عام بخشا۔ نبی کریم ﷺ کی شخصیت کی محبوبیت کو لوگوں کے دلوں میں قائم کیا اور اتنی بڑی کامیابی سے نوازا، جس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔

یہ سب باتیں آخرۃ یعنی بعد کے دور کے مفہوم میں شامل ہیں۔ اسی طرح روزِ قیامت آپ ﷺ کو جو درجاتِ عالیہ اور مقام فضیلت حاصل ہے، جن میں مقام محمود اور شفاعت کا اعزاز بھی شامل ہے، وہ بھی اٰخِرَۃ کے دائرے میں آتا ہے۔ یہ وہ وعدہ ہے، جو اللہ نے وَ لَلْاٰخِرَۃُ خَیْرٌ لَّکَ مِنَ الْاُوْلٰی ؕ (اور یقیناً تمھارے لیے بعد کا دور پہلے دور سے بہتر ہے) کی صورت میں اپنے نبی ﷺ سے کیا تھا، جسے نبی کریم ﷺ کے مشن کی تکمیل اور آخرت میں درجاتِ اولیٰ سے نواز کر پورا کیا گیا۔

وَ لَسَوْفَ یُعْطِیْکَ رَبُّکَ فَتَرْضٰی ؕ (الضحیٰ:۵)

”اور عن قریب تمھارا رب تم کو اتنا دے گا کہ تم خوش ہو جاؤ گے۔“

یہاں اس بات کو مبہم رکھا گیا ہے کہ تمھارا رب تمھیں کتنا دے گا اور کیا دے گا؟ یہ فرمایا گیا ہے کہ اللہ آپ ﷺ کو اتنا دے گا کہ آپ ﷺ نہال، خوش اور راضی ہو جائیں گے۔ جو آپ ﷺ

چاہیں گے، جو آپ ﷺ کی تمنائیں اور آرزوئیں ہیں، آپ ﷺ کا رب آپ ﷺ کو وہ سب کا سب عطا کر دے گا۔

یہ اللہ کے وہ وعدے تھے، جن کی بنا پر نبی کریم ﷺ اللہ کے پیغام کو عام کرنے اور دعوت کا کام اس یقین اور ایمان کے ساتھ کر رہے تھے کہ حق کا یہ پیغام عام ہو کر رہے گا اور دنیا اس کے آگے جھک کر رہے گی۔ وقتی طور پر حالات کے اثرات سے پریشان ہو کر نبی کریم ﷺ کچھ مضطرب ہو گئے تھے۔ ان حالات میں ان محبت بھرے الفاظ سے نبی کریم ﷺ کو کتنا اطمینان اور تقویت پہنچی ہو گی اور عزم مصمم کو ایک نئی تازگی ملی ہو گی، اس کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

ذرا غور کیجیے کہ مکہ کی پوری زندگی میں گنتی کے چند آدمی ایمان لائے تھے، جن میں بیشتر غلام تھے۔ ان پر ظلم و ستم روا رکھا جاتا تھا۔ ان کے آقا انھیں مارتے پیٹتے تھے۔ حضرت بلالؓ کو تپتی ریت پر لٹا کر گھسیٹا جاتا تھا۔ حضرت خباب بن ارتؓ کو دہکتے انگاروں پر لٹایا جاتا تھا یہاں تک کہ ان کے جسم کی چربی سے انگارے بجھ جاتے تھے۔ ان حالات میں نبی کریم ﷺ یہ فرمایا کرتے تھے کہ ایک کلمہ تم قبول کر لو، سارا عرب اور عجم تمھارا ہو جائے گا۔ جیسے آج کوئی یہ کہے کہ اگر تم صرف لَآ اِلٰہَ اِلاَّ اللّٰہُ کو قبول کر لو تو پاکستان ہی نہیں بلکہ امریکہ، روس، انگلستان اور چین سب تمھارے زیرِ نگیں ہو جائیں گے۔ یہ تھا وہ یقین اور عزم مصمم، جس کی بنا پر نبی کریم ﷺ دعوت کا کام لے کر چلے تھے۔ یہ صرف اور صرف اللہ کی ذات پر بھروسا اور اپنی دعوت کی صداقت و کامیابی پر یقین کا نتیجہ تھا۔

نبی کریم ﷺ کو اللہ کے وعدے اور اپنی دعوت کی سچائی اور کامیابی کا کتنا یقین تھا، اس کی ایک عمدہ مثال ہجرت مکہ کے سفر کی ہے۔ دو آدمی اونٹنیوں پر سوار جا رہے ہیں۔ مکہ سے اس حال میں نکلے ہیں کہ دشمن خون کا پیاسا ہے اور جان لینے پر تلا ہوا ہے۔ آنکھوں میں دھول جھونک کر جان بچا کر نکلے ہیں۔ نہ مکہ میں کوئی جان نثاروں کا لشکر ہے اور نہ مدینہ میں، یہ بھی نہیں معلوم کہ مدینہ جا کر کیا ہو گا؟ کیسا استقبال ہو گا؟ کیا حالات ہوں گے؟ یہودیوں کا کیا رویہ ہو گا، آیا آپ کا ساتھ بھی دیں گے یا نہیں؟ دوسرے لوگوں کا کیا معاملہ ہو گا؟ کچھ بھی واضح نہیں تھا۔

ان حالات میں آپ ﷺ عازم سفر مدینہ ہوتے ہیں۔ ایسے میں سراقہ آپ ﷺ کو دیکھ لیتا ہے۔ آپ ﷺ کے سر کی قیمت مقرر کی جا چکی تھی۔ وہ انعام کے لالچ میں آپ ﷺ کے

تعاقب میں پہنچ جاتا ہے۔ مگر حضور ﷺ کے نزدیک پہنچ کر اس کا گھوڑا بدک جاتا ہے اور اس کے پاؤں ریت میں دھنس جاتے ہیں۔ وہ سمجھ جاتا ہے کہ آپ ﷺ کوئی عام انسان نہیں ہیں۔ وہ معافی مانگتا ہے اور درخواست کرتا ہے کہ مجھے پروانہ لکھ دیں۔ آپ ﷺ اس کی درخواست پر پروانہ لکھ دیتے ہیں۔ پھر فرماتے ہیں کہ سراقہ میں تمھیں اس دن کی پیشین گوئی کرتا ہوں، جس دن کسریٰ کی کنگن تمھارے ہاتھوں میں ہوں گے۔

ذرا تصور کیجیے کہ جان کے لالے پڑے ہوئے ہوں اور ایسے میں کوئی شخص اپنے وقت کی سوپر پاور کے خاتمے کی بات کرے، اور کہے کہ وہ وقت آنے والا ہے، جب کسریٰ کے خزانے ہمارے ہاتھ میں ہوں گے اور اس وقت بادشاہ وقت کے کنگن تم پہنو گے، اسے نیم پاگل پن کے سوا اور کیا کہا جا سکے گا۔ مگر نبی کریم ﷺ کو اپنے رب کی ذات پر اتنا یقین تھا کہ اس کسمپرسی کے عالم میں بھی آپ ﷺ نے بڑے وثوق سے سراقہ سے کہا کہ وہ وقت ضرور آئے گا جب کسریٰ کے کنگن تمھارے ہاتھوں میں ہوں گے۔ یہ بات وہی کہہ سکتا ہے جس کو اپنے رب کی ذات پر یقین ہو کہ آنے والی حالت، موجودہ حالت سے بہتر ہو گی اور اللہ تعالیٰ اتنا دے گا کہ تم نہال ہو جاؤ گے۔

غزوۂ خندق کے موقعے پر، مدینہ کی چند ہزار کی آبادی کے مقابلے میں پورا عرب اُمڈ آیا تھا۔ ۲۴ ہزار کا لشکر خیمہ زن ہو کر مدینہ کو گھیرے بیٹھا تھا۔ ادھر مدینہ میں یہودی اس انتظار میں تھے کہ معاہدہ توڑیں اور مسلمانوں کی پیٹھ میں خنجر گھونپیں۔ گویا مسلمان اندرونی اور بیرونی، دونوں طرف سے خطرات میں گھرے ہوئے تھے۔ خندق کھودی جا رہی تھی۔ سیرت نگار بیان کرتے ہیں کہ صحابہ کرام ﷺ کدالیں لے کر خندق کی کھدائی میں مصروف تھے۔ چوں کہ زمین پتھریلی تھی اس لیے کھدائی کا کام مشکل تھا۔ آپ ﷺ بھی کھدائی میں شریک تھے۔ آپ ﷺ ایک کدال پتھر پر مارتے تھے تو فرماتے تھے کہ مجھے قیصر کے خزانے دکھائی دے رہے ہیں۔ پھر دوسری کدال مارتے تھے تو کہتے تھے کہ مجھے کسریٰ کے خزانے نظر آ رہے ہیں۔ یہ اپنی دعوت کی کامیابی پر یقین اور پختہ ایمان کا نتیجہ تھا۔ اس درجہ یقین اور ایمان کہ یہ دعوت جب مدینہ سے نکلے گی تو قیصر و کسریٰ سرنگوں ہو جائیں گے، بڑی بڑی سوپر پاور اس کے آگے ہتھیار ڈال دیں گی، چشم زدن میں یہ دعوت اسپین سے لے کر چین تک پہنچ جائے گی، اس کی پیشین گوئی ان دو آیتوں

کے اندر موجود تھی۔ حضور ﷺ اس بات سے بہ خوبی واقف تھے۔ آپ ﷺ کو اور بھی اشارے ملتے تھے، خواب اور کلام الٰہی کی صورت میں۔

یہ آیات حضور ﷺ کے ان خدشات کے جواب میں ہیں، جن کی وجہ سے آپ ﷺ یہ سوچتے تھے کہ میں بے یار و مددگار کیوں ہوں؟ میرے ساتھیوں پر مظالم کیوں ٹوٹ رہے ہیں؟ اللہ کی طرف سے وحی کیوں نہیں آ رہی ہے؟ اللہ کا التفات میری طرف کیوں نہیں ہے؟ ان کے علاوہ دیگر وجوہ بھی ان آیات میں ہے سمودی گئی ہیں۔ ان محبت بھرے کلمات نے ان تمام خدشات اور پریشانیوں کو دور کر دیا اور نبی کریم ﷺ کو اطمینان ہو گیا کہ میرا رب میرے ساتھ ہے۔ وہ ان سب وعدوں کو پورا کرے گا، جو اس نے میرے ساتھ کیے ہیں۔

اس سورہ میں اللہ تعالیٰ نے جہاں نبی کریم ﷺ کو رات اور دن کے تغیر و تبدل کی طرح حالات کے بدلنے، وعدوں کو پورا کرنے اور کلمۂ حق کے آگے دنیا کے سرنگوں ہو جانے کا یقین دلایا ہے، وہاں اپنی زندگی پر بھی غور کرنے کی طرف توجہ دلائی ہے۔ حضورؐ سے فرمایا گیا کہ آپ ﷺ اپنی زندگی پر ایک نگاہ ڈالیں کہ کس طرح اللہ نے آپ سے حسن سلوک فرمایا؟ کس طرح اس نے آپ ﷺ کی پرورش کی؟ مشکلات اور مسائل میں اس نے کس طرح آپ ﷺ کو سہارا دیا ہے؟ چنانچہ اس سورہ کی آخری تین آیات انھی موضوعات کا احاطہ کرتی ہیں۔

قرآن نے انسان کی تعلیم و تربیت اور تزکیہ کے لیے دو معلم، یعنی کائنات اور تاریخ مقرر کیے ہیں۔ کائنات ایک وسیع تصور ہے، جس میں رات، دن، سورج، چاند، تارے، زمین، آسمان، بارش، ہوائیں، ان گنت چیزیں شامل ہیں۔ تاریخ بھی ایک وسیع مضمون ہے، اس کے دو حصے ہیں، ایک حصہ قوموں کی تاریخ پر مشتمل ہے جب کہ دوسرا حصہ ہر شخص کی اپنی تاریخ ہے۔ ہر شخص کی عمر اور زندگی ایک تاریخ ہے، جو اس کی نگاہوں کے سامنے ہے، جسے وہ بہ خوبی جانتا اور پہچانتا ہے۔ میرے اوپر اللہ کے کتنے احسانات ہیں، اس کو مجھ سے زیادہ کون بہتر طور پر جان سکتا ہے۔ اسی طرح ہر آدمی کا معاملہ ہے۔ چناں چہ اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کو دعوت غور و فکر دیتے ہوئے فرمایا:

اَلَمْ یَجِدْکَ یَتِیْمًا فَاٰوٰیO (الضحیٰ:۶)

''کیا اس نے تم کو یتیم نہیں پایا اور پھر ٹھکانا فراہم کیا؟''

یہ بات ایک ایسے ماحول میں کہی جا رہی ہے جہاں آپ بااختیار نہ تھے۔ قرآن مجید

نے متعدد مقامات پر اس بات کی نشان دہی کی ہے کہ تم یتیم کے حقوق کی ادائی میں کوئی لحاظ نہیں کرتے ہو بلکہ یتیم کا مال کھاتے ہو اور پھر اسے جتاتے بھی ہو۔ مال یتیم کو مفت کا مال سمجھا جاتا تھا۔ لوگ اسے بلا تکلف ہضم کر جایا کرتے تھے اور یتیم کو دھکے دینے اور جتلانے میں کوئی عار محسوس نہ کرتے تھے۔ اس طرح قرآن نے اس معاشرے کی اخلاقی ابتری کا نقشہ کھینچا ہے۔

نبی کریم ﷺ اس حال میں دنیا میں تشریف لائے کہ پیدائش سے پہلے باپ کا سایہ سر سے اٹھ چکا تھا۔ ماں بھی چھوٹی عمر میں ہی وفات پا گئیں۔ دادا نے سنبھالا تو پانچ برس کی عمر میں وہ بھی فوت ہو گئے۔ پھر چچا نے پرورش کی ذمے داری لی۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو متوجہ فرمایا کہ ان تمام ادوار میں اللہ کی رحمت کا سایہ اور دست شفقت تمھارے ساتھ رہا اور وہ تمھاری خبر گیری کرتا رہا۔ یہ سب تمھاری نگاہوں میں ہے۔ تم یہ دیکھ چکے ہو کہ تمھارا رب کتنا رحیم اور شفیق ہے کہ جب تم یتیم اور بے یار و مددگار تھے تو اس نے تمھارا ہاتھ پکڑا اور تمھاری پرورش کی اور ایک ایسے معاشرے میں تمھاری نگہبانی کی جہاں یتیم کو پوچھنے والا کوئی نہیں تھا۔ کیا یہ میری شفقت و مہربانی نہ تھی؟

وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى ۝ (الضحیٰ:۷)

”اور تمھیں ناواقف راہ پایا اور پھر ہدایت بخشی۔“

”ضَآلّ“ کے عربی زبان میں مختلف معنی ہیں۔ ایک معنی گمراہ ہونے یا بھٹک جانے کے ہیں، یعنی کوئی شخص گمراہ ہو گیا یا بھٹک گیا۔ اس بات پر سب کا اتفاق ہے کہ جن ہستیوں کو اللہ تعالیٰ اپنی نبوت یا رسالت کے لیے منتخب کرتا ہے، منصب نبوت سے قبل اگرچہ وہ شریعت کی پوری تفصیلات نہ بھی جانتے ہوں مگر وہ کھلے شرک یا کفر میں، گمراہیوں یا بداخلاقیوں میں مبتلا نہیں ہوتے۔ چناں چہ ضَآلًّا کے یہ معنی کہ حضور ﷺ گمراہ تھے، اللہ نے راہ دکھادی (نعوذ باللہ)، یہ اس کے معنی نہیں ہیں۔

ضَآلّ کے ایک معنی یہ بھی ہیں کہ انسان کسی راہ کی تلاش میں ہو کہ کدھر جاؤں اور کیا کروں؟ مثلاً کوئی آدمی تنہا ہو یا اگر ریگستان میں کوئی تنہا درخت ہو تو اس کے لیے بھی ضَآلّ کا لفظ آئے گا۔ ایک چیز دوسری میں مل کر ختم ہو جائے، اس کے لیے بھی یہی لفظ استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً دودھ پانی میں مل جائے یا پانی دودھ میں مل جائے۔

نبی کریم ﷺ کے بارے میں ہم یہ جانتے ہیں کہ آپ ﷺ کو شروع ہی سے یہ فکر تھی کہ حق کیا ہے؟ آپ ﷺ راہِ حق کی تلاش میں تھے۔ آپ ﷺ نے بت پرستی یا کوئی اخلاق سے گری ہوئی حرکت کبھی نہ کی تھی۔ ایک مرتبہ کسی ناچ گانے کی محفل میں دوست لے گئے تو آپ ﷺ کو نیند آگئی اور آپ ﷺ پڑ کر سو گئے، یہاں تک کہ صبح ہوگئی۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کی اخلاقی گمراہیوں سے حفاظت فرمائی۔ غارِ حرا کی تنہائیوں میں، اسی سوچ و بچار اور فکر میں رہتے تھے۔ آپ ﷺ مضطرب اور پریشان تھے کہ کس طرح زندگی بسر کروں کہ میرا رب راضی ہو جائے۔ آپ ﷺ یہ جاننا چاہتے تھے کہ حق کیا ہے اور راہِ ہدایت کون سی ہے۔ اسی لیے قرآن کریم نے یہ بیان فرمایا کہ آپ ﷺ یہ نہیں جانتے تھے کہ کتاب کیا ہے اور ایمان کیا ہے؟ کتاب کے معنی پوری زندگی بھی اور احکام (ہدایت) بھی ہیں۔ نبی کریم ﷺ کو اسلام سے قبل یہ معلوم نہیں تھا کہ نماز، روزہ، زکوٰۃ اور اخلاقی امور کے حوالے سے اللہ تعالیٰ کے کیا احکامات ہیں اور ایمان سے کیا مراد ہے؟ کن چیزوں پر ایمان لانا چاہیے اور کیسے ایمان لانا چاہیے؟ ان تمام امور میں اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کی رہ نمائی فرمائی اور سیدھا راستہ کھول کر آپ ﷺ کو دکھا دیا۔ یہ اللہ تعالیٰ کا آپ ﷺ پر احسان عظیم تھا۔

وَوَجَدَكَ عَآئِلًا فَأَغْنٰىؕ (الضحیٰ:۸)

''اور تمھیں نادار پایا اور پھر مال دار کر دیا۔''

عَآئِلاً کے معنی ہیں وہ شخص، جس کے پاس کوئی سرمایہ نہ ہو، نادار اور کم مایہ ہو، نیز عیال دار بھی ہو اور غریب بھی۔ عَآئِلاً کے ایک معنی یہ بھی ہیں کہ جو روحانی اور اخلاقی طور پر پیاسا ہو اور حق و صداقت کی تلاش میں ہو۔

مفسرین نے اس آیت کے دونوں مفہوم لیے ہیں۔ ایک اس معنی میں کہ آپ ﷺ یتیم اور نادار تھے۔ جب آپ ﷺ نے تجارت شروع کی تو مال دار ہوگئے۔ پھر آپ ﷺ کی شادی ایک ایسی خاتون سے ہوگئی، جو عرب کی امیر ترین خواتین میں سے تھی۔ ان کی تجارت کے فروغ میں نبی کریم ﷺ کا نمایاں حصہ تھا۔ یہی وہ بات ہے، جس کی طرف اللہ تعالیٰ نے اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ تم نادار اور غریب تھے، ہم نے تمھیں مال دار اور غنی کر دیا۔

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ اصل دولت پیسہ یا مال نہیں ہے بلکہ اصل دولت تو دل کی

قناعت اور بے نیازی ہے۔ ایک آدمی کے پاس اگر ۱۰ لاکھ روپے ہوں اور دل میں یہ آرزو ہو کہ کاش یہ ۲۰ لاکھ ہو جائیں تو وہ غنی نہیں ہے، وہ تو پیسے کا پجاری اور پیسے کا پیاسا اور اپنے آپ کو غریب سمجھتا ہے اور حرص میں مبتلا ہے۔ درحقیقت اللہ کو تو دل کی بے نیازی مطلوب ہے۔ یہاں بھی اللہ تعالیٰ نے اسی طرف اشارہ کیا ہے کہ اے نبی ﷺ ہم نے تمھارے دل کو بے نیاز کر دیا ہے۔

ایک مفسر کے الفاظ میں آپ ﷺ کی نظر میں سونا اور پتھر برابر ہو گئے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ پتھر ہو یا سونا، چٹائی کا بستر ہو یا نرم بستر جیسا کہ حضرت عائشہؓ نے بچھایا تھا، کھانے کے لیے گیہوں یا اچھا کھانا ہو یا دو دن کا فاقہ، آپ ﷺ کو اس سے کوئی فرق نہ پڑتا تھا۔ آپ ﷺ اپنے رب کی رضا پر راضی رہتے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کے دل کو ان چیزوں سے غنی اور بے نیاز کر دیا تھا۔

اس آیت کا تیسرا مفہوم یہ ہے کہ آپ ﷺ کو حق کی تلاش تھی۔ آپ ﷺ اس کے لیے فکرمند رہتے تھے اور سوچ و بچار کرتے رہتے تھے۔ اس حوالے سے بھی اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو اپنے فضل سے نوازا اور آپ ﷺ کو ہدایت، سچائی اور حق کی راہ دکھائی اور آپ ﷺ کو مالا مال کر دیا۔ یہ آیت اس مفہوم کی بھی عکاسی کرتی ہے۔

اللہ نے جو تین وعدے کیے ہیں ان کی مناسبت سے اب مزید تین چیزوں کا ذکر کیا جا رہا ہے، جو پہلے تین وعدوں کے ساتھ مناسبت رکھتی ہیں۔

فَاَمَّا الْيَتِيْمَ فَلَا تَقْهَرْ ؕ (الضحیٰ:۹)

''لہٰذا یتیم پر سختی نہ کرو۔''

یعنی اللہ نے تمھیں یتیم پایا تو ٹھکانا دیا، لہٰذا تم بھی کسی یتیم کو مت ستاؤ۔ قَھَّار کے ایک معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر غالب ہے۔ ہر چیز اس کی مطیع و فرماں بردار ہے۔ قھر کے معنی دبانے، حق مارنے، ظلم کرنے اور جھڑکنے کے بھی ہوتے ہیں۔ اس معاشرے میں یتیم کے ساتھ یہ برتاؤ عام تھا۔ اس لیے کہا کہ یتیم کے ساتھ ایسا برتاؤ نہ کرو۔

یتیم کسی بھی معاشرے کا ایک کمزور طبقہ ہوتا ہے لیکن یہاں ایک بنیادی بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ وہ یہ کہ معاشرے کے اندر، جو لوگ کمزور ہوں، جن کے پاس اپنے حقوق حاصل کرنے کی قوت نہ ہو، ان کے حقوق کو غصب نہ کیا جائے بلکہ ان کو سہارا دیا جائے اور ان

کے غصب شدہ حقوق دلوائے جائیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے ہاں سیاست، معیشت اور دیگر حوالوں سے یتیم کی اصطلاح ایک علامت کے طور پر استعمال ہونے لگی۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ خلیفہ مقرر ہوئے۔ لوگوں نے کہا کہ بیت المال سے ان کی تنخواہ مقرر کی جائے۔ سوال پیدا ہوا کہ بیت المال تو مال یتیم کی طرح ہے۔ قرآن نے اس بارے میں فرمایا ہے کہ جو غنی ہو اور ضرورت مند نہ ہو وہ نہ لے اور جو ضرورت مند ہو وہ اتنی تنخواہ لے، جتنی ضروریات زندگی کے لیے ناگزیر ہو۔ خلفائے راشدین کا بیت المال کے حوالے سے یہی رویہ رہا کہ جن کو ضرورت نہیں تھی وہ نہیں لیتے تھے اور جن کو ضرورت ہوتی تھی وہ حسب ضرورت لے لیا کرتے تھے۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ نے خلافت کے منصب پر فائز ہونے کے بعد، جو پہلی تقریر کی تھی اس میں بھی یہی کہا تھا کہ تم میں سے جو کمزور ہے اور اگر کوئی اس کا حق مارے گا، تو وہ میرے نزدیک قوی ترین آدمی ہے۔ پوری ریاست کی قوت اس کی پشت پر ہوگی یہاں تک کہ میں اس کا حق دلوادوں۔ ظالم خواہ کتنا ہی طاقت ور کیوں نہ ہو، پوری ریاست کی قوت اس کی گردن پر ہوگی، کمزور کا حق دلوانے کے لیے۔

اسلامی تہذیب وتمدن اور معاشرت وسیاست میں یتیم، یعنی کمزور طبقے کی حمایت کا یہی تصور پایا جاتا ہے۔ عورتوں کے حقوق کی ادائی کے لیے بھی نبی کریم ﷺ نے بہت تاکید فرمائی ہے، اس لیے کہ وہ مردوں کے قابو میں ہوتی ہیں۔ اسی طرح غلاموں سے حسن سلوک اور ان کے حقوق پر اتنا زور دیا گیا کہ ہمارے ہاں غلام بادشاہ وقت بن گئے۔ برعظیم ہندوپاک میں خاندان غلاماں نے حکمرانی کی ہے۔ یہ انقلابی تبدیلی دراصل اسی ایک ہدایت: فَاَمَّا الْیَتِیْمَ فَلَا تَقْهَرْ ؕ ''یتیم پر سختی نہ کرو'' کا نتیجہ ہے۔

وَ اَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْهَرْ ؕ (الضحیٰ:۱۰)

''اور سائل کو نہ جھڑکو۔''

سائل کے دو معنی ہیں، ایک مانگنے والا اور دوسرا پوچھنے والا۔ یہاں دونوں معنی مراد ہیں۔ اگر کوئی مانگنے والا ہو تو اس کو بھی نہ جھڑکو اور اگر کوئی دین سے متعلق کوئی سوال پوچھنے آئے تو اس کو بھی اچھے کے ساتھ جواب دو اور اس کو بھی نہ جھڑکو۔ حضور ﷺ نے زندگی بھر ان دونوں پہلوؤں

کو اپنے پیش نظر رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ کبھی کوئی سائل آپ ﷺ کے ہاں سے خالی ہاتھ نہیں گیا۔ آپ ﷺ نے کسی کو انکار نہیں کیا یا 'نہیں' کا لفظ نہیں کہا۔ کوئی بھی سائل آپ ﷺ کے در پر آیا تو آپ ﷺ نے کچھ نہ کچھ دے کر ہی بھیجا، خالی ہاتھ نہ لوٹایا۔ یہی آپ ﷺ کا وہ وصف ہے، جس کی بنا پر شعرا نے آپ ﷺ کے شان میں قصیدے کہے اور نعتیں لکھیں۔ حضرت عباسؓ کے الفاظ میں:

''آپ ﷺ سے زیادہ کوئی سخی نہ تھا۔''

آپ ﷺ دین کے معاملے میں رہ نمائی کے لیے آنے والوں کے ساتھ بھی نہایت صبر و تحمل سے پیش آتے تھے۔ دین کے حوالے سے لوگوں کو رہ نمائی دینا ایک صبر آزما کام ہے۔ لوگ جہالت سے پیش آتے ہیں، غیر مناسب انداز میں گفتگو کرتے ہیں، اور اس رویے پر آدمی کو غصہ بھی آتا ہے، بسا اوقات دل یہ چاہتا ہے کہ ڈانٹ کر واپس بھیج دیا جائے کہ انھیں بنیادی اخلاقیات تک کا علم نہیں ہے کہ بات کیسے کی جاتی ہے۔ لیکن نبی کریم ﷺ کے پاس، جو لوگ بھی اپنے دکھ درد، مسائل اور پریشانیاں لے کر آتے، آپ ﷺ ان کی بات نہایت تحمل سے سنتے اور نہایت نرمی وشفقت سے پیش آتے۔ کسی کو نہ ڈانٹتے تھے حتیٰ کہ ناروا رویے پر بھی صبر و تحمل اور غیر معمولی ضبط کا مظاہرہ کرتے تھے۔ لوگوں کی غلط روش کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے سورۂ حجرات کے ذریعے نبی کریم ﷺ سے گفتگو کرنے اور آپ ﷺ کی مجلس میں شرکت کے آداب سکھائے۔ آپ ﷺ وَ اَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْهَرْ ۝ؕ کی عملی تفسیر تھے۔

داعیانِ دین کے لیے نبی کریم ﷺ کا یہ عمل بہترین نمونہ ہے۔ انھیں دین کی اشاعت اور اقامتِ دین کی ذمے داری کو ادا کرتے ہوئے صبر و تحمل اور نرمی و شفقت کے اس رویے کی تقلید کرنا ہوگی۔

وَ اَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّکَ فَحَدِّثْ ۝ؕ (الضحیٰ:۱۱)

''اور اپنے رب کی نعمت کا اظہار کرو۔''

سورۂ ضحیٰ کے آخر میں نبی کریم ﷺ کو تیسری اور آخری ہدایت اس حوالے سے دی گئی ہے کہ تمھارے رب نے جن نعمتوں سے تمھیں نوازا ہے، ان کا اظہار اور بیان کیا کرو۔ یہاں لفظ اَخْبَرَ استعمال نہیں کیا گیا ہے کہ اس کی خبر دے دو بلکہ فَحَدِّثْ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ فَحَدِّثْ کے معنی کسی کام کو بار بار کرنا، کرتے رہنا اور کرنے میں لگے رہنا، کے ہیں۔

نعمت کا مفہوم بھی بڑا وسیع ہے۔ نعمت کا ایک مفہوم یہ ہے کہ روزمرہ زندگی کے لیے، جو کچھ اللہ نے عطا کیا ہے، وہ سب نعمتیں ہیں، مثلاً زندگی ایک نعمت ہے، سانس کا چلنا، دل کا دھڑکنا، ہاتھ پاؤں کا حرکت کرنا، پیٹ بھرنے کے لیے انواع واقسام کے کھانے اور اشیا اور مال و دولت وغیرہ سب مختلف نعمتیں ہیں۔ لہٰذا اظہار نعمت کا ایک مفہوم تو یہ ہے کہ انسان کا دل ان نعمتوں کو محسوس کرے اور ان پر شکر گزار ہو۔ زبان سے بھی ذکر اور شکر کرے، مثلاً کھانا کھائے تو کہے اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ، کپڑا پہنے تو کہے اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ، سواری پر سوار ہو تو کہے اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ! گویا جہاں بھی اور جب بھی اللہ کی کسی نعمت سے مستفید ہو تو اظہارِ تشکر کرے۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ کا لفظ اس مفہوم کی مکمل عکاسی کرتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ عملی طور پر بھی شکر گزار ہو۔ وہ اس طرح کہ اپنا عمل اللہ کے احکامات کے مطابق کرے اور اس کا حق ادا کرے۔ اس طرح سے عملی طور پر شکر گزار بندہ بنے۔

مفسرین قرآن کا اس بات پر تقریباً اجماع ہے کہ یہاں نعمت کا لفظ ہدایت کی نعمت کے مفہوم میں آیا ہے۔ گویا تمھارے رب نے جو سب سے بڑی نعمت تمھیں دی ہے وہ یہ نہیں ہے کہ تم یتیم تھے، اس نے تمھاری پرورش کردی، بے سہارا تھے، سہارا دے دیا، نادار تھے، غنی کردیا بلکہ سب سے بڑی نعمت یہ ہے کہ اس نے تمھیں ہدایت سے تہی دامن پایا اور تمھیں ہدایت بخشی۔ اس نے تمھیں روحانی اور اخلاقی علوم اور مادی دولت کے ساتھ ساتھ احکام خداوندی اور قرآن عظیم جیسی نعمت عظمیٰ سے مالا مال کر کے ہدایت دی۔ اب اس نعمت کو دوسرے متلاشیانِ حق تک پہنچانا تمھاری ذمے داری ہے۔ یہاں 'بیان کرنا' سے مراد ہدایت کو لوگوں تک پہنچانا ہے۔

یہ تین ہدایات گزشتہ تین نعمتوں کے مقابلے میں دی گئی ہیں۔ فرمایا گیا کہ ہم نے تمھیں یتیم پایا تو تمھیں ٹھکانا دیا۔ پس تم بھی کسی یتیم، کمزور اور نادار آدمی کا حق نہ دباؤ، اس کے ساتھ سختی سے پیش نہ آؤ اور اسے مت جھڑکو۔ پھر فرمایا کہ ہم نے تم کو راہِ حق کی تلاش میں پایا اور ہم نے تم کو وہ راہ دکھادی۔ لہٰذا اگر تمھارے پاس بھی کوئی شخص راہ حق کی تلاش میں آجائے تو تم بھی اس کو مت جھڑکو بلکہ اس کے سوال کا جواب صبر وتحمل اور محبت و شفقت کے ساتھ دو اور اس کی رہنمائی کرو۔ آخر میں فرمایا کہ ہم نے تمھیں اپنی ہدایت کی نعمت سے نوازا اور مالا مال کردیا، سو تم بھی اپنے رب کی اس نعمت پر شکر ادا کرو اور اسے دوسروں تک پہنچاؤ۔

میں نے آغاز درس میں یہ سوال اٹھایا تھا کہ اس پوری سورہ میں بندے اور رب کے درمیان گفتگو ہورہی ہے لیکن اس میں ہمارے لیے کیا رہ نمائی ہے؟ اس سلسلے میں عرض ہے کہ اس سورہ میں اللہ تعالیٰ اپنے اس بندے سے کلام کررہا ہے، جو ہمیں ماں، باپ، اولاد اور جان و مال سے بڑھ کر محبوب اور عزیز ہے۔ اللہ کی اپنے رسول ﷺ کے ساتھ یہ محبت بھری گفتگو خود ہمارے لیے بڑی روحانی تسکین اور دل کی زندگی کا سامان ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی پیش نظر رہنی چاہیے کہ جو ذمے داری اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کے سپرد کی تھی، وہ مشن، دعوت حق اور ہدایت پہنچانے کی ذمے داری، رہتی دنیا تک اب امت مسلمہ کی ذمے داری ہے۔

اللہ نے امت مسلمہ کے لیے بھی سربلندی و سرفرازی کے اسی طرح وعدے فرمائے ہیں، جیسا کہ نبی کریم ﷺ سے وعدے کیے تھے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَلاَ تَهِنُوْا وَلاَ تَحزَنُوْا وَ اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ○

(آل عمران:۱۳۹)

"دل شکستہ نہ ہو، غم نہ کرو، تم ہی غالب رہو گے، اگر تم مومن ہو۔"

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنكُمْ وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ص (النور:۵۵)

"اللہ نے وعدہ فرمایا ہے تم میں سے ان لوگوں کے ساتھ جو ایمان لائیں اور نیک عمل کریں کہ وہ ان کو اسی طرح زمین میں خلیفہ بنائے گا، جس طرح ان سے پہلے گزرے ہوئے لوگوں کو بنا چکا ہے۔"

گویا اگر تم دنیا میں ایمان اور عمل صالح کا راستہ اختیار کرو گے تو زمین کی خلافت ہم ضرور تمھیں دیں گے۔ یہ تمام وعدے اللہ نے ہمارے ساتھ بھی کیے ہیں۔ لیکن یہ تب ہی ممکن ہے کہ تم کمزوروں کا حق نہ دباؤ، ان کے ساتھ اچھا سلوک کرو، مانگنے والوں کو خالی ہاتھ نہ لوٹاؤ اور خاص طور پر، جو لوگ حق کے متلاشی ہیں، اللہ نے جو نعمت اپنی کتاب کی صورت میں تمھیں دی ہے، اس کو بیان کرو، اسے آگے پہنچاؤ اور اس کی تبلیغ کرو۔ اپنی زبان اور عمل سے اور ہر طرح سے اس کی تحدیث نعمت کرو۔

یہ مختصر سورہ، جو چند آیات پر مشتمل ہے، اس کے چھوٹے چھوٹے دل موہ لینے والے بول ہیں، صرف ۴۰ الفاظ پر مشتمل ہے۔ اس کی جامعیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس

ایک چھوٹی سی سورہ میں کتنے اہم مضامین جمع کر دیے گئے ہیں۔ ہمارے لیے مقصدِ زندگی، لائحۂ عمل، نبی کریم ﷺ سے تعلق، ان کے مشن کی نوعیت اور امت مسلمہ کی ذمے داری جیسے اہم مضامین، سب اس میں یکجا کر دیے گئے ہیں۔ مقام افسوس ہے کہ یہ سورہ اکثر نماز میں پڑھی جاتی ہے مگر ہم نہیں جانتے کہ اس میں ہمارے لیے کیا پیغام اور ہدایت ہے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں قرآن کو سمجھنے اور اس پر عمل کی توفیق دے۔ (آمین)

༺༻

سورۃ الم نشرح

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ○

اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ ﴿۱﴾ وَوَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ ﴿۲﴾ الَّذِيْٓ اَنْقَضَ ظَهْرَكَ ﴿۳﴾ وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ ﴿۴﴾ فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ﴿۵﴾ اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ﴿۶﴾ فَاِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ ﴿۷﴾ وَاِلٰى رَبِّكَ فَارْغَبْ ﴿۸﴾ ع

۱ ع ۸ ۱۹

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔

(اے نبی ﷺ) کیا ہم نے تمھارا سینہ تمھارے لیے کھول نہیں دیا؟ اور تم پر سے وہ بھاری بوجھ اتار دیا، جو تمھاری کمر توڑے ڈال رہا تھا اور تمھاری خاطر تمھارے ذکر کا آوازہ بلند کر دیا۔ پس حقیقت یہ ہے کہ تنگی کے ساتھ فراخی بھی ہے۔ بے شک تنگی کے ساتھ فراخی بھی ہے۔ لہٰذا جب تم فارغ ہو تو عبادت کی مشقت میں لگ جاؤ اور اپنے رب ہی کی طرف راغب ہو۔

تشریح: سورۂ الم نشرح کی آٹھ آیات ہیں۔ ترتیب میں یہ سورۂ ضحیٰ کے بعد آتی ہے۔ اپنے مضمون کے لحاظ سے یہ سورہ، سورۂ ضحیٰ کے اتنی قریب ہے اور دونوں کے مضمون میں اتنی مماثلت

ہے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا ایک ہی سورہ ہے۔ چناں چہ بعض تابعین سے، جن میں حضرت عمر بن عبدالعزیز علیہ الرحمہ اور حضرت قابوسؒ شامل ہیں، مروی ہے کہ یہ لوگ ان دونوں سورتوں کو ایک ہی رکعت میں درمیان میں بسم اللہ کے بغیر پڑھا کرتے تھے، گویا وہ اسے ایک ہی سورہ سمجھتے تھے۔ بہت سے علما کے نزدیک ان دو سورتوں کے درمیان بسم اللہ پڑھنا ضروری نہیں ہے۔ اس لیے کہ بسم اللہ قرآن مجید کی ہر سورہ کا حصہ نہیں ہے۔ چوں کہ مضامین میں مناسبت ہے، خصوصاً سورۂ ضحیٰ میں جہاں کلام یوں ہوتا ہے: اَلَمۡ یَجِدۡکَ یَتِیۡمًا فَاٰوٰی ص (الضحی:٦) ''کیا اس نے تم کو یتیم نہیں پایا اور پھر ٹھکانا فراہم کیا؟'' اسی سے ملتا جلتا یہ جملہ ہے: اَلَمۡ نَشۡرَحۡ لَکَ صَدۡرَکَ ۝ (الم نشرح:١) ''(اے نبی ﷺ) کیا ہم نے تمھارا سینہ تمھارے لیے نہیں کھول دیا؟'' تاہم دونوں سورتیں ایک سورہ نہیں ہیں۔ اگر سورہ کے کلام پر بھی غور کیا جائے تو یہ بات بہ آسانی کھل کر سامنے آجاتی ہے۔

امام رازیؒ فرماتے ہیں: ''سورۂ ضحیٰ کا مضمون یہ ظاہر کرتا ہے کہ یہ سورہ اس زمانے میں نازل ہوئی ہے، جب نبی کریم ﷺ کو تکلیف اور ایذا پہنچائی جارہی تھی۔ آپ ﷺ کی بات نہیں مانی جارہی تھی۔ آپ ﷺ کا دل اس سے تنگ ہوتا تھا۔ آپ ﷺ مغموم اور رنجیدہ ہوجایا کرتے تھے۔ آپ ﷺ کو یہ گمان بھی ہوتا تھا کہ کہیں میرا رب مجھ سے ناراض تو نہیں ہے؟ کہیں اس نے مجھے چھوڑ تو نہیں دیا؟ ان حالات میں آپ ﷺ کی تسلی و تشفی اور حوصلہ و ہمت کے لیے سورۂ ضحیٰ میں محبت و شفقت کا پیغام نازل ہوا، جب کہ سورۂ الم نشرح کا مضمون یہ بتاتا ہے کہ یہ اس دور کی سورہ ہے، جب ایذا، تنگی اور مشکلات کی یہ کیفیت کچھ آسانی میں بدل گئی تھی۔ آپ ﷺ کی دعوت اور پیغام، جو اس وقت تک مکہ کے چند لوگوں تک محدود تھا، اب پھیل چکا تھا۔ اس سورہ میں اس طرف ان الفاظ میں اشارہ کیا گیا ہے: وَرَفَعۡنَا لَکَ ذِکۡرَکَ ۝ط (الم نشرح:٤) ''اور تمھاری خاطر تمھارے ذکر کا آوازہ بلند کردیا۔'' آپؐ کے اوپر دعوت پہنچانے کا جو بار اور بوجھ تھا، یہ سب بھی نسبتاً ہلکا ہو چکا تھا۔ چناں چہ یہ دور سورۂ ضحیٰ کے ایذا اور تکلیف کے دور کے مقابلے میں نسبتاً آسانی کا دور تھا۔''

دوسرا فرق سورۂ ضحیٰ اور سورۂ الم نشرح کے مضامین میں یہ ہے کہ سورۂ ضحیٰ میں اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب ﷺ بندے پر اپنے ان انعامات و احسانات کا ذکر فرمایا ہے، جو آپ ﷺ پر نبی بنائے جانے سے قبل ہوئے تھے یا منصب نبوت عطا کرنے کے ساتھ ہوئے تھے، یا نبوت کے

ابتدائی دور میں ہوئے تھے، مثلاً کیا اس نے آپ ﷺ کو یتیم نہیں پایا اور پھر ٹھکانا فراہم کیا؟ یا کیا آپ ﷺ کو راہ تلاش کرتے پایا اور پھر آپ ﷺ کو راہ دکھادی؟ اور کیا ہم نے آپ ﷺ کو نادار نہیں پایا اور پھر آپ ﷺ کو غنی کر دیا؟ یہ مضامین مکہ کی نبوت کی زندگی سے قبل اور پھر اس کے بعد کے زمانے کے ہیں، جب کہ سورۂ الم نشرح میں ان احسانات کا ذکر ہے، جن کا تعلق نبوت اور بعد کے دور سے ہے۔

سورۂ ضحیٰ میں اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو خوش خبری سنائی تھی: وَلَسَوْفَ يُعْطِيكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى ؁ (الضحیٰ: ۵) ''اور عنقریب تمھارا رب تم کو اتنا دے گا کہ تم خوش ہو جاؤ گے۔'' یعنی اللہ تعالیٰ آپ ﷺ کو زندگی میں اور زندگی کے بعد بہت کچھ دے گا اور آج تک دیتا چلا جا رہا ہے۔ جس بشارت کی فوری تکمیل ہوئی، وہ لوگوں کی نظروں کے سامنے بھی آگئی، اس کی طرف اس سورہ میں اشارہ کیا گیا ہے۔ بعد کے آنے والے دور کے متعلق بھی تسلی واطمینان کا اشارہ اس میں موجود ہے۔

تیسرا فرق، جو دونوں سورتوں کے مضامین میں بہت صاف محسوس ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ سورۂ ضحیٰ میں ان احسانات کا تذکرہ ہے، جو مادی اور جسمانی ہیں، اور اگر روحانی احسانات ہیں تو وہ ایسے ہیں، جو ایک عام آدمی دیکھ سکتا تھا اور محسوس کر سکتا تھا۔ ہر شخص کی نگاہوں کے سامنے تھا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو نبوت دی، راہ دکھائی، غنی کر دیا، آپ ﷺ یتیم تھے آپ ﷺ کی پرورش کا انتظام کیا۔ یہ آپ ﷺ کی زندگی کے وہ اوراق تھے، جو سب کی نگاہوں کے سامنے تھے، جب کہ سورۂ الم نشرح میں ان احسانات کا ذکر کیا ہے، جن کا تجربہ صرف نبی کریم ﷺ کو ہی ہو سکتا تھا، مثلاً سینے کا کھلنا، کمر سے بوجھ کا ہٹنا اور دعوت کا پھیلنا۔ یہ وہ چیزیں تھیں، جو صرف حضور ﷺ کے ذاتی تجربے میں تھیں۔ ان میں ہر آدمی شریک نہیں تھا۔

اس لحاظ سے یہ سورہ مضمون اور طرزِ کلام کے لحاظ سے سورۂ ضحیٰ ہی کا ایک حصہ محسوس ہوتی ہے۔ ایک ہی قسم کا کلام ہے، ایک ہی قسم کا خطاب ہے، ایک ہی طرح کی محبت کی خوشبو اور ہوا ہے، جو محبوب کی طرف سے نبی کریم ﷺ کی طرف چل رہی ہے۔ ایک ہی طرح آپ ﷺ کے کمال، مرتبے اور اسوہ حسنہ کی بلندی کا ذکر ہے اور آپ ﷺ پر، آپ ﷺ کی نبوت، دعوت اور اس مشن کے حوالے سے جو اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کے سپرد فرمایا تھا، کا تذکرہ ہے۔ البتہ ایک بنیادی فرق بھی ہے۔

اس سورہ پر اگر غور کیا جائے تو اس میں اگرچہ اللہ تعالیٰ حضور ﷺ کی ذات سے ہی مخاطب نظر آتے ہیں مگر یہاں اللہ تعالیٰ کے مخاطب محمد بن عبداللہ نہیں بلکہ محمد رسول اللہ ﷺ ہیں، اس لیے کہ محمد بن عبداللہ پر اپنے احسانات کا ذکر اللہ تعالیٰ سورۂ ضحیٰ میں فرما چکے ہیں۔ اس سورہ میں بحیثیت رسول اللہ ﷺ، پیغامِ الٰہی کو پہنچانے کا جو بار اور بوجھ آپ ﷺ کے کاندھوں پر تھا، اس کے لیے اللہ نے آپ ﷺ کے سینے میں جو وسعت اور کشادگی پیدا کی کہ آپ ﷺ اس پیغام کو بخوبی حاصل کر سکیں، اس کے علوم اور معارف کا ادراک کر سکیں اور پھر اس دعوت کو بہ آسانی لوگوں تک پہنچا سکیں، کا تذکرہ کیا جا رہا ہے۔

یہ سورہ اس لحاظ سے نہایت اہمیت کی حامل ہے کہ اس میں اللہ تعالیٰ نے دعوتِ حق، نبی کریم ﷺ کا مشن، اس کی کامیابی کا یقینی ہونا، کامیابی کا راستہ، اس راہ کی منزلیں اور بشارتیں اور پھر اس راہ پر چلنے کے لیے جو زادِ راہ درکار ہے اور جس قسم کا رب سے تعلق ضروری ہے، اس سب کا ذکر ان آٹھ آیات میں کر دیا ہے۔

اَلَمْ نَشْرَحْ لَکَ صَدْرَکَ ۝ (الم نشرح:۱)

''(اے نبی ﷺ) کیا ہم نے تمھارا سینہ تمھارے لیے کھول نہیں دیا؟''

شرح یا کھولنے کا لفظ اردو میں بھی مستعمل ہے، جس کے معنی کسی چیز کی شرح یا تشریح کرنے کے ہوتے ہیں۔ شرح کے لغوی معنی ہیں کھول دینا، وسعت پیدا کرنا یا توضیح کرنا۔ جب کسی کتاب کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس کی تشریح ہوگئی تو اس کے معنی ہوتے ہیں کہ اس میں جو مضامین یا پہلو مخفی تھے، وہ کھل کر سامنے آ گئے، جو چیزیں مبہم تھیں وہ واضح ہوگئیں اور بات پوری طرح سمجھ میں آ گئی۔ یہاں شرح کے معنی کسی کتاب کی تشریح کے نہیں بلکہ سینہ کھول دینے کے ہیں۔ سینے میں انسان کا دل ہوتا ہے اور دل وہ مقام ہے، جو کسی بھی انسان کی شخصیت کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ انسان کی شخصیت کے تمام محرکات کا تعلق دل سے ہوتا ہے۔ قرآن مجید نے متعدد مقامات پر اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے:

وَلَا تُخْزِنِیْ یَوْمَ یُبْعَثُوْنَ ۝ یَوْمَ لَا یَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوْنَ ۝ اِلَّا مَنْ اَتَی اللّٰہَ بِقَلْبٍ سَلِیْمٍ ۝ (الشعرآء:۸۷-۸۹)

''اور مجھے اس دن رسوا نہ کر، جب کہ سب لوگ زندہ کر کے اٹھائے جائیں گے۔ جب

کہ نہ مال کوئی فائدہ دے گا نہ اولاد، بجز اس کے کہ کوئی شخص قلب سلیم لیے ہوئے اللہ کے حضور حاضر ہو۔"

ایک حدیث میں آتا ہے کہ اگر دل سدھر جائے تو ساری زندگی سدھر جاتی ہے، اور اگر دل بگڑ جائے تو ساری زندگی بگڑ جاتی ہے۔ گویا پوری شخصیت کا دارومدار دل پر ہے۔ یہاں اس بات کی طرف اشارہ کیا جا رہا ہے کہ شرح صدر کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کی شخصیت کو ابھارا، کھولا اور پایۂ تکمیل تک پہنچایا اور آپ ﷺ کو نبی بنایا۔ اس لحاظ سے حضور ﷺ کے لیے، جو مرتبۂ کمال تھا، وہ نبوت کا مرتبہ تھا۔

انسان کے لیے نبوت کے مرتبے اور کمال کو سمجھنا دشوار ہے۔ چوں کہ عام انسان ان کیفیات اور مراحل سے نہیں گزرتا، جن سے نبی گزرتا ہے، اس لیے اس مقام کا ادراک انسان کے لیے مشکل ہے۔ کوئی بھی انسان اپنے زور بازو یا کسب سے اس منصب تک نہیں پہنچ سکتا۔ انسان اپنی محنت، کوشش اور صلاحیت سے بڑے سے بڑا مقام حاصل کر سکتا ہے، مثلاً نامور سائنس داں، صحافی، مفکر یا جرنیل بن سکتا ہے مگر نبی نہیں بن سکتا۔ نبوت یا رسالت کا منصب آدمی کو اپنی کوشش یا محنت سے نہیں حاصل ہو سکتا۔ یہ صرف اللہ کی دین ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ ؕ (الانعام: ۱۲۴)

"اللہ زیادہ بہتر جانتا ہے کہ اپنی پیغام بری کا کام کس سے لے اور کس طرح لے۔"

اس لحاظ سے یہ ایسا منصب ہے، جو کسی بھی انسان کے بس سے باہر ہے۔ یہی منصب رسالت، حضور ﷺ کا اصل مقام و مرتبہ تھا۔ اس مرتبے کو حد کمال تک پہنچانے کے لیے آپ ﷺ کی شخصیت کی تعمیر کرنا، اللہ تعالیٰ کو مقصود تھا۔ اس آیت میں اسی بات کی طرف اشارہ کیا جا رہا ہے کہ اے نبی ﷺ! کیا ہم نے آپ ﷺ کے سینے کو آپ ﷺ کے لیے کھول نہیں دیا؟

شرح کا لفظ یہاں کئی معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ پہلی بات، جس کا ذکر سورۂ ضحیٰ میں آ چکا ہے وہ یہ کہ آپ ﷺ راہ حق کے متلاشی تھے، آپ ﷺ نہیں جانتے تھے کہ ایمان، ہدایت، صراطِ مستقیم اور شریعت کیا ہے؟ "کتاب" کا کیا مفہوم ہے؟ اللہ کی رضا اور منشا کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے یہ ساری چیزیں آپ ﷺ کو عطا کیں اور محض عطا ہی نہیں کیں بلکہ ان کے لیے آپ ﷺ کے دل میں وسعت بھی پیدا کی۔ وحی کا نزول حضور ﷺ کے قلب پر ہوتا تھا، جو ایک مشکل امر تھا۔

قرآن مجید نے خود اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے:

نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ ۝ عَلٰى قَلْبِكَ (الشعرآء: ۱۹۳، ۱۹۴)

"روح الامین کتاب کو لے کر آپؐ کے قلب پر نازل ہوئے۔"

اس طرح سے اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کے قلب میں اتنی وسعت اور کشادگی پیدا کی کہ وہ وحی الٰہی کو جذب کر سکے اور پھر اسے اللہ کے بندوں تک ٹھیک ٹھیک پہنچا سکے۔ اس کے لیے حضور ﷺ پریشان رہا کرتے تھے۔ اس شرح صدر کے نتیجے میں آپ ﷺ کو اطمینان حاصل ہو گیا۔

حضور ﷺ کو اپنے منصب کے تقاضوں کے تحت اللہ کے پیغام کو عام کرنے کی فکر تھی اور اپنی قوم اور امت کا غم اور پریشانی بھی لاحق تھی۔ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کے قلب کو اس حوالے سے اتنی وسعت بخشی کہ یہ سب پریشانیاں بھی اس کے اندر سما گئیں۔ پھر اس کام کو کرنے کے لیے، جس تحمل، بردباری، قوتِ برداشت اور اعلیٰ ظرفی کی ضرورت تھی، وہ بھی اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کے سینے میں پیدا کی، یہ بھی شرح صدر تھا۔ ایک مفسر کے الفاظ میں آپ ﷺ کے قلب مبارک کے اندر طرح طرح کے تصرفات کی استعداد پیدا کر دی گئی۔

حضرت شاہ ولی اللہؒ نے انسانی قلب کی صلاحیتوں اور وسعتوں کو ایک مثال کے ذریعے اس طرح اُجاگر کیا ہے کہ یوں سمجھو کہ دل میں ۱۲ خانے ہیں۔ کسی میں بادشاہ، کسی میں حکیم، کسی میں قانون ساز یا جرنیل بیٹھے ہیں اور کسی میں واعظ و عابد۔ مگر اللہ تعالیٰ نے یہ تمام کمالات اور خوبیاں نبی کریم ﷺ کے قلب میں بیک وقت جمع فرما دیں۔ اس طرح اَلَمْ نَشْرَحْ کے مفہوم میں حضور ﷺ کے قلب میں وسعت اور اپنے مشن کی تکمیل کے لیے شخصیت کی تعمیر کے تمام پہلو مجتمع کر دیے۔

بعض احادیث میں اس معجزے کا بھی ذکر کیا گیا ہے، جس کے مطابق مختلف اوقات میں حضور ﷺ کا سینہ چاک کیا گیا۔ اس حوالے سے احادیث میں مختلف روایات آتی ہیں مگر علاّمہ آلوسیؒ نے لکھا ہے کہ اس سورہ میں شرح صدر کا ذکر ضرور کیا گیا ہے، مگر یہاں شق صدر مراد نہیں ہے۔ ان کے نزدیک یہ روایت ضعیف ہے۔

شق صدر کے حوالے سے، جو روایات احادیث میں آتی ہیں وہ بھی اس پہلو پر روشنی ڈالتی ہیں کہ حضور ﷺ کو شرح صدر کے طور پر کن کن نعمتوں سے نوازا گیا۔ اس سلسلے میں، جو پہلا

واقعہ بیان کیا جاتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ بچپن میں جب آپ ﷺ دودھ پینے کے لیے حلیمہ سعدیہ کے پاس تھے، اس وقت آپ ﷺ کا سینہ چاک کر کے اس میں سے وسوسوں کو نکال دیا گیا۔ شیطان انسان کے دل میں وسوسہ ڈالتا ہے اور وہ اس کے پیچھے چل پڑتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو اس سے محفوظ کر دیا۔ اسی لیے آپ ﷺ گناہوں سے پاک اور معصوم تھے۔ اسی بات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا تھا کہ میرے ساتھ بھی شیطان لگا ہوا ہے لیکن میرا شیطان میرے قابو میں ہے۔ دوسرے لوگ شیطان کے قابو میں آجاتے ہیں لیکن حضور ﷺ اس کے قابو میں نہیں آتے تھے۔

دوسری روایت کے مطابق حضور ﷺ نے فرمایا کہ دو فرشتے سفید کپڑوں میں ملبوس میرے پاس آئے۔ انھوں نے مجھے زمین پر لٹایا اور میرا سینہ چاک کر دیا۔ اس کے بعد ایک فرشتے نے دوسرے سے کہا کہ ان کے سینے سے ظلم، حسد، بدخواہی اور دوسروں کے لیے برائی، جو کچھ بھی ہے وہ نکال دو۔ چناں چہ ایک کالی پھٹکی میرے دل سے نکال کر باہر کر دی گئی۔ دوسرے فرشتے نے کہا: ان کے دل میں رافت، رحمت اور شفقت و محبت داخل کر دو۔ چناں چہ ایک نور میرے سینے میں داخل کر دیا گیا۔ اسی لیے آپ ﷺ کے لیے دعوت کے کام کا بوجھ ہلکا ہو گیا۔ یہی وجہ ہے کہ اپنے دشمنوں کے لیے اور جن لوگوں نے آپ ﷺ کو زندگی بھر ستایا، تنگ کیا، گالیاں دیں اور آپ ﷺ کی جان کے درپے ہوئے، آپ ﷺ کے عزیز واقارب اور پیارے چچا تک کو شہید کر دیا، ان سب کے لیے، اس سب کے باوجود، آپ ﷺ کے دل میں رافت و رحمت کا ہی جذبہ پایا جاتا تھا۔ یہی وہ پہلو ہے، جس کی طرف یہ کہہ کر اشارہ کیا جا رہا ہے کہ اللہ نے آپ ﷺ کا سینہ کھول دیا۔

اس ضمن میں دو مزید واقعات کا ذکر کیا جاتا ہے۔ ایک واقعہ نبوت سے قبل کا ہے، جب کہ دوسرا معراج سے متعلق ہے۔ پہلے کے ذریعے نبوت سے قبل آپ ﷺ کو فریضہ اقامت دین اور دعوت کے کام کے لیے تیار کرنا تھا، اور دوسرے کے ذریعے معراج کے موقعے پر آپ ﷺ کو جن حالات و واقعات کا مشاہدہ کرانا تھا، اس کے لیے تیار کرنا تھا۔ ان سب کے لیے آپ ﷺ کے سینے میں گنجایش پیدا کی گئی یعنی سینہ کھول دیا گیا۔

کوئی سوچ سکتا ہے کہ اگر سینہ کشادہ ہوگا تو اس میں وسوسے زیادہ پیدا ہوں گے۔ اصل

بات یہ ہے کہ تنگ جگہ اور گندگی میں کیڑے مکوڑے پرورش پاتے ہیں مگر جہاں روشنی، ہوا اور کشادگی ہو، وہاں کیڑے مکوڑے پرورش نہیں پاسکتے۔ دل کی کشادگی اس بات کی علامت ہے کہ یہاں گندے خیالات اور وسوسے نہیں پیدا ہوسکتے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کے دل سے وسوسوں اور خدشات کو دور کرکے سینے میں کشادگی پیدا فرمائی۔

اس آیت میں لفظ 'لَکَ' خاص طور پر آپ ﷺ کے لیے استعمال ہوا ہے۔ عربی قواعد کے لحاظ سے آیت کا مفہوم اس لفظ کے بغیر بھی واضح ہے۔ اگر یہ کہا جاتا کہ اَلَمْ نَشْرَحْ لَکَ صَدْرَکَ ۝ (ہم نے آپ ﷺ کا سینہ کھول دیا) تو کافی تھا۔ مگر عربی لغت کے لحاظ سے یہاں لَکَ فعل کے بعد اور مفعول سے پہلے استعمال ہوا ہے۔ یہ اس بات کی علامت ہے کہ اللہ تعالیٰ کی کوئی خاص عنایت اور مہربانی ہے، جو حضور ﷺ کے لیے مخصوص تھی۔ اسی لیے اس احسان کا ذکر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: اے نبی ﷺ صرف خاص آپ ﷺ کی منفعت، بھلائی اور سہولت کے لیے ایسا کیا گیا کہ آپ ﷺ کا سینہ کھول دیا گیا اور اس طرح سے آپ ﷺ پر احسان عظیم کیا گیا۔ لَکَ کا استعمال اس عنایت کو صرف آپ ﷺ کے لیے مخصوص کرنے کو ظاہر کرتا ہے۔

وَوَضَعْنَا عَنْکَ وِزْرَکَ ۝ الَّذِیْٓ اَنْقَضَ ظَھْرَکَ ۝ (الم نشرح: ۲، ۳)

''اور تم پر سے وہ بھاری بوجھ اتار دیا، جو تمھاری کمر توڑے ڈال رہا تھا۔''

بوجھ سے کیا مراد ہے؟ یہ سوال بھی کئی مطالب پر مبنی ہے۔ ایک بوجھ تو آپ ﷺ پر یہ تھا کہ آپ ﷺ کو اس بات کی تلاش تھی کہ حق کیا ہے؟ میں کس راہ پر چلوں کہ اپنے رب تک پہنچ سکوں، اور کس راہ پر اپنی قوم کو چلاؤں کہ قوم کی نجات اور فلاح کا سامان ہوسکے؟ پھر آپ ﷺ کے ذہن پر ایک بوجھ یہ بھی تھا کہ قوم جن گمراہیوں، خرابیوں اور بداعمالیوں میں مبتلا ہے، اس کی اصلاح کیسے ہوسکے گی؟ یہ بھی ایک غم تھا، جو آپ ﷺ کو کھائے جاتا تھا، اور اس غم کا ذکر بھی قرآن مجید نے فرمایا ہے۔ اس کے بعد جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایمان کی دعوت آپ ﷺ کو مل گئی اور اللہ تعالیٰ نے اپنا پیغام، رسالت کا مشن آپ ﷺ کے سپرد کردیا تو پھر اسے پہنچانے کا احساس بھی ایک بوجھ تھا۔

نزولِ وحی خود اپنی جگہ ایک بوجھ تھا۔ قرآن مجید نے اسی بات کے پیشِ نظر اس کے لیے قولِ ثقیل کے الفاظ استعمال کیے ہیں کہ ہم ایک بھاری ذمے داری کا بوجھ آپ ﷺ کے کاندھوں

پڑ ڈالنے والے ہیں۔ جن احادیث میں نزول وحی کی کیفیت بیان کی گئی ہے، ان کے مطالعے سے بھی یہ بات واضح ہوتی ہے کہ یہ بوجھ صرف اپنے معنی کے لحاظ سے، مشن کے لحاظ سے اور لوگوں تک اللہ کا پیغام پہنچانے کے لحاظ سے ہی نہیں تھا بلکہ فی الواقع وحی کا بوجھ آپ ﷺ پر اس طرح پڑتا تھا کہ اگر سردی ہوتی تھی تو آپ ﷺ کی پیشانی پر پسینہ آ جایا کرتا تھا۔ ایک صحابی کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ نے اپنی ٹانگ میری ٹانگ پر رکھی ہوئی تھی کہ اس دوران وحی نازل ہوگئی۔ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ جیسے بوجھ کے مارے میری ٹانگ ٹوٹ جائے گی۔ اسی طرح ایک مرتبہ آپ ﷺ اونٹنی پہ سوار تھے کہ وحی نازل ہوئی تو بوجھ کے بار سے اونٹنی بیٹھ گئی۔ یہ تمام کیفیات عالم غیب سے تعلق رکھتی ہیں۔ ہم ان کی حقیقت تک نہیں پہنچ سکتے۔ مگر یہ بات کہ اللہ کا پیغام حاصل کرنا، اسے ان لوگوں تک پہنچانا، جو جاہل اور مخالف تھے، بات سننے پر روادار نہ تھے اور اس راہ میں روڑے اٹکا رہے تھے، اور پھر اِس منصب اور مشن کے تقاضوں کا احساس بھی اپنی جگہ ایک بوجھ تھا، جس کے نیچے آپ ﷺ دبے چلے جا رہے تھے، اور اس پر آپ ﷺ پریشان رہا کرتے تھے۔ اس حوالے سے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اے نبی ﷺ، آپ ﷺ پر یہ جو بوجھ تھا، اسے ہم نے آپ ﷺ پر سے ہلکا کر دیا۔

وَوَضَعْنَا کے معنی وضع کرنے، کم کرنے یا ہٹانے کے ہوتے ہیں۔ محاورتاً کہا جاتا ہے کہ تنخواہ میں سے اتنے پیسے وضع کر لیے گئے، تو اس سے مراد اتنے پیسے کم کرنا ہوتا ہے۔ گویا یہاں بوجھ وضع کرنے سے مراد بوجھ کو ہٹانا، کم کرنا یا ہلکا کرنا ہے۔

یہاں بوجھ کو ہٹانے سے اللہ تعالیٰ کے نبی کریم ﷺ پر تین طرح کے احسانات مراد ہیں۔ ایک، شرح صدر، یعنی آپ ﷺ کے سینے کا کھولا جانا۔ دوسرے، بوجھ کا ہلکا کیا جانا یا ہٹایا جانا۔ تیسرے، آپ ﷺ کے ذکر کا بلند کیا جانا۔ مفسرین کی رائے میں یہاں 'وُ' ان تینوں مفہوم، یعنی سینہ کھول دیا، بوجھ ہٹا دیا اور ذکر کو بلند کر دیا کو واضح کرتی ہے۔ مجموعی طور پر رسالت اور دعوت کا بوجھ مراد ہے۔ اس بوجھ کو اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کے لیے اٹھانا آسان کر دیا تھا۔ ایک ایسی قوم میں جو جاہل تھی، دعوت کا کام کرنا واقعتاً ایک کٹھن کام تھا۔ آج بھی لوگ عوام کی حالت زار دیکھ کر مایوس ہو کر یہ بات کہتے ہیں کہ اس قوم سے کوئی امید نہیں، اب کیا ہوگا، کام کیسے ہوگا؟ یہ جملے مصلحین، داعیین اور مفکرین کی زبانی اب بھی سنے جاتے ہیں۔ یہی کیفیت ہر نبی کو پیش آتی

تھی۔ ہر نبی پکار اٹھتا تھا کہ اللہ مردوں کو کیسے زندہ کرے گا؟ یعنی جو قوم اخلاق اور کردار کے لحاظ سے مردہ ہو چکی ہو، وہ کیسے اٹھ کھڑی ہو گی!

ان حالات میں دعوت کا کام یک و تنہا کیے چلے جانا، انتہائی کٹھن کام تھا، جب کہ خود آپ ﷺ کی اپنی ذات بھی ظلم و ستم کا نشانہ بن رہی ہو اور آپ ﷺ کے انتہائی قریبی اور پیارے ساتھیوں پر بھی مشق ستم جاری ہو۔ کسی پر کوڑے برسائے جا رہے ہیں، کسی کو تپتی ریت پر گھسیٹا جا رہا ہے، کسی کو دہکتے انگاروں پر لٹایا جا رہا ہے، مگر حالت یہ ہے کہ اف تک نہیں کی جا سکتی، کسی پر ہاتھ نہیں اٹھایا جا سکتا اور تلوار نہیں نکالی جا سکتی تھی۔ یہ بہت صبر آزما مرحلہ تھا اور نبی کریم ﷺ کے سینے پر ایک بڑا بوجھ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس بوجھ کو بھی آپ ﷺ کے سینے سے ہلکا کر دیا۔ آپ ﷺ کو صبر عطا کیا اور اپنی راہ میں استقامت بخشی۔

وَرَفَعۡنَا لَكَ ذِكۡرَكَ ۝ (الم نشرح: ۴)

''اور تمھاری خاطر تمھارے ذکر کا آوازہ بلند کر دیا۔''

بلند کرنا کے معنی آواز کا گونجنا ہے، یعنی جس طرح آواز کی گونج دور دور تک سنائی دیتی ہے، اسی طرح نبی کریم ﷺ کا ذکر بھی چاروں طرف گونج گیا، پھیل گیا۔ آپ ﷺ کے ذکر سے مراد دو چیزیں ہیں۔ ایک، آپ ﷺ کا نام اور دوسری آپ ﷺ کی دعوت۔ یہ دونوں چیزیں ہی آپ ﷺ کا ذکر ہیں۔ آپ ﷺ جو کتاب، پیغام اور ہدایت لے کر آئے تھے وہ اگر دنیا میں پھیلے، اس کا چرچا ہو اور لوگ اسے قبول کریں، تو یہ بھی آپ ﷺ کا ذکر ہے۔ اسی طرح آپ ﷺ کے نام کا پھیلنا بھی آپ ﷺ کا ذکر ہے۔

آپ ﷺ نے جب دعوت کا آغاز کیا تھا تو اس وقت تک آپ ﷺ عرب میں ایک غیر معروف شخصیت تھے۔ مگر جس وقت یہ سورہ نازل ہوئی تھی، اسی وقت تک آپ ﷺ کا نام عرب کے گوشے گوشے میں پھیل چکا تھا۔ آپ ﷺ کا نام اس طرح سے بھی پھیلا کہ آپ ﷺ حج کے موقع پر آنے والے قبائل تک دعوت پہنچاتے، ان کی خیمہ گاہوں میں جا کر بات کرتے، راستے میں ملاقاتیں کرتے اور مجمع سے خطاب کرتے۔ دوسری طرف آپ ﷺ کے مخالفین نے آپ ﷺ کے خلاف پروپیگنڈہ کر کے بھی آپ ﷺ کا نام متعارف کروایا۔ وہ ہر شخص سے یہ کہتے تھے کہ ہمارے ہاں فلاں نام کا ایک شخص ہے، اور وہ یہ بات کہتا ہے، اس کی بات نہ سننا۔ اس طرح سے

بھی آپ ﷺ کا نام پھیلتا چلا گیا۔ اس بات سے لوگوں میں جاننے کا تجسس بھی پیدا ہوتا تھا کہ وہ شخص کون ہے اور کیا بات کہتا ہے؟ اس طرح بہت سے لوگ جاننے کی غرض سے نبی کریم ﷺ کے پاس آئے اور حلقہ بگوش اسلام ہو گئے۔ گویا آپ ﷺ کی دعوت اور مخالفین کی کوششوں کے نتیجے میں آپ ﷺ کا نام عرب کے گوشے گوشے میں پھیل گیا۔

اس کا ایک دوسرا پہلو، نبی کریم ﷺ کی وفات کے بعد آپ ﷺ کے ذکر کا بلند ہونا ہے۔ یہ تاریخ کا ایک ایسا معجزہ ہے، جس کی کوئی مثال نہیں۔ یورپ کا ایک مستشرق ہملٹن گب لکھتا ہے کہ مکہ کے ایک یتیم بچے نے لا الٰہ الا اللہ کی ایک ایسی برقی آواز بلند کی کہ مکہ سے لوگ نکلے اور ایک سو سال کے عرصے میں اسپین، ہندستان، افریقہ اور چین تک پھیل گئے۔ یوں وادیوں، پہاڑوں، کھیت کھلیانوں، گھروں اور مساجد کے میناروں سے، ہر جگہ اس یتیم بچے کا نام پکارا جانے لگا: اَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰہِ!

دنیا بھر میں نبی کریم ﷺ کی ذات اقدس پر درود و سلام بھیجنا، اس کے لیے محافل ذکر کا انعقاد، یہ رفع ذکر (ذکر کا بلند ہونا) کے اس وعدے کا ایفا ہے، جو اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ سے فرمایا تھا اور بشارت دی تھی۔ یہ بشارت نہ صرف آپ ﷺ کی زندگی میں پوری ہوئی بلکہ آپ ﷺ کی رحلت کے بعد بھی دنیا کے گوشے گوشے میں آپ ﷺ کا ذکر بلند ہو رہا ہے۔ واشنگٹن ہو یا جکارتہ، متمدن ممالک ہوں یا غیر متمدن ممالک، دنیا میں کوئی جگہ ایسی نہیں جہاں محمد رسول اللہ ﷺ پر درود و سلام نہ پڑھا جاتا ہو، یا آپ ﷺ کا ذکر نہ کیا جاتا ہو۔ کسی بھی انسان کا ذکر اس طرح نہیں ہوتا، جس طرح آپ ﷺ کا ذکرِ مبارک ہوتا ہے۔

نبی کریم ﷺ کے ذکر سے مراد صرف آپ ﷺ کے نام کا ذکر ہی نہیں ہے، اگرچہ وہ بھی مراد ہے۔ احادیث میں آتا ہے کہ جبرئیل علیہ السلام نے آ کر حضور ﷺ کو بشارت دی کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ آپ ﷺ کا ذکر تو میں نے اس طرح سے بلند کیا ہے کہ جہاں میرا نام لیا جائے گا وہاں آپ ﷺ کا نام بھی لیا جائے گا۔ جہاں میرا ذکر ہوگا وہاں آپ ﷺ کا ذکر بھی ہوگا۔ خود اپنی کتاب میں جہاں اس نے اللہ کہا، وہاں رسول کا لفظ بھی استعمال کیا۔ دونوں کو ساتھ ساتھ بھی رکھا مگر دونوں کے درمیان ایک فرق اور امتیاز بھی برقرار رکھا۔ اگر ایک رب اور مالک ہے تو دوسرا بندہ اور رسول ہے۔ اس طرح سے بندگی کا احساس بھی دلایا ہے، جیسا کہ فرمایا: اَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ

اِلاَّ اللّٰہُ وَ اَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَ رَسُوْلُہٗ۔ یہ اس لیے بھی فرمایا چوں کہ قرآن، حدیث، کلمے اور اذان میں ہر جگہ اللہ اور رسول ﷺ کا نام ساتھ ساتھ موجود ہے۔ اس سے یہ گمان پیدا ہوسکتا ہے کہ دونوں کی برابر کی حیثیت ہے۔ ایسا نہیں ہے، بلکہ یہاں اسی بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ ایک آقا ہے اور دوسرا بندہ۔ مگر بندہ بھی ہے تو بندوں میں سب سے اعلیٰ و ارفع اور محبوب ترین بندہ۔ اِس کا ذکر اُس نے اس طرح بلند کیا ہے کہ اپنے نام اور اپنے ذکر کے ساتھ اس کے نام اور ذکر کو تا قیامت منسلک کر دیا ہے۔

آپ ﷺ کی دعوت اور پیغام بھی آپ ﷺ کا ذکر ہے کہ جس کی بنیاد پر ایک متمدن اور مہذب دنیا قائم ہوئی اور ہزار برس تک وہ تہذیب دنیا پر غالب رہی۔ انسانی تاریخ میں کوئی ایسی مثال نہیں ملتی کہ کوئی پیغام، دعوت اور تہذیب ایک ہزار برس تک دنیا کے اندر غالب رہی ہو۔ حکمراں بدلتے رہے، عرب گئے تو عجمی آ گئے، ترک گئے تو سلجوق آ گئے۔ الغرض اس طرح سے ایک کے بعد ایک آتا رہا اور یہ سلسلہ ایک ہزار برس تک چلتا رہا۔ مگر نام ایک رہا، ہدایت ایک رہی، پیغام ایک رہا اور تہذیب ایک رہی۔

انگریز کا انجام دنیا کے سامنے ہے۔ جنگ آزادی کے بعد ۱۸۵۷ تک انگریز نے ہندستان پر اپنا قبضہ مکمل کیا مگر ۱۹۴۷ میں اسے یہاں سے رخصت ہونا پڑا۔ دنیا میں جہاں بھی مختلف قوموں نے قبضہ کیا، وہ وہاں چند سال سے زیادہ نہیں رہ سکیں۔ مگر اسلام کا معاملہ یکسر مختلف ہے۔ ایک مسلمان یورپی نومسلم محمد اسد لکھتے ہیں کہ یہ دنیا کی حیرت انگیز بات ہے کہ دنیا کی سب سے بڑی لادینی شہنشاہیت، سلطنت روما کو اپنے عروج تک پہنچنے میں ۶۰۰ سو سال لگے، مگر جب وہ بکھرنا شروع ہوئی تو صرف ۱۰۰ سال میں بکھر کر ختم ہوگئی۔ اس کے برعکس دنیا کی سب سے بڑی دینی تہذیب، اسلامی تہذیب کو دنیا بھر میں پھیلنے کے لیے ۱۰۰ سو سال نہیں بلکہ صرف ۶۰ سال لگے۔ اس دوران مسلمان مدینہ سے نکل کر ثمرقند، بخارا، لیبیا، اسپین اور دنیا بھر میں تیزی کے ساتھ پھیل گئے، جب کہ اس تہذیب کے زوال کو ایک ہزار برس لگے۔ مگر زوال کے بعد بھی آج مسلمان ایک اُمت ہیں اور مخالفین کے لیے ایک خطرہ۔ گویا اس طرح سے اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کے نام کے ساتھ ساتھ آپ ﷺ کی دعوت کو بھی بلند کیا اور اس کے اثرات دنیا بھر میں محسوس کیے جاسکتے ہیں۔ یہ بھی رفع ذکر کا ایک پہلو ہے۔

اس مختصر سی آیت میں اللہ کا اپنے نبی ﷺ کے ساتھ تعلق، محبت اور شفقت کی بھرپور عکاسی ہوتی ہے۔ اس کے بعد اگلی آیت میں اس بات کی وضاحت کی گئی ہے کہ یہ عظمت و رفعت کیسے ملتی ہے اور اللہ کے ہاں اس کا کیا قانون اور سنت ہے؟

فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ۝ اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ۝ (الم نشرح: ۵،۶)

''پس حقیقت یہ ہے کہ تنگی کے ساتھ فراخی بھی ہے۔ بے شک تنگی کے ساتھ فراخی بھی ہے۔''

ان آیات میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کو سورۂ ضحیٰ کے نزول کے وقت، جن حالات کا سامنا تھا، یعنی آپ ﷺ تکلیف میں تھے، ایذا رسانی کا سامنا تھا، اور مخالفتوں سے دوچار تھے۔ مگر اس سورہ کے نزول کے وقت حالات میں کچھ بہتری آچکی تھی۔ اگرچہ اس وقت بھی آپ ﷺ مکہ میں ہی قیام پذیر تھے اور اسی قسم کے حالات سے دوچار تھے، مگر سبق یہ دیا جا رہا ہے کہ یہ راستہ جدوجہد کا راستہ ہے۔ یہ نعمتیں خود بخود نہیں حاصل ہوسکتیں بلکہ یہ جہاد، جدوجہد اور محنت سے حاصل ہوتی ہیں، اور اس راہ میں پیش آنے والی مشکلات اور آزمائشوں سے گزر کر ہی حاصل ہوتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آپ ﷺ پر مصائب پڑتے رہے، مگر آپ ﷺ انھیں صبر سے برداشت کرتے رہے۔ تمام مصائب اور مشکلات کے باوجود آپ ﷺ اس کام اور فریضے کو ادا کرتے رہے، جو اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کے سپرد کیا تھا۔ اس جدوجہد کے نتیجے میں ہی آپ ﷺ کو یہ مقام و مرتبہ، یہ بلندی و سرفرازی حاصل ہوئی اور بشارتوں کا پورا ہونا نصیب ہوا۔

اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ۝ (بے شک تنگی کے ساتھ فراخی بھی ہے) کے اندر یہ اصول بھی بیان ہوا ہے کہ جو آدمی محنت اور مشقت کرتا ہے، اسی کو اس کا پھل ملتا ہے: وَ اَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى ۝ (النجم: ۳۹) یعنی انسان جس چیز کے لیے سعی اور کوشش کرتا ہے، وہی اس کو نصیب ہوتی ہے۔ اس کے اندر یہ بشارت بھی موجود ہے کہ اگر آج آپ ﷺ پر عسر کی کیفیت ہے، تو یہ یسر سے بدلنے والی ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ آیت دو دفعہ کیوں آئی یا اس ایک بات کو دو دفعہ کیوں دہرایا گیا؟ بعض لوگ کہتے ہیں کہ چوں کہ یہ ایک اہم بات تھی اس لیے تکرار کے ذریعے دل کے اندر بٹھانا مقصود تھا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر آزمایش اور مشکل سے گزرنے کے بعد ایک اور آزمایش ہے، یعنی کسی آزمایش کو آخری آزمایش نہیں سمجھنا چاہیے کہ

کمر کھول کر بیٹھ جاؤ۔ گویا جب تک اپنے کام سے فارغ نہ ہو جاؤ، یہ دعوت کامیاب نہ ہو جائے، اس وقت تک مصائب اور آزمائشوں کا سلسلہ جاری رہے گا۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ عسر یعنی آزمائش تو ایک ہی ہے، لیکن آسانی کی بے شمار قسمیں ہیں، جو اللہ تعالیٰ نے عطا کی ہیں، مثلاً مکہ کے دور کے بعد مدینہ کا دور آیا۔ اس کے بعد خلفائے راشدین کا دور آیا۔ اس طرح سے ایک کے بعد دوسرا دور آتا چلا گیا۔ اُمت بتدریج پھیلتی چلی گئی۔ بعض لوگوں کے مطابق ایک یسر سے مراد تو دنیا کی آسانیاں ہیں، یعنی اس دنیا میں جو مصائب اور مشکلات آئیں گی، ان کے نتیجے میں دنیا میں ہی کامیابی، راحت اور آسانی ملے گی، جب کہ دوسرے یسر سے مراد آخرت کی کامیابی ہے۔

قرآن مجید کا یہ معجزہ ہے کہ اس کے الفاظ کے اندر بہت سے معنی و مفہوم کی گنجایش ہوتی ہے۔ اگر یہ سب معنی بھی یہاں سمیٹ لیے جائیں تو بھی مزید معنوں کی گنجایش موجود رہے گی۔ اگر تمام سمندر سیاہی بن جائیں اور تمام درخت قلم بن جائیں تب بھی آیاتِ قرآنی کے معنی و مفہوم ختم نہیں ہوں گے۔

قرآن مجید تو ایک سمندر ہے، جس کے معنی و مطالب اور علم کی گہرائی کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ میں نے آپ کے سامنے ایک ایک آیت کے کئی کئی معنی بیان کیے ہیں۔ ان معنوں میں کوئی تضاد نہیں ہوتا بلکہ یہ ایک ہی بات کو سمجھنے کے بہت سے پہلو ہوتے ہیں۔ یہ علمی اختلاف ہے، جو اس لحاظ سے ایک نعمت ہے کہ اس کے نتیجے میں ایک ہی بات کے بہت سے پہلو سامنے آجاتے ہیں اور سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔

اس سورہ میں دراصل اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک ہدایت، نصیحت اور سبق ہے کہ اس راہ میں یہ تمام مراحل آکر رہیں گے، اور آزمائش اور جدوجہد کے نتیجے میں ہی کامیابی و سرفرازی نصیب ہوتی ہے۔

فَإِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ ۝ وَإِلَىٰ رَبِّكَ فَارْغَبْ ۝ (الم نشرح: ۷، ۸)

''لہٰذا جب تم فارغ ہو تو عبادت کی مشقت میں لگ جاؤ، اور اپنے رب ہی کی طرف راغب ہو۔''

یہاں یہ ہدایت دی جارہی ہے کہ اس کٹھن جدوجہد میں اگر آپ ﷺ کو فرصت میسر آجائے تو آپ ﷺ عبادت میں لگ جایئے اور صرف اپنے رب کے ساتھ دل لگایئے اور اسی

سے رغبت رکھیے۔ یہاں لفظ فَرَغْتَ استعمال ہوا ہے، جو اردو زبان میں بھی مستعمل ہے۔ اس کے مفہوم کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ اسی طرح فَانْصَبْ کا لفظ عربی زبان کا لفظ ہے، جس کے معنی محنت کرنا اور تھکن کے ہیں، یعنی اتنی محنت کی جائے کہ انسان تھکاوٹ محسوس کرے۔

اس سورہ کے آخر میں بھی نبی کریم ﷺ کو اسی طرح ہدایت اور تاکید کی گئی ہے، جس طرح سورۂ ضحیٰ کے آخر میں جب تمام ہدایات دی جا چکی تھیں، آپ ﷺ کو کچھ عملی ہدایات دی گئی تھیں۔ سورۂ ضحیٰ میں فرمایا گیا تھا:

فَاَمَّا الْيَتِيْمَ فَلَا تَقْهَرْ ۝ وَ اَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْهَرْ ۝ وَ اَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ ۝ (الضحیٰ:۹-۱۱)

''لہٰذا یتیم پر سختی نہ کرو اور سائل کو نہ جھڑکو اور اپنے رب کی نعمت کا اظہار کرو۔''

گویا جو یتیم ہیں، یا معاشرے میں یتیموں کی طرح کمزور اور بے بس ہیں، ان کے حقوق مت دباؤ بلکہ ان کے حقوق ادا کرو اور ان کے ساتھ اچھا سلوک کرو اور جو بھی مانگنے یا سوال کرنے والا ہو، دنیا کا مال مانگنے والا ہو یا ہدایت کے لیے سوال پوچھنے والا، اس کو مت جھڑکو، بلکہ اس کا سوال پورا کرو۔ اور اللہ نے تمھیں ہدایت کی جو نعمت بخشی ہے اور جو دیگر نعمتیں عطا کی ہیں، ان سب کو بیان کرو۔ یہاں سورۂ الم نشرح میں فرصت میسر آنے پر عبادت اور مشقت میں لگ جانے کی ہدایت کی جا رہی ہے۔

اگر غور کیا جائے تو سورۂ ضحیٰ کی ان تینوں ہدایات کا تعلق اللہ کی مخلوق کے ساتھ ہے۔ یتیم بھی مخلوق ہے، سائل بھی مخلوق ہے اور نعمت کا اظہار بھی مخلوق کے ساتھ ہے۔ مگر سورۂ الم نشرح میں جو ہدایات دی گئی ہیں، ان سب کا تعلق اپنے رب کے ساتھ ہے۔ درحقیقت دو ہی چیزوں سے انسان بنتا ہے۔ ایک، اللہ کی مخلوق کے ساتھ رحمت و شفقت۔ دوسرے، اپنے رب کے ساتھ دل کو لگانا، اسی کا بن جانا اور اسی کا ہو کر رہ جانا۔ اس سورہ میں چوں کہ ان انعامات اور احسانات کا ذکر کیا جا رہا ہے، جو اللہ کی طرف سے خاص حضور ﷺ پر کیے گئے ہیں، اس لیے یہاں ہدایت بھی یہی دی جا رہی ہے کہ خاص طور پر اپنے رب کے ساتھ تعلق قائم کرو۔ یتیم تو بہت سارے ہوں گے، جن کی اللہ نے پرورش کی ہوگی، نادار و مفلس بھی بہت سارے ہوں گے، جن کو اللہ تعالیٰ نے غنی کر دیا، ہدایت کی نعمت بھی اس نے بہت سوں کو دی مگر یہاں جن نعمتوں کا ذکر کیا جا

رہا ہے، یعنی شرح صدر، رفعِ ذکر اور بوجھ کے ہٹائے جانے کی نعمتیں، یہ خاص حضور ﷺ کے لیے تھیں۔ اسی لیے اب خاص اپنے رب کے ساتھ تعلق قائم کرنے کی ہدایت بھی دی جارہی ہے۔

عسر کو یسر سے بدلنے کا نسخہ بھی یہی ہے کہ اپنے رب سے تعلق قائم کیا جائے۔ جو بھی مشکل پڑے یا پریشانی آئے، اگر اس کا مقابلہ جواں مردی اور عزم کے ساتھ کیا جائے تو اللہ تعالیٰ اس کو راحت میں بدل دے گا، اور جب آدمی اللہ کی طرف راغب ہوگا، تو اس میں مصائب کا سامنا کرنے کے لیے قوت اور استعداد بھی پیدا ہوگی۔ اس راہ میں صبر و استقامت صرف اللہ تعالیٰ سے تعلق سے ہی پیدا ہوتا ہے۔

وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُکَ اِلَّا بِاللّٰہِ (النحل:۱۲۷)

”اے نبی ﷺ، صبر سے کام کیے جاؤ اور تمھارا یہ صبر اللہ ہی کی توفیق سے ہے۔“

یعنی صبر اللہ کی طرف سے ہی ملتا ہے۔ ایک دوسرے مقام پر فرمایا:

وَاصْبِرْ لِحُکْمِ رَبِّکَ فَاِنَّکَ بِاَعْیُنِنَا (الطور:۴۸)

”اے نبی ﷺ، اپنے رب کا فیصلہ آنے تک صبر کرو، تم ہماری نگاہ میں ہو۔“

اگر یہ خیال رہے کہ میں اپنے رب کی آنکھوں کے سامنے ہوں، اسی کا کام کر رہا ہوں، اسی کا پیغام پہنچا رہا ہوں اور اسی کے راستے کی طرف لوگوں کو بلا رہا ہوں، تو اس سے بھی صبر پیدا ہوگا۔

قرآن مجید میں اس قسم کی جو باتیں آتی ہیں، یہ دوطرفہ اور مشروط ہوتی ہیں، یعنی ایک بات کے نتیجے میں دوسری بات سامنے آتی ہے۔ مثال کے طور پر کہا گیا: اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ (البقرۃ:۱۵۳) ”اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔“ یعنی جس کے ساتھ اللہ ہوگا اس کو صبر کی توفیق ملے گی اور اس کا جذبۂ صبر بڑھتا جائے گا۔ کہیں فرمایا:

وَاسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوۃِ ط وَ اِنَّھَا لَکَبِیْرَۃٌ اِلَّا عَلَی الْخٰشِعِیْنَ ۝ الَّذِیْنَ یَظُنُّوْنَ اَنَّھُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّھِمْ وَ اَنَّھُمْ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ ۝

(البقرۃ:۴۵،۴۶)

”صبر اور نماز سے مدد لو، بے شک نماز ایک سخت مشکل کام ہے، مگر ان فرماں برداروں کے لیے مشکل نہیں ہے جو سمجھتے ہیں کہ آخرکار انھیں اپنے رب سے ملنا اور اسی کی طرف پلٹ کر جانا ہے۔“

یعنی صبر اور نماز سے مدد حاصل کرنا بڑا گراں ہے، سوائے ان کے جن کے اندر خشوع ہو۔ گویا جو صبر اور صلوٰۃ کو اختیار کرے گا اس کے اندر خشوع پیدا ہوگا اور اس کے لیے صبر اور صلوٰۃ کا راستہ اختیار کرنا آسان ہوگا۔ یہ دونوں آپس میں لازم وملزوم کی طرح کا تعلق رکھتے ہیں۔ یہاں بھی یہی بات فرمائی گئی ہے کہ انسان جب عسر کو یسر سے بدلنے کی کوشش کرے گا تو رب کی طرف متوجہ ہوگا اور اس توجہ کی وجہ سے عسر یعنی تنگی اور مشکل کی حالت میں اپنے رب کے ساتھ تعلق قائم کرنا آسان ہوگا۔

فَرَغْتَ یعنی فارغ ہو جانے سے کیا مراد ہے؟

اس سے مراد دنیاوی مشاغل سے فارغ ہو جانا ہے۔ لیکن دنیاوی اشغال سے فارغ ہو جانے سے مراد یہاں خالصتاً دنیاوی کاموں سے فارغ ہو جانا نہیں ہے، بلکہ اس میں وہ دینی شغل بھی شامل ہیں، جن کا تعلق دنیا سے ہے، مثلاً لوگوں کے حقوق ادا کرنا، اپنی روزی کمانا، بیوی بچوں کے ساتھ زندگی بسر کرنا، دعوت کا کام کرنا اور اللہ کا پیغام پہنچانا۔ یہ سارے کام اللہ کے کام ہیں لیکن ان کا تعلق بندوں کے ساتھ ہے۔ فرمایا جا رہا ہے فَانْصَبْ یعنی جب ان سے فارغ ہو جاؤ تو اور محنت کرو۔ گویا اللہ کی عبادت اور اس کے ساتھ خالص بندگی کا تعلق قائم کرنے میں مزید محنت کرو۔ یہ ہدایت اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کو کئی جگہ دی ہے۔ خاص طور پر سورۂ مزمل میں فرمایا کہ راتوں کو کھڑے رہو، آدھی رات یا آدھی رات سے زیادہ اس سے کم، اور قرآن مجید پڑھو، اس لیے کہ دن میں تمھیں دعوت اور دیگر امور کا بہت شغل یا مصروفیت ہے۔

یہ بات کہی جاتی ہے کہ آدمی جب اللہ تعالیٰ کی مخلوق کے ساتھ مشغول ہوتا ہے تو اللہ کو بھول جاتا ہے۔ حضور ﷺ کے شرحِ صدر کا ایک معجزہ یہ بھی تھا کہ آپ ﷺ دینی کاموں کے ساتھ ساتھ جسمانی، مادی اور دنیاوی کاموں میں بھی اسی طرح مشغول رہتے تھے، جس طرح ایک عام آدمی ان کاموں میں مشغول رہتا ہے۔ صحابہ کرامؓ کا کہنا تھا کہ حضور ﷺ ہمارے سب کاموں میں شریک ہوتے تھے۔ جب ہم قصے کہانی کہتے تھے تو آپ ﷺ شریک ہوتے تھے، یا جب ہم ہنستے تھے تب بھی آپ ﷺ ہمارے ساتھ ہنستے تھے۔ آپ ﷺ کھانا کھاتے تھے، نکاح کرتے تھے، بیویاں تھیں، بچے تھے اور سارے اشغال اسی طرح کے تھے، جیسے عام آدمی کے ہوتے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ کے ساتھ آپ ﷺ کے تعلق میں کوئی کمی نہ آتی تھی۔ آپ ﷺ کے شب و روز مخلوق کی

ہدایت و رہ نمائی میں گزرتے تھے لیکن اللہ تعالیٰ کے ساتھ قرب اور تعلق میں بھی کوئی کمی نہ آتی تھی۔ آپ ﷺ راتوں کو اٹھ کر قیام کرتے تھے اور تلاوت قرآن مجید کیا کرتے تھے۔

بعض لوگوں کی رائے میں فَرَغْتَ کے اندر نبی کریم ﷺ کو بشارت دی گئی ہے کہ ایک وقت ایسا آنے والا ہے کہ جب آپ ﷺ کا کام مکمل ہو جائے گا اور آپ ﷺ اپنے مشن سے فارغ ہو جائیں گے۔ اسی پیرایے و کنایے میں اللہ تعالیٰ نے نہایت خوب صورت انداز میں نبی کریم ﷺ سے فرمایا کہ یہ نہیں ہے کہ آپ ﷺ روز کا کام روز مکمل کر کے اللہ کی طرف رجوع فرمائیں بلکہ ایک وقت آنے والا ہے، جب آپ ﷺ کا تمام کام ہو جائے گا۔ چناں چہ احادیث میں آتا ہے کہ جب آپ ﷺ کا کام تقریباً مکمل ہو گیا تو حضور ﷺ رات رات بھر قیام فرمایا کرتے تھے، اور آپ ﷺ کے پاؤں سوج جایا کرتے تھے۔ جب آپ ﷺ سے کہا گیا کہ اللہ نے آپ ﷺ کے سارے گناہ معاف کر دیے ہیں، پھر آپ ﷺ اتنی مشقت کیوں اٹھاتے ہیں، تو آپ ﷺ نے فرمایا: کیا میں اللہ کا شکر گزار بندہ نہ بنوں! اسی بات کی طرف سورۂ نصر میں بھی اشارہ کیا گیا ہے جہاں فتح کے ساتھ، اللہ کی طرف رجوع کرنے کی بشارت بھی موجود ہے۔

وَ اِلٰی رَبِّکَ فَارْغَبْ ○ (الم نشرح:۸)

"اور اپنے رب ہی کی طرف راغب ہو۔"

یہاں یہ حکم دیا جا رہا ہے کہ صرف اپنے رب ہی سے لو لگاؤ، صرف اسی کے ہو جاؤ، اسی سے دل لگاؤ اور ہر کام صرف اس کی رضا کے لیے کرو۔ اگر دعوت کا کام کرو اور اس راہ میں مصائب کا سامنا ہو تو صرف اسی کی خاطر برداشت کرو۔ گویا جو کام بھی کرو صرف اپنے رب کی رضا اور خوش نودی کے لیے کرو۔

سورۂ ضحیٰ اور سورۂ الم نشرح کی روشنی میں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہدایت مخلوق کا مشن حضور ﷺ کے سپرد کیا تھا۔ اس غرض کے لیے آپ ﷺ کو کتاب دی، وحی نازل کی، راستہ دکھایا اور آپ ﷺ کے گرد صحابہ کرام ﷺ کی صورت میں ایک امت جمع کی۔ اسی امت کے جمع ہونے سے آج ایک ارب سے زاید مسلمان دنیا کے گوشے گوشے میں پائے جاتے ہیں۔ اگر وہ مٹھی بھر مسلمان اس وقت جمع نہ ہوتے تو آج اتنی بڑی تعداد میں مسلمان دنیا میں نہ پائے جاتے۔ اسی طرح غزوۂ بدر میں اگر مسلمانوں کو فتح نصیب نہ ہوتی تو آج دنیا میں مسلمانوں کا وجود

باقی نہ ہوتا۔ یہ وہ بات تھی جسے محسوس کرتے ہوئے حضور ﷺ نے غزوۂ بدر کے موقعے پر یہ دعا کی تھی کہ اے اللہ! آج اگر یہ مٹھی بھر مسلمان ہلاک ہو گئے تو دنیا میں پھر کبھی تیری بندگی نہ ہوگی۔

یہ وہ مشن تھا، جو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کے سپرد کیا تھا۔ اسی غرض کے لیے اس نے انسانوں کو آزمایش میں ڈالا ہے اور اس آزمایش میں کامیاب کرنے کے لیے اس نے انبیا بھیجے ہیں۔ اس سلسلے میں نبی کریم ﷺ کو آخری نبی کے طور پر بھیجا گیا۔ نبی کریم ﷺ سے اللہ کو جو محبت، شفقت اور انس ہے اور جس انداز اور قربت کے احساس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ سے کلام فرمایا، یہ سب باتیں واضح ہیں۔ اس احسان میں ہم بھی آپ ﷺ کے ساتھ شریک ہیں۔ اس لیے کہ ہم آپ ﷺ کے امتی ہیں۔ آپ ﷺ کا جو مشن تھا آپ ﷺ کے امتی ہونے کے ناطے وہ ہر امتی اور ہر مسلمان کا مشن ہے۔ ہر مسلمان اس بات کا ذمے دار ہے کہ وہ خواہ ایک ہی آیت جانتا ہو، وہ اسے دوسروں تک پہنچائے۔ ہم اس فرض سے غافل ہو گئے ہیں، اور اسی کا نتیجہ ہے کہ امت کا مزاج تبدیل ہو گیا ہے، اور اخلاق بگڑتے جا رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ امت مسلمہ آج زوال کی شکار ہے۔

یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ حضور ﷺ کے ساتھ جتنے وعدے اور بشارتیں تھیں وہ ہر زمانے کے لیے اور ہر دور کے مسلمانوں کے لیے ہیں۔ صرف آپ ﷺ کے لیے ہی مخصوص نہیں، بلکہ ساری امت کے لیے ہیں، جو بھی اللہ کے دین کے لیے کھڑا ہو جائے گا، اللہ اس کے مرتبے اور کام کے لحاظ سے اسے شرحِ صدر عنایت کرے گا۔ اسے دنیا کے اندر محبوب بھی بنائے گا اور اس کا بوجھ بھی ہلکا کرے گا۔ اس کو اپنی دعوت اور مشن کی ذمے داری اٹھانے کے لیے اہلیت اور صلاحیت بھی دے گا۔ یہ سارے وعدے اس کے ساتھ بھی پورے ہوں گے۔ اس کام کے لیے صرف عزم اور ہمت کی ضرورت ہے۔ جو پیغام اس نے اپنے نبی ﷺ کو دیا ہے وہی پیغام ہمارے لیے بھی ہے۔ ہم آپ ﷺ کے امتی ہونے کے ناطے اس نعمت میں کسی نہ کسی درجے میں شریک ہیں، جو اس نے آپ ﷺ پر نازل فرمائی لیکن اس نعمت کا حق دار بننے کے لیے اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًا ؕ ’’بے شک تنگی کے ساتھ فراخی بھی ہے۔‘‘ یاد رکھنے کی ضرورت ہے۔

اگر ہم آزمائشیں برداشت کرنے کے لیے تیار ہیں، مشکلات سے گزرنے کے لیے تیار ہیں، اللہ کے دین کی راہ پر چلنے اور عمل کرنے میں مشکلات، مزاحمتوں، رکاوٹوں اور ممانعات

کے باوجود، جم کر اطاعت کے لیے تیار ہیں تو سورۂ ضحیٰ اور سورۂ الم نشرح، حضور ﷺ سے محبت کے واسطے اور ناطے سے، جو ہم سب کو ہے، ہمیں ایک پیغام بھی دیتی ہیں اور عمل کے لیے راستہ بھی کھولتی ہیں کہ ہمیں کیا بننا چاہیے اور کیا کرنا چاہیے، نیز ہمارا مشن کیا ہونا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں وہی بننے اور کرنے کی توفیق عطا فرمائے، جو محمد عربی ﷺ کے امتی ہونے کے ناطے سے وہ ہم سے چاہتا ہے۔ آمین

؁

سورة التين

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ ۝
وَالتِّيۡنِ وَالزَّيۡتُوۡنِ ۝۱ وَطُوۡرِ سِيۡنِيۡنَ ۝۲ وَهٰذَا الۡبَلَدِ الۡاَمِيۡنِ ۝۳ لَقَدۡ خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ فِىۡۤ اَحۡسَنِ تَقۡوِيۡمٍ ۝۴ ثُمَّ رَدَدۡنٰهُ اَسۡفَلَ سٰفِلِيۡنَ ۝۵ اِلَّا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمۡ اَجۡرٌ غَيۡرُ مَمۡنُوۡنٍ ۝۶ فَمَا يُكَذِّبُكَ بَعۡدُ بِالدِّيۡنِ ۝۷ اَلَيۡسَ اللّٰهُ بِاَحۡكَمِ الۡحٰكِمِيۡنَ ۝۸

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔

قسم ہے انجیر اور زیتون کی۔ اور طورِ سینا اور اس پر امن شہر (مکہ) کی، ہم نے انسان کو بہترین ساخت پر پیدا کیا، پھر اسے الٹا پھیر کر ہم نے سب نیچوں سے نیچ کر دیا، سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے کہ ان کے لیے کبھی ختم نہ ہونے والا اجر ہے۔ پس (اے نبی ﷺ) اس کے بعد کون جزا وسزا کے معاملے میں تم کو جھٹلا سکتا ہے؟ کیا اللہ سب حاکموں سے بڑا حاکم نہیں ہے؟

تشریح: یہ سورہ آٹھ آیات پر مشتمل ہے۔ اس میں پہلے چار چیزوں کی قسم کھائی گئی ہے، انجیر، زیتون، طور کے پہاڑ اور شہر مکہ کی۔ اس کے بعد ایک اصول بیان ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو بہترین ساخت پر پیدا کیا ہے۔ اس کی خصوصیت ہے کہ اگر انسانوں میں سے کوئی اپنے مقام

سے نیچے گرے تو وہ نیچے گرتا ہی چلا جاتا ہے، اور اگر ایمان اور عمل صالح کی راہ اختیار کرے تو وہ سرفرازی اور سربلندی کے انتہائی مقام پر پہنچ جاتا ہے، اور اس کے لیے ایسا اجر ہے جو کبھی ختم ہونے والا نہیں۔ اس کے بعد پھر سوالیہ انداز میں دو باتیں کہی گئی ہیں: ایک یہ کہ کس بنیاد پر تم اس بات کو جھٹلاتے ہو کہ اعمال کا بدلہ دیا جائے گا۔ دوسرے یہ کہ کیا اللہ سے زیادہ بڑا کوئی اور حاکم بھی ہے؟ کیا اللہ سب سے بڑا حاکم نہیں ہے؟

اس سورہ میں جو بات کہی گئی ہے وہ یہ ہے کہ اچھے اور برے اعمال کا بدلہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملتا ہے، ملنا چاہیے اور ضرور ملے گا۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس سورہ میں جزا اور سزا کے تصور کی حقانیت کو ثابت کیا گیا ہے کہ جزا اور سزا ضرور ہوگی اور انسانوں کے درمیان اعمال کے لحاظ سے فرق ہوگا۔

وَالتِّيْنِ وَالزَّيْتُوْنِ ۝ وَطُوْرِ سِيْنِيْنَ ۝ وَهٰذَا الْبَلَدِ الْاَمِيْنِ ۝

(التین:۱-۳)

''قسم ہے انجیر اور زیتون کی اور طورِ سینا اور اس پرامن شہر (مکہ) کی۔''

آغاز میں چار چیزوں کی قسم کھائی گئی ہے، یعنی انجیر، زیتون، طور کے پہاڑ اور شہر مکہ کی۔ مکہ کی قسم یہ کہہ کر کھائی گئی ہے کہ یہ امن والا شہر ہے۔ ھٰذا کہہ کر اس طرف اشارہ بھی کیا گیا ہے اور یہ خصوصیت بھی بیان کی گئی ہے کہ یہ پرامن شہر ہے۔ قرآن مجید میں قسم کسی چیز کی تعظیم، توقیر یا بڑائی بیان کرنے کے لیے نہیں کھائی جاتی بلکہ کسی مضمون، بات یا دعویٰ کو ثابت کرنے کے لیے کھائی جاتی ہے۔ یہ سمجھنے کی ضرورت ہے کہ یہاں کس بات کی قسم کھائی گئی ہے۔ قرآن مجید میں جہاں بھی قسمیں کھائی گئی ہیں ان کے نفسِ مضمون اور مفہوم میں اختلاف کی بنا پر ان کو سمجھنے میں اختلاف ہوتا ہے۔ جہاں بات واضح نہیں ہے، وہاں لوگوں نے مختلف چیزیں مراد لی ہیں، مثلاً وَالصّٰٓفّٰتِ صَفًّا ۝ (الصّٰفّٰت:۱) ''قطار در قطار باندھنے والوں کی قسم'' کے لوگوں نے مختلف معنی مراد لیے ہیں۔ اسی طرح وَالذّٰرِيٰتِ ذَرْوًا (الذّٰرِیٰت:۱) ''قسم ہے ان (ہواؤں) کی جو گرد اڑانے والی ہیں'' سے کسی نے ہوا مراد لی ہے اور کسی نے فرشتے۔ اس طرح مختلف افراد نے مختلف معنی مراد لیے ہیں۔

اصولی بات یہ ہے کہ جس چیز کی بھی قسم کھائی جائے، اس کی اس چیز سے کوئی مناسبت

ہونی چاہیے اور اس سے وہ بات ثابت ہونی چاہیے، جو کہ اس سورہ میں کہی جا رہی ہو۔ یہ بات بالکل واضح ہے کہ کسی ایسی چیز کی قسم نہیں کھائی جا سکتی، جس سے یہ واضح نہ ہو کہ سورہ میں کیا بات کہی گئی ہے اور کس بات کو ثابت کیا جا رہا ہے۔ قرآن مجید میں بعض اوقات جس بات پر قسم کھائی جاتی ہے وہ بات قسم سے متصل ہی واضح طور پر بیان کر دی جاتی ہے، اور اس بات کو بیان کر دیا جاتا ہے، جس کو ثابت کرنا مقصود ہوتا ہے، مثلاً:

یٰسٓ ۚ وَالْقُرْاٰنِ الْحَکِیْمِ ۙ اِنَّکَ لَمِنَ الْمُرْسَلِیْنَ ۙ عَلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ؕ (یٰسٓ:۱-۴)

”یٰسین، قرآن حکیم کی قسم! آپ ﷺ اللہ کے رسول ہیں اور اپنے رب کی طرف سے سیدھے راستے پر ہیں۔“

یہاں بات بالکل متصل ہی آ گئی:

قٓ ۚ وَالْقُرْاٰنِ الْمَجِیْدِ ۚ بَلْ عَجِبُوْٓا (قٓ:۱،۲)

”قٓ، قسم ہے قرآن مجید کی! ان لوگوں نے تعجب کیا۔“

ان آیات میں کوئی ایک مفہوم متعین کرنا محال ہے، اس لیے کہ اگلی آیات میں آخرت اور اللہ کے حضور پیش ہونے کا مضمون بیان کیا گیا ہے جو کہ اس قسم کے تحت آتا ہے۔ بعض جگہ جس بات پر قسم کھائی جاتی ہے وہ مضمون میں بیان نہیں کی جاتی بلکہ خود قسم ہی اس مضمون کو کھول کر بیان کر دیتی ہے، جس پر قسم اٹھائی جاتی ہے۔

سورۂ تین میں جس چیز پر قسم کھائی گئی ہے اس میں ایک بات تو واضح ہے کہ انسان کو بہترین تقویم میں، بہترین ساخت پہ پیدا کیا گیا ہے۔ لیکن اس کے بعد نتیجے کے طور پر یہ بیان کیا گیا ہے کہ پھر وہ نیچے گرتا چلا جاتا ہے سوائے ان کے جو ایمان لائیں اور عمل صالح کریں۔ ان کے لیے بہترین اجر ہے۔ گویا قسم، انسان کی بہترین سانچے میں تخلیق پر نہیں ہے بلکہ انسان کی جزا اور سزا پر ہے۔ یہ دونوں معنی مراد لیے جا سکتے ہیں اور دونوں ہی معنی مفسرین نے مراد لیے ہیں۔

البتہ یہ بات غور طلب ہے کہ ان دعووں کے ساتھ انجیر، زیتون اور طور کے پہاڑ کی قسم کیوں کھائی گئی ہے؟ دو چیزیں تو بالکل واضح ہیں۔ پہلی بات سے مراد طورِ سینا (طور کا پہاڑ) ہے جہاں سب سے پہلے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر وحی نازل ہوئی تھی اور نبوت کی ذمے داری آپ

کے سپرد کی گئی تھی۔ اس سے مراد وہ پہاڑ بھی ہے جہاں بنی اسرائیل کو بلایا گیا تھا اور ان سے عہد لیا گیا تھا کہ وہ اللہ کی شریعت اور اس کے دین کے علم بردار بن کر دنیا میں رہیں گے اور تورات کی پابندی کریں گے۔ دوسری بات اَلْبَلَدُ الْاَمِیْنُ بھی بہت واضح ہے، یعنی شہر مکہ۔ فرمایا گیا: وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا ط(آل عمران:۹۷) ''جو اس میں داخل ہوا مامون ہو گیا۔'' حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا تھی:

رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا (البقرۃ:۱۲۶)

''اے میرے رب! اس شہر کو امن کا شہر بنا دے۔''

نفس مضمون سے بظاہر مناسبت نہ ہونے کی وجہ سے یہ سوال بھی ذہن میں پیدا ہوتا ہے کہ یہاں انجیر اور زیتون کے کیا معنی ہیں؟ لوگوں نے اس سے دو قسم کے معنی مراد لیے ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ یہاں تِیْن سے مراد وہی انجیر ہے، جو ہم کھاتے ہیں اور زَیْتُوْن سے مراد بھی وہ زَیْتُوْن ہے، جو ہم کھاتے ہیں اور جس سے تیل نکالا جاتا ہے۔ بیشتر مفسرین نے یہی معنی اختیار کیے ہیں لیکن بعض کا خیال ہے کیوں کہ آگے دو مقامات کا ذکر آ رہا ہے یعنی کوہ طور اور شہر مکہ، اس لیے یہ دراصل دو مقامات کے نام ہیں۔ لہٰذا جنھوں نے اس کے معنی انجیر اور زیتون کے لیے ہیں انھوں نے ان پھلوں کی خصوصیات اور فوائد بیان کیے ہیں اور کوشش کی ہے کہ انسان کی تخلیق کے ساتھ ان کا ربط قائم کریں لیکن حضرت ابن عباسؓ سے لے کر اب تک کئی مفسرین نے یہ بھی کہا ہے کہ ان سے مختلف مقامات مراد ہیں۔

گویا زیتون اور انجیر سے دو قسم کے معنی مراد ہو گئے۔ ایک پھل اور دوسرے، مقامات۔ اگر ان سے مراد مقامات لیا جائے تو اس حوالے سے بھی مفسرین میں مختلف آرا پائی جاتی ہیں۔ بعض کے نزدیک اس سے مراد پہاڑیاں ہیں، یعنی کوہِ تین اور کوہِ زیتون جو شام اور فلسطین میں واقع ہیں۔ ماضی میں بھی لبنان، فلسطین اور مصر کا کچھ علاقہ ملک شام میں ہی شامل تھا۔ اب بھی جب ''عظیم شام'' (Greater Syria) کا نعرہ لگایا جاتا ہے تو اس میں یہ تینوں ممالک شامل ہوتے ہیں۔ اگر مشرق کی طرف منہ کر کے کھڑے ہوں تو یہ علاقہ بائیں ہاتھ پر پڑتا ہے، اس لیے بھی اہلِ عرب اسے ''شام'' کہتے تھے۔ الغرض کسی نے کہا کہ ان دونوں سے دو پہاڑ مراد ہیں، کسی کے خیال میں دو مساجد، اور کسی کے خیال میں شہر بیت المقدس۔ کسی نے کہا کہ انجیر سے مراد

جودی پہاڑ ہے جہاں حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی آ کر ٹھہری تھی۔ زیتون سے مراد وہ پہاڑی بھی ہے جہاں حضرت مسیح علیہ السلام نے اپنا مشہور پہاڑی کا وعظ کہا تھا۔

اس سے مراد وہ پہاڑی بھی ہے جہاں یہودیوں نے اپنے زعم میں حضرت مسیح علیہ السلام کو صلیب پر چڑھایا تھا۔ اس پہاڑی کو ایک رات قبل جا کر حضرت مسیح علیہ السلام نے دیکھ لیا تھا اور سمجھ گئے تھے کہ اس قوم کا پیالہ لبریز ہو چکا ہے اور وہ انھیں ہلاک کرنے کے درپے ہے اور ہلاکت اس کا مقدر ہے۔ چناں چہ انھوں نے یہاں کھڑے ہو کر اپنی قوم کی نجات اور مغفرت کے لیے دعا بھی کی تھی۔ انجیل میں بھی اس کا نام کوہِ زیتون آیا ہے۔ انجیل کے مطابق وہ مقدس پہاڑ کوہِ زیتون تھا جہاں آخری شب جب آپ کو پکڑ کر لے جایا گیا تھا تو وہاں آپ نے اللہ کے آگے آہ و زاری کی تھی کہ اس عذاب کو ہٹا لیا جائے، ان کی قوم کی بربادی نہ ہو، اور اسے یہ مقدر نہ دیکھنا پڑے۔ لیکن بنی اسرائیل کی بداعمالیوں کی بنا پر تقدیر کا فیصلہ اٹل ہو چکا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس واقعے کے صرف ۳۰ برس بعد ہی رومی شہنشاہیت نے بیت المقدس کی اینٹ سے اینٹ بجا دی اور یہودیوں کو غلام بنا کر دنیا بھر میں منتشر کر دیا۔ اس واقعے کے تقریباً دو ہزار سال بعد یہودیوں کو واپس اپنے وطن جانا نصیب ہوا۔

میری رائے میں یہ دو مفہوم قریب ترین ہیں اور ان کا تعلق پورے مضمون کے ساتھ بڑا گہرا ہے۔ اس لیے کہ اس سورہ میں مرکزی مضمون انسان کے لیے جزا و سزا کا تصور ہے۔ اس میں انسان کے بہترین سانچے میں تخلیق کرنے کا مضمون بھی اسی نسبت سے آیا ہے۔ جن مفسرین کے خیال میں اس سورہ میں قسمیں اس لیے کھائی گئی ہیں کہ انسان کو بہترین ساخت پر پیدا کیا گیا ہے تو ان کی اس سے مراد یہ ہے کہ یہ چاروں مقامات ہیں جہاں حضرت نوح علیہ السلام، حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت ابراہیم علیہ السلام جیسے جلیل القدر انبیا کو جنھوں نے البلد الامین کی بنیاد ڈالی تھی، نبوت جیسے عظیم مرتبے پر سرفراز کیا گیا تھا۔ یہ چاروں حضرات انبیا میں بھی نمایاں ترین مقام پر فائز ہیں۔ دراصل اللہ تعالیٰ نے ان مقامات کا ذکر کر کے اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ وہ جلیل القدر ہستیاں انسان تھیں۔ ان کی ذات، ان کی شخصیت اور ان کی سیرت و کردار اس بات پر گواہ ہے کہ انسان کو اللہ تعالیٰ نے احسن تقویم، 'بہترین ساخت' پر پیدا کیا ہے۔

اس کے مقابلے میں دیگر مفسرین کی رائے یہ ہے کہ ان قسموں کے بعد آنے والی اگلی

تینوں آیتوں میں وہ مضمون بیان کیا گیا ہے، جس پر یہ آیات گواہی دیتی ہیں، یا یہ قسمیں اٹھائی گئی ہیں۔ ان چاروں مقامات پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی رحمت اور جزا و سزا کے وہ واقعات ظہور پذیر ہوئے، جو تاریخ میں معروف ہیں اور نمایاں مقام رکھتے ہیں۔

حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کو نو سو برس تک دعوت دی، جس کے نتیجے میں صرف چند لوگوں نے دعوت قبول کی۔ اس بات کی طرف قرآن مجید میں اس طرح سے اشارہ کیا گیا ہے: وَمَآ اٰمَنَ مَعَهٗٓ اِلَّا قَلِيْلٌ ۝ (ہود:۴۰) ''اور تھوڑے ہی لوگ تھے جو نوح علیہ السلام کے ساتھ ایمان لائے تھے۔'' یہاں اس بات کی طرف بھی اشارہ ہے کہ اللہ کے نبی جب بھی کسی قوم میں آتے ہیں تو وہ جزا و سزا کا پیغام لے کر آتے ہیں۔ اس کے بعد قوم کے سامنے دو ہی راہیں ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ وہ پیغمبر کی دعوت کو قبول کر لے اور اپنے آپ کو عذاب سے بچا لے اور دنیا کے اندر سر بلندی حاصل کر لے، یا پھر یہ کہ وہ پیغمبر کی بات کو جھٹلا دے، اس کو نہ مانے اور دنیا میں اس کے اوپر اللہ کا عذاب نازل ہو جائے۔ ہر پیغمبر کی زندگی میں یہ مقام ضرور آیا ہے کہ اگر قوم نے اسے جھٹلا دیا تو اس قوم کو برباد کر دیا گیا اور اہلِ ایمان کو بچا لیا گیا۔ اگر اس قوم نے ایمان قبول کر لیا تو اس نے نجات حاصل کر لی اور سرخ رو ہو گئی۔

نبی کریم ﷺ کی زندگی میں یہ مرحلہ اس وقت آیا جب مشرکین مکہ نے آپ ﷺ کو ہلاک کرنے کا فیصلہ کر لیا اور آپ ﷺ کے گھر کو گھیر لیا۔ مگر حضور ﷺ کامیابی کے ساتھ مکہ سے ہجرت فرما کر مدینہ پہنچ گئے۔ اس کے بعد غزوۂ بدر کے موقعے پر وہ سارے کفار اور سردار جو کہ آپ ﷺ کی ہلاکت کے درپے تھے ہلاک ہو گئے۔ گویا انبیا کے ساتھ یہ اللہ کا قانون اور سنت ہے۔ اس لحاظ سے کوہِ جودی حضرت نوح علیہ السلام کے حوالے سے اللہ کے قانونِ جزا و سزا کے نفاذ پر گواہ ہے۔

بعض لوگوں نے یہ بھی کہا ہے کہ حضرت آدمؑ بھی اسی مقام پر اترے تھے۔ تورات میں اس کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے۔ قرآن میں صرف اس بات کا ذکر ہے کہ جب ان کا لباس اترا تو انھوں نے درخت کے پتوں سے اپنے جسم کو ڈھانپا۔ مگر توراۃ میں اس بات کی صراحت کی گئی ہے کہ انھوں نے انجیر کے پتوں سے اپنے بدن کو ڈھانپا۔ انگریزی زبان میں Fig leaf کا محاورہ مشہور ہے، جس کے معنی یہ ہیں کہ جب کسی شخص کے پاس کچھ بھی نہ ہو، یا اخلاقی لحاظ سے وہ شخص دیوالیہ ہو جائے تو اس موقعے پر کہا جاتا ہے کہ انجیر کے پتوں سے اس شخص نے اپنے آپ کو ڈھانپا

ہوا ہے۔ یہ محاورہ بھی اس لیے بنایا گیا کہ حضرت آدم علیہ السلام کے پاس جب تن ڈھانپنے کے کے لیے کچھ نہ تھا تو انھوں نے انجیر کے پتوں سے اپنا بدن ڈھانپا تھا۔ دونوں صورتوں میں اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو اپنی نعمت سے نوازا۔ انھیں جنت میں قیام کی نعمت سے بھی نوازا اور نافرمانی پر نعمت واپس لینے کے بعد ان کی توبہ قبول کر کے دوبارہ انھیں اپنے انعام واکرام اور رحمت سے سرفراز کیا۔

کوہِ طور کا تو بہت ہی مشہور و معروف واقعہ ہے۔ اس واقعے میں جہاں حضرت موسیٰؑ کو نبوت ملی، وہاں وہ لوگ جو ظلم و ستم کی چکی میں پس رہے تھے، فرعون کے جبر و تشدد کا شکار تھے، جن کے بچوں کو ذبح کیا جاتا تھا اور عورتوں کو زندہ چھوڑ دیا جاتا تھا، ان کو اللہ تعالیٰ نے زمین پر غلبہ عطا فرمایا اور زمین کا وارث بنایا۔ جو مستضعفین تھے، کمزور تھے، ان کو اللہ نے مشرق و مغرب کا امام بنا دیا۔ بنی اسرائیل ایک طویل عرصے تک وہاں غالب اور حکمراں رہے۔ حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت سلیمان علیہ السلام کی حکومت مصر سے لے کر یمن تک پورے علاقے میں پھیلی ہوئی تھی۔ یہ وہ واقعہ ہے، جس پر کوہِ طور گواہ ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں بنی اسرائیل کو بلا کر اللہ تعالیٰ نے ان سے عہد لیا تھا۔ اس بات کا ذکر قرآن مجید میں بھی ہے اور تورات میں بھی۔ اللہ کی بندگی اور فرماں برداری اور اس کے پیغام کو پھیلانے اور پہنچانے کا عہد و پیمان اسی موقعے پر لیا گیا تھا۔

اَلْبَلَدُ الْاَمِیْنُ (شہرِ مکہ) کی تو پوری تاریخ ہی اللہ کی رحمت اور جزا و سزا پر شاہد اور گواہ ہے۔ بے شک سب سے پہلی عبادت گاہ جو انسانوں کے لیے تعمیر ہوئی وہ وہی ہے، جو مکہ میں واقع ہے۔ اس کو خیر و برکت دی گئی تھی اور تمام جہان والوں کے لیے مرکز ہدایت بنایا گیا تھا۔ یہ ابراہیم علیہ السلام کا مقام عبادت بھی ہے۔ خانہ کعبہ سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی امامت کا بھی ایک تعلق ہے۔ جب حضرت ابراہیمؑ کو اللہ تعالیٰ نے ہر قسم کی آزمائشوں سے گزارا اور پھر ساری انسانیت کا امام بنایا تو فرمایا:

وَ اِذِ ابْتَلٰۤی اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ ؕ قَالَ اِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ؕ (البقرۃ: ۱۲۴)

”یاد کرو کہ جب ابراہیم علیہ السلام کو اس کے رب نے چند باتوں میں آزمایا اور وہ ان سب میں پورا اتر گیا، تو اس نے کہا: میں تجھے سب لوگوں کا پیشوا بنانے والا ہوں۔“

اس موقعے پر اللہ تعالیٰ نے یہ قانون بھی واضح فرمادیا کہ امامت کا معاملہ اندھے کی ریوڑیاں بانٹنے کا سا معاملہ نہیں ہے کہ جو آجائے اس کے ہاتھ پر ریوڑیاں رکھ دی جائیں۔ اس انعام واکرام کا تعلق کسی رنگ ونسل یا قبیلے یا مخصوص امت سے بھی نہیں ہے۔ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ دعا کی کہ یہ منصب میری اولاد کو بھی ملے، اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

لَا يَنَالُ عَهْدِي الظّٰلِمِيْنَ ○ (البقرۃ:۱۲۴)

''میرا یہ وعدہ ظالموں سے متعلق نہیں ہے۔''

اس طرح اس قانون کو بھی واضح کر دیا کہ دنیا میں قوموں کے ساتھ معاملہ ان کے اعمال کی بنا پر ہوگا نہ کہ کسی رنگ ونسل یا کسی فرقے یا امت سے وابستگی کی بنا پر۔ گویا حضرت ابراہیم علیہ السلام جیسے پیغمبر کی اولاد بھی اگر شرک کا راستہ اختیار کرے گی تو وہ بھی اس انعام کی مستحق نہ ٹھیرے گی۔

اس طرح سے ان چاروں مقامات، یعنی حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی کا کوہِ جودی پر آکر ٹھیرنا، حضرت مسیح علیہ السلام کا واقعہ جب انھوں نے کوہِ زیتون پر اپنی قوم کو ہلاکت اور عذاب سے بچانے کی دعا کی، کوہِ طور کا واقعہ جہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو نبوت ملی اور البلد الامین یعنی شہر مکہ کا ذکر کر کے اللہ تعالیٰ نے انتہائی مختصر الفاظ میں پوری تاریخ کے نہایت اہم واقعات کو یکجا کر کے ایک خوب صورت فریم بنا دیا ہے۔ فریم کا لفظ میں نے سید قطب شہیدؒ سے مستعار لیا ہے، جو بہت موزوں لفظ ہے اور نہایت خوب صورتی سے مفہوم کو ادا کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی تعلیم کی تصویر کو اس فریم میں اس طرح سے فٹ کر دیا کہ آدمی محسوس کرتا ہے کہ واقعی اس فریم میں یہی تصویر مناسب ترین ہے۔ ان چار تاریخی حقائق اور واقعات پر مبنی فریم کو پیش کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان قسموں کے اٹھائے جانے کے بنیادی نکتے کو بیان کیا ہے۔

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ ○ (التین:۴)

''ہم نے انسان کو بہترین ساخت پر پیدا کیا۔''

تَقْوِيْم کے معنی ہیں سیدھا بنایا۔ قَامَ يَقُوْمُ کھڑا کرنے کے معنوں میں آتا ہے۔ اس سے قومہ نکلتا ہے، جس کے معنی سیدھا کرنا، سیدھا کر کے کھڑا کر دینا اور سیدھا بنانا کے ہیں۔ اس مفہوم میں یہ بات بھی شامل ہے کہ جس مقصد کے لیے کوئی چیز بنائی جائے، وہ اس کے لیے ٹھیک

ٹھیک مناسب ہو۔ چناں چہ قرآن مجید میں تسویہ کا لفظ آیا ہے۔ فَخَلَقَ فَسَوّٰی کا لفظ بھی تقریباً اسی معنی میں آیا ہے، جس کا مطلب ہے کہ انسان کو ٹھیک ٹھیک اسی مقصد کے لیے مناسب اور موزوں بنایا، جس مقصد کے لیے اسے پیدا کیا گیا تھا۔ وہ مقصد کیا ہے؟ اس کی نشان دہی سورۂ شمس کی درج ذیل آیات میں کی گئی ہے:

وَ نَفْسٍ وَّمَا سَوّٰهَا ۝ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَ تَقْوٰهَا ۝ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا ۝ وَ قَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا ۝ (الشمس: ۷-۱۰)

''اور نفس انسانی کی اور اس ذات کی قسم جس نے اسے ہموار کیا۔ پھر اس کی بدی اور اس کی پرہیزگاری اس پر الہام کر دی، یقیناً فلاح پا گیا وہ جس نے نفس کا تزکیہ کیا اور نامراد ہوا وہ جس نے اس کو دبا دیا۔''

اللہ تعالیٰ نے انسان اور دوسرے جانوروں کے درمیان سوائے اس فرق کے کہ وہ کھڑا ہو کر دو پاؤں پر چلتا ہے ـــــ بظاہر کوئی اور فرق نہیں رکھا۔ آنکھ، ناک، کان کا معاملہ ہو یا سننے اور بولنے کا، یا پھر خواہشات، بھوک، پیاس، جنس یا بقائے نسل کا مسئلہ ہو، ان سب میں بظاہر انسان اور دوسرے جانور ایک جیسے ہی لگتے ہیں۔ اگر کوئی فرق ہے تو وہ یہ کہ انسان کو نیکی اور بدی کی پہچان دی گئی ہے۔ پھر صرف نیکی اور بدی کی پہچان ہی نہیں دی گئی ہے بلکہ اس کے دل میں اس کے لیے میلان بھی رکھا ہے، نیکی کی طرف بھی میلان ہے اور بدی کی طرف بھی۔ اسی طرح ہر انسان کو نیکی اور بدی کا علم بھی دیا گیا ہے۔ اس علم میں جو کمی تھی، وہ اللہ تعالیٰ نے حضرت نوحؑ حضرت موسیٰ علیہ السلام، حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت ابراہیم علیہ السلام جیسے جلیل القدر انبیا اور نبی آخر الزماں حضرت محمد ﷺ، جن کا تذکرہ سورۂ ضحیٰ اور سورۂ الم نشرح میں آیا ہے، کو بھیج کر پوری کر دی۔

انسان کو احسن تقویم اس لحاظ سے بھی کہا گیا ہے کہ اسے اپنی ساخت اور افعال و کارکردگی کے لیے بہترین جسم عطا کیا گیا ہے۔ انسان کے مختلف اعضا کی ساخت اتنی پیچیدہ ہے کہ ان کی تفصیل بیان کرنے کے لیے گھنٹوں درکار ہیں۔ اس پر بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں۔ مگر یہاں اس بات کو بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ انسان کو جس مقصد اور آزمائش کے لیے پیدا کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ وہ اپنے ارادے اور اختیار سے نیکی کا راستہ اختیار کرے۔ اس سے یہ بات بھی ثابت ہوگئی کہ

اگر اسے ارادے اور اختیار کی آزادی نہ ہوگی تو پھر وہ جزاوسزا کا مستحق بھی نہ ہوگا۔ فرشتے جزا کے مستحق نہیں ہیں حالاں کہ وہ اللہ کے بڑے عبادت گزار ہیں۔ وہ جنت میں بھی نہیں جائیں گے۔ اسی طرح پہاڑ، سورج، چاند اور تارے جن کا ذکر ان سورتوں میں بار بار آرہا ہے وہ بھی اللہ کے بڑے فرماں بردار ہیں مگر وہ اپنے ارادے سے ایسا نہیں کرتے بلکہ محکوم و مجبور ہیں۔

صرف انسان خود مختار اور باارادہ ہستی ہے۔ اسی لیے وہ اس بات کا مستحق ہے کہ اگر وہ غلط راستے پر جائے، یا اپنے مقام سے نیچے گرے تو اس کے لیے نیچے گرنا ہی آسان کر دیا جائے اور وہ نیچے ہی گرتا چلا جائے۔ یہاں تک کہ اتنا نیچا گر جائے کہ کوئی اس سے نیچا نہ ہو۔ اس کے برعکس اگر وہ ایمان اور عملِ صالح کی راہ اختیار کرے تو پھر اس کو ایسا بدلہ دیا جائے کہ جو کبھی ختم نہ ہونے والا ہو۔ انسان کو یہ مقام صرف اس کے ارادے اور اختیار کی وجہ سے دیا گیا ہے۔ اس کی فطرت بھی ایسی بنائی گئی ہے کہ اس میں نیکی اور بدی کی طرف میلان پایا جاتا ہے۔ اسے نیکی اور بدی کی پہچان دی گئی ہے۔ اس بات کا ثبوت یہ ہے کہ کوئی انسان ظلم سے محبت نہیں کرتا۔ اگر کوئی کسی پر ظلم و زیادتی کا مرتکب ہوتا بھی ہے تو اس کی تاویل کرتا ہے کہ مجبور تھا یا اس کے علاوہ کوئی اور راستہ نہ تھا۔ اسی طرح کوئی بھی شخص کسی بھی برائی کا ارتکاب اس کی تعریف کر کے نہیں کرتا۔ ایسا شاذ و نادر ہی ہوتا ہے الاّ یہ کہ کوئی شخص فاسق ہو یا اس کا مزاج اس حد تک بگڑ چکا ہو۔ اس کے مقابلے میں نیکی، بھلائی اور عدل و انصاف سے محبت اور دوسروں سے ہم دردی و لگاؤ کا جذبہ ہر انسان میں فطری طور پر پایا جاتا ہے۔ اسی بنا پر فرمایا:

لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِيْٓ أَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ ○ (التین:۴)

”بے شک ہم نے انسان کو بہترین ساخت پر پیدا کیا۔“

اس بنا پر مفسرین کی رائے کے مطابق اگر یہ چاروں قسمیں انھی معنوں میں لی جائیں تو یقیناً انبیائے کرام احسن تقویم کا بہترین نمونہ ہیں۔

ثُمَّ رَدَدْنٰهُ أَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ ○ (التین:۵)

”پھر اسے الٹا پھیر کر ہم نے سب نیچوں سے نیچ کر دیا۔“

اس آیت میں ایک دوسرے پہلو کا تذکرہ کیا جا رہا ہے۔ عربی گرامر کے لحاظ سے اس کے بھی دو طرح کے معنی ہو سکتے ہیں۔ ایک معنی تو یہ ہو سکتے ہیں کہ اس کو ہم نے نیچوں سے نیچ گرا

دیا۔ شاہ عبدالقادرؒ نے انھی معنوں میں اس کا ترجمہ یوں کیا کہ "پھر پھینک دیا اس کو نیچوں سے نیچے"، یعنی جب آدمی نے اپنی فطرت سے جو احسن تقویم کی صورت میں اسے ودیعت کی گئی ہے، روگردانی کی تو نیچے گرا، اتنا نیچے گرا کہ اس سے نیچا کوئی اور مقام ہو ہی نہیں سکتا۔ یہ بات بڑی حد تک صحیح ہے کہ اگر انسان درندگی پر اتر آئے تو درندوں سے بھی آگے بڑھ جاتا ہے۔ اگر فحاشی پر اتر آئے تو بے حیائی میں جانوروں سے بھی نیچے سے گر جاتا ہے، اور اگر ظلم پر اتر آئے تو پھر خون خوار درندوں کو بھی مات دے دیتا ہے۔ اگر جنگ لڑتا ہے تو ایٹم بم، نائٹروجن بم، ہائیڈروجن بم جیسے مہلک ہتھیار بے دردی سے چلانے میں بھی اسے کوئی باک نہیں۔ گویا انسان اپنے مقام سے گرنے پر آئے تو اتنا گر جاتا ہے کہ اس کی کوئی مثال کسی دوسرے حیوان یا مخلوق کی نہیں ملتی۔

اس آیت کا ایک دوسرا پہلو عربی گرامر کی رو سے یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جو خود نیچے گرے تو پھر ہم اسے نیچے سے نیچے گراتے چلے جاتے ہیں۔ یہ مفہوم ٹھیک اسی مفہوم کی ادائیگی کرتا ہے جو قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا ۝ وَ قَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا ۝ (الشمس:۹،۱۰) "یقیناً فلاں پا گیا وہ جس نے نفس کا تزکیہ کیا اور نامراد ہوا وہ جس نے اس کو دبا دیا" یا سورۂ لیل کی آیات میں بیان کیا گیا ہے:

فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْيُسْرٰى ۝ وَ اَمَّا مَنْۢ بَخِلَ وَاسْتَغْنٰى ۝ وَ كَذَّبَ بِالْحُسْنٰى ۝ فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰى ۝ (الیل:۷-۱۰)

"جو بھلائی کا راستہ اختیار کرے، اس کے لیے ہم بھلائی کا راستہ ہی آسان کر دیتے ہیں اور جس نے بخل کیا اور (اپنے خدا سے) بے نیازی برتی اور بھلائی کو جھٹلایا، اس کو ہم برائی کے سخت راستے کے لیے سہولت دیں گے۔"

یہ مضمون بھی قرآن مجید کی بنیادی تعلیمات سے مناسبت رکھتا ہے۔

اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ ۝ (التین:۶)

"سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے، ان کے لیے کبھی ختم نہ ہونے والا اجر ہے۔"

ایمان اور عمل صالح قرآن مجید کی زبان میں ایک جامع اصطلاح ہے۔ نیکی کا کوئی عمل ایسا نہیں ہے جو اس اصطلاح کے دائرے سے باہر ہو۔ اس لیے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ یہاں ایمان اور عمل صالح کا محض ذکر کیا گیا ہے اور کسی عمل کی طرف نشان دہی نہیں کی گئی ہے۔ چوں کہ یہ مکی

سورتیں ہیں جو کہ مختصر ہیں اور ان کا مقصد چھوٹے الفاظ اور مختصر جملوں کے اندر بڑی بڑی باتوں اور مضامین کو ذہن میں اس طرح سے بٹھانا ہے کہ وہ یاد بھی رہیں اور انسان ان کو بہ آسانی دہراتا بھی رہے۔ اس لیے یہاں اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ جو لوگ ایمان لے آئیں اور نیک عمل کریں تو ان کے لیے ایسا اجر ہے، جو کبھی ختم ہونے والا نہیں ہے۔

قرآن مجید میں نیک اعمال پر اجر کا ذکر مختلف جگہوں پر مختلف انداز میں کیا گیا ہے۔ کسی جگہ اتنی تفصیل بیان کی گئی ہے کہ نام تک گنوائے ہیں۔ مختلف پھلوں کا تذکرہ ملتا ہے، جیسے انار، انگور اور کھجوریں وغیرہ۔ گوشت کا ذکر کیا گیا ہے کہ پرندوں کا گوشت ہوگا۔ محلات کا بھی ذکر ہے کہ بالا خانے ہوں گے۔ وہاں جس قسم کی صحبتیں ہوں گی اس کا بھی تفصیل سے ذکر کیا ہے اور نقشہ کھینچا گیا ہے۔ کہیں صرف ''اجرِ عظیم'' یا ''اجرِ کبیر'' کہنے پر اکتفا کیا گیا ہے۔ کہیں یہ کہا گیا ہے کہ وہاں ان کے لیے وہ سب کچھ ہے جو وہ چاہیں گے۔ یہ اتنی جامع بات ہے کہ اس میں ہر وہ چیز شامل ہے جو انسان چاہے۔ یہاں بھی ان آیات میں اجر کی تفصیل بیان نہیں کی گئی مگر اَجْرٌ غَیْرُ مَمْنُوْنٍ کہہ کر اجر کی عظمت، بڑائی اور انعام کی حیثیت اور اہمیت کو بہ خوبی اجاگر کر دیا گیا ہے۔

فَلَھُمْ اَجْرٌ غَیْرُ مَمْنُوْنٍ ۝ (التین:۶)
''ان کے لیے کبھی نہ ختم ہونے والا اجر ہے۔''

ان الفاظ میں اجر کے حوالے سے ایک بڑی حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ وہ حقیقت یہ ہے کہ زندگی کی ہر نعمت کے ساتھ یہ مرض لگا ہوا ہے کہ وہ ختم ہو جاتی ہے۔ اگر غور کیا جائے تو ان الفاظ میں اس طرف بھی اشارہ کر دیا گیا ہے کہ جو آدمی اَسْفَلَ سٰفِلِیْنَ یا نیچے گرنے کے راستے کی طرف جاتا ہے تو وہ اس چیز کے پیچھے جاتا ہے جو ختم ہونے والی ہے۔ اس کے مقابلے میں جو آدمی اوپر اٹھتا ہے اور اس چیز کو ترک کر کے جو دنیا میں ملنے والی ہے، ایمان اور عملِ صالح کی راہ اختیار کرتا ہے، وہ درحقیقت اس چیز کو چھوڑتا ہے جو ختم ہونے والی ہے۔ زندگی کے ان لمحات کے بدلے میں جو گھڑی کی سوئی کی ٹک ٹک یا حرکت کے ساتھ ختم ہو رہے ہیں، اسے وہ عمرِ جاوداں ملتی ہے جو کبھی ختم نہ ہوگی۔ قیامت کے روز موت کو ذبح کر دیا جائے گا، اس کے بعد آدمی کبھی نہیں مرے گا۔ وہاں اسے وہ انعام ملیں گے جو اس کی دسترس میں ہوں گے، آدمی ہاتھ بڑھائے اور انھیں حاصل کر لے۔ غرض وہ جو چاہے گا اسے مل جائے گا۔

یہاں اس بات کی طرف بھی اشارہ کر دیا گیا ہے جو شخص اپنی سرشت کو چھوڑ کر نیچے گرتا ہے وہ دراصل ان عارضی چیزوں کی طرف جاتا ہے جو ختم ہو جانے والی ہیں، جب کہ جو اجر اللہ کی طرف سے ملنے والا ہے وہ کبھی ختم ہونے والا نہیں ہے۔

اس کے بعد دو سوال اٹھائے گئے ہیں۔ یہ قرآن مجید کی تعلیم کا بہت عام اور موثر انداز ہے۔ اللہ تعالیٰ سوال کر کے اس چیز کو ذہن میں بٹھاتا ہے جو اس کے پیش نظر ہوتی ہے۔ قرآن مجید میں سوال و جواب کا یہ انداز جگہ جگہ نظر آتا ہے۔ بعض اوقات اللہ تعالیٰ خود ہی سوال کا جواب دیتا ہے اور بعض دفعہ جواب نہیں بھی دیتا۔ اس لیے کہ سوال کے اندر ہی جواب موجود ہوتا ہے۔ یہاں بھی اسی طرح کا سوال اٹھایا گیا ہے۔

فَمَا یُکَذِّبُکَ بَعْدُ بِالدِّیْنِ ○ (التین:۷)

''پس (اے نبیؐ) اس کے بعد کون جزا اور سزا کے معاملے میں تم کو جھٹلا سکتا ہے؟''

اس بات کی طرف اشارہ کیا جا رہا ہے کہ ان تمام حقائق کو جاننے کے بعد آخر کیا چیز ہے جو تم کو، یا آپ ﷺ کی اس بات کو جھٹلاتی ہے کہ جزا و سزا ہوگی، بدلہ ملے گا۔ کس سے یہ سوال ہو رہا ہے؟ قرآن مجید کے مطالعے کے دوران یہ بنیادی بات جاننے کی ضرورت ہوتی ہے کہ ان سوالات کا مخاطب کون ہے؟ یہاں اس بات کی طرف اشارہ نہیں کیا گیا کہ کس سے سوال کیا جا رہا ہے۔ اس لیے مختلف مفسرین نے اس حوالے سے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ اس کے مخاطب نبی کریم ﷺ ہیں کہ اتنے ٹھوس اور واضح دلائل کے باوجود آخر کیا چیز ہے جو لوگوں کو آپ ﷺ کی تکذیب یا جھٹلانے پر مجبور کرتی ہے کہ جس جزا و سزا کی دعوت لے کر آپ ﷺ کھڑے ہوئے ہیں وہ نہ ہوگی؟ تکذیب کے معنی ہیں جھٹلانا، یعنی کسی چیز کو حق اور سچ تسلیم کرنے کے بعد اس کو جھٹلانا اور کہنا کہ یہ سچ نہیں بلکہ جھوٹی ہے۔ یہاں مفسرین نے تکذیب کے لفظ کو ان معنوں میں بھی لیا ہے کہ کون سی چیز جھٹلانے پر ابھارتی یا آمادہ کرتی ہے، یعنی اتنے بیّن اور واضح دلائل و شواہد کے باوجود آخر کس چیز نے لوگوں کو نبی کریم ﷺ کی اس دعوت کو جھٹلانے پر مجبور کیا ہے؟

بعض لوگوں کی رائے میں اس کے مخاطب عام لوگ ہیں۔ ان سے سوال کیا گیا ہے کہ آخر کیا چیز ہے، جو تمھیں آخرت اور جزا و سزا کو جھٹلانے پر آمادہ یا مجبور کرتی ہے؟ ''کیا'' کا لفظ

بالعموم عربی زبان میں ان چیزوں کے لیے استعمال کیا جاتا ہے جو بے جان ہوں۔ یہاں اس کے معنی یہ ہوئے کہ کوئی دلیل ایسی نہیں ہے جو جزا وسزا کو جھٹلانے والی ہو۔ اگر ہے تو وہ انسان کی ضد ہے، اس کی خواہش ہے، دنیا کی طلب یا آباواجداد کی تقلید ہے۔ درحقیقت کیا کے لفظ کے ذریعے بڑے زوردار انداز میں اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ فی الواقع کوئی چیز یا دلیل ایسی نہیں ہے، جس کی بنیاد پر انسان اس حقیقت سے انکار کرے کہ اللہ تعالیٰ نیکی کا بدلہ اچھا اور برائی کا بدلہ برا دے گا۔ اس کے بعد دوسرا سوال اٹھایا گیا ہے:

اَلَیْسَ اللّٰہُ بِاَحْکَمِ الْحٰکِمِیْنَ ۝ (التین:۸)

"کیا اللہ سب حاکموں سے بڑا حاکم نہیں ہے۔"

حاکم کے معنی ہیں حکم دینے والا۔ حکم دینے والا وہی ہوگا، جس کے پاس اختیار بھی ہو۔ جس کے پاس اختیار، قدرت اور اقتدار نہ ہو وہ حکم نہیں دے سکتا۔ اس لیے کہ اس کا حکم مانا نہیں جائے گا۔ یہاں لفظ اَحْکَمُ الْحَاکِمِیْنَ استعمال کیا گیا ہے، جس سے مراد وہ ہستی ہے، جس کے پاس تمام اختیارات، تمام اقتدار اور ہر طرح کی قدرت ہو۔ وہ جو کام کرنا چاہیے، کرسکتا ہو، کوئی اسے عاجز کرنے والا نہ ہو۔

حکم کا لفظ عربی زبان میں ح، ک، م سے مل کر بنا ہے، جس کے معنی فرمان کے ہیں۔ اسی سے حکمت کا لفظ بھی نکلا ہے، جس کے معنی عقل مندی اور دانش کے ہیں۔ اسی سے لفظ محکم نکلا ہے، جس سے مراد ایسی چیز ہے جو مستحکم ہو اور مضبوطی کے ساتھ جمی ہوئی ہو۔ یہاں اللہ تعالیٰ کی یہ صفت ان معنوں پر محیط ہے کہ سارے داناؤں میں وہ سب سے بڑا دانا ہے۔ وہ ایسی نادانی کا کام نہیں کرسکتا کہ انسان جیسی احسن تقویم مخلوق کو پیدا کرے، اسے اختیار اور ارادہ دے، نیکی اور بدی کی آزمائش میں ڈالے، نیکی کو اس کے لیے محبوب اور بدی کو ناپسندیدہ بنادے، اور اس سب کے بعد اگر ایک شخص نیکی کرے اور دوسرا بدی کا مرتکب ہو تو وہ دونوں میں کوئی فرق نہ کرے، اور کوئی بدلہ نہ دیا جائے۔ پھر وہ ذاتِ باری تعالیٰ اس اختیار سے بھی محروم نہ ہو کہ اگر انسان مرنے کے بعد مٹی میں گل سڑ جائے اور مٹی ہو جائے تو وہ اسے دوبارہ زندہ کر کے کھڑا کردے، جب کہ وہ حکم دینے والوں میں اور اختیار رکھنے والوں میں، سب سے بڑا حکم دینے والا اور سب سے زیادہ اختیار وقدرت رکھنے والا ہو۔

اس لحاظ سے ان دونوں مفاہیم اور دونوں سوالات کی روشنی میں اللہ تعالیٰ کی یہ صفت خود اس بات کو واضح کر رہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اس کائنات میں جزا اور سزا کا قانون لازماً نافذ ہوگا۔ برے اعمال کا بدلہ برا ملے گا اور اچھے اعمال کا بدلہ اچھا۔ یہ اصول قوموں پر بھی لاگو ہوتا ہے اور افراد پر بھی۔ قوموں کو اپنے اعمال کا بدلہ دنیا میں ہی مل جاتا ہے۔ اس کی مثال حضرت نوح ؑ حضرت موسیٰ ؑ اور حضرت عیسیٰ ؑ کی اقوام ہیں اور خود اہلِ مکہ بھی اس کی مثال ہیں۔ جہاں تک افراد کا معاملہ ہے تو ان کو بعض اعمال کا بدلہ دنیا میں مل جاتا ہے اور دیگر اعمال کا بدلہ آخرت میں ملے گا۔ اس لیے کہ اَجۡرٌ غَیۡرُ مَمۡنُوۡنٍ ۝ (کبھی نہ ختم ہونے والا اجر) کا دنیا میں عمل پذیر ہونا ممکن نہیں۔ یہ اجر صرف اسی دنیا میں مل سکتا ہے جہاں زندگی کبھی ختم نہ ہوگی۔

یہاں اس بات کی طرف بھی اشارہ ہے کہ انسان کی احسن تقویم پر تخلیق اللہ کی طرف سے ایک بڑی رحمت ہے۔ اس کو متوازن جسم دیا، عقل، فہم اور سمجھ داری، بات کرنے کی استعداد، سلیقہ اور ڈھب سکھایا۔ اللہ کی ان تمام عنایات کا بھی یہی تقاضا ہے کہ نیکی کا بدلہ نیک ملے اور بدی کا بدلہ بد۔ چنانچہ جہاں قوموں کے بارے میں اللہ نے فرمایا کہ اللہ نے ظالم قوموں کی جڑ کاٹ دی، وہاں اپنی مہربانی کا تذکرہ بھی کیا ہے:

فَاَنۡجَیۡنٰہُ وَالَّذِیۡنَ مَعَہٗ بِرَحۡمَۃٍ مِّنَّا وَقَطَعۡنَا دَابِرَ الَّذِیۡنَ کَذَّبُوۡا بِاٰیٰتِنَا وَ مَا کَانُوۡا مُؤۡمِنِیۡنَ ۝ (الأعراف:۷۲)

"آخر کار ہم نے اپنی مہربانی سے ہود علیہ السلام اور اس کے ساتھیوں کو بچا لیا اور ان لوگوں کی جڑ کاٹ دی جو ہماری آیات کو جھٹلا چکے تھے اور ایمان لانے والے نہ تھے۔"

اور جہاں آخرت کا ذکر فرمایا، وہاں بھی یہی فرمایا:

کَتَبَ عَلٰی نَفۡسِہِ الرَّحۡمَۃَ ؕ لَیَجۡمَعَنَّکُمۡ اِلٰی یَوۡمِ الۡقِیٰمَۃِ لَا رَیۡبَ فِیۡہِ ؕ (الأنعام:۱۲)

"اس نے رحم و کرم کا شیوہ اپنے اوپر لازم کر لیا ہے (اسی لیے وہ نافرمانیوں اور سرکشیوں پر تمھیں جلدی سے نہیں پکڑ لیتا) قیامت کے روز وہ تم سب کو ضرور جمع کرے گا، یہ بالکل ایک غیر مشتبہ حقیقت ہے۔"

چناں چہ وہ حاکم سب سے بڑا حاکم کیسے ہو سکتا ہے، جو انصاف نہ کر سکے اور اچھائی اور

برائی کرنے والوں کے درمیان فرق نہ کر سکے۔ لہٰذا انسان کے احسن تقویم پر پیدا ہونے کا لازمی تقاضا ہے کہ جزا و سزا کا قانون نافذ ہو۔

اگر غور کیا جائے تو گزشتہ سورتوں کا یہ پورا سلسلۂ کلام بالکل ایک ہی ربط اور تسلسل میں چل رہا ہے۔ سورۂ شمس میں انسان کا مقام واضح کیا گیا اور اسے نیکی اور بدی کی پہچان دی گئی۔ سورۂ لیل میں دنیاوی نیک اعمال اور برے اعمال کا ذکر فرمایا اور ان کی جزا و سزا کا ذکر کیا۔ سورۂ ضحیٰ میں اس آخری پیغمبر ﷺ کا ذکر کیا جو اسی دعوت کو لے کر آیا ہے، جس کی اسے ہدایت دی گئی اور اسے بڑا بھاری بوجھ قرار دیا گیا اور پھر اسے بشارت دی:

وَلَسَوۡفَ يُعۡطِيۡكَ رَبُّكَ فَتَرۡضٰىؕ ○ (اَلضُّحٰی:۵)

''اور عن قریب تمھارا رب تمھیں اتنا دے گا کہ تم خوش ہو جاؤ گے۔''

جو کچھ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کو عطا کیا، سورۂ الم نشرح میں اس کے چند نمونے پیش فرمائے، یعنی ان کا رفعِ ذکر کیا، بوجھ ہلکا کر دیا اور مشکلات سے گزرنے کے بعد دعوت کا کام ان کے لیے آسان کر دیا۔ یہ سب تعلیمات بھی جزا و سزا کے نظام پر دلالت کرتی ہیں۔

جب خدا کا آخری پیغمبر آ گیا تو پھر اہلِ مکہ اور دنیا کے سامنے خدا کا آخری معیار جزا و سزا بھی آ گیا۔ یہ امت بھی اسی معیار کو لیے دنیا کے سامنے آئی ہے اور قیامت تک یہ معیار دنیا کے سامنے رہے گا۔ انسان جس پر اللہ کی خصوصی رحمت ہے کہ اللہ نے اس پر ابدی نعمتوں، راحتوں اور جنت کا دروازہ کھولا، وہ اس بات کا بھی مستحق ہے کہ اسے سیدھی راہ دکھائی جائے۔ جب انسان کو احسن تقویم میں پیدا کیا گیا ہے تو اسے اس سانچے پر قائم رکھنے کا بھی لازمی تقاضا ہے کہ اسے ہدایت دی جائے۔ اس سورہ کے فوراً بعد سورۂ علق آ جاتی ہے، جس میں واضح طور پر ہر انسان کو ہدایت کی راہ دکھائی گئی ہے جو پہلی وحی کی صورت میں نبی کریمؐ پر نازل ہوئی تھی۔

ہمارے زمانے کے لوگوں کے لیے اس سورہ میں واضح طور پر ایک سبق دیا گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ نیکی اور بدی کو سب مانتے اور تسلیم کرتے ہیں۔ کسی بھی مسلمان سے اگر پوچھا جائے کہ رشوت لینا، شراب پینا اور یتیم پر ظلم کرنا کیسا ہے؟ تو سب یہی کہیں گے کہ بہت بری بات ہے۔ حکمراں، علما اور عوام سب اسی بات کا اقرار کرتے ہیں۔ کوئی نہیں کہتا کہ رشوت لینا، جھوٹ بولنا، بے ایمانی کرنا، ظلم کرنا، خون بہانا اور کسی کا مال ناجائز کھانا اچھی بات اور جائز ہیں۔ لیکن اس

کے باوجود وہی کام کرتے ہیں، جن کو برا کہتے ہیں، اور وہ کام نہیں کرتے جن کو اچھا سمجھتے ہیں۔اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ جزاوسزا کے عقیدے پران کا ایمان ویقین کمزور ہو چکا ہے۔

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے جہاں کہیں بنی اسرائیل سے خطاب کیا اور ان کے اعمالِ بدان کے سامنے نمایاں کیے وہاں ان کو اسی بات کی دعوت دی کہ وہ آخرت میں اللہ کے سامنے پیش ہونے، جزاوسزا کے تصور، اور اس دن کا خیال رکھیں، جس دن کوئی کسی کے کام نہیں آئے گا۔اس دن کی فکر کریں اور اس کی تیاری کریں۔اس تصور کے بغیر یہ ممکن نہیں ہے کہ لوگوں میں احساسِ ذمے داری اجاگر ہو، چاہے انھیں کتنے ہی درس، وعظ ونصیحت اور تلقین کی جائے یا تفاسیر کے حوالے دیے جائیں اور ٹھوس و بین دلائل وشواہد پیش کر دیے جائیں۔سب لوگ ان باتوں کی سچائی کو تسلیم ضرور کرتے ہیں مگر عمل پیرا نہیں ہوتے۔اس لیے کہ جزاوسزا کے تصور پر ان کا یقین و اعتقاد کمزور ہو چکا ہوتا ہے۔یہ سورہ اسلام کے اسی تصورِ جزاوسزا کا درس دے رہی ہے۔اس کے بعد قرآن مجید کا نزول، انسان کی تخلیق اور انسان کو گمراہ کرنے والی چیزیں، جیسے عریانی وفحاشی، کبر اور استغنیٰ کا ذکر اگلی سورہ میں کیا گیا اور دیگر ہدایات دی گئی ہیں۔درحقیقت اسلام کا تصور جزاوسزا ہی اس کی بنیادی اور اساس ہے۔اس سورہ میں اسی بنیاد کی نشان دہی کی گئی ہے۔

☙❧

سورۃ العلق

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○

اِقۡرَاۡ بِاسۡمِ رَبِّكَ الَّذِیۡ خَلَقَ ۚ﴿۱﴾ خَلَقَ الۡاِنۡسَانَ مِنۡ عَلَقٍ ۚ﴿۲﴾ اِقۡرَاۡ وَرَبُّكَ الۡاَكۡرَمُ ۙ﴿۳﴾ الَّذِیۡ عَلَّمَ بِالۡقَلَمِ ۙ﴿۴﴾ عَلَّمَ الۡاِنۡسَانَ مَا لَمۡ یَعۡلَمۡ ؕ﴿۵﴾ كَلَّاۤ اِنَّ الۡاِنۡسَانَ لَیَطۡغٰۤی ۙ﴿۶﴾ اَنۡ رَّاٰهُ اسۡتَغۡنٰی ؕ﴿۷﴾ اِنَّ اِلٰی رَبِّكَ الرُّجۡعٰی ؕ﴿۸﴾ اَرَءَیۡتَ الَّذِیۡ یَنۡهٰی ۙ﴿۹﴾ عَبۡدًا اِذَا صَلّٰی ؕ﴿۱۰﴾ اَرَءَیۡتَ اِنۡ كَانَ عَلَی الۡهُدٰۤی ۙ﴿۱۱﴾ اَوۡ اَمَرَ بِالتَّقۡوٰی ؕ﴿۱۲﴾ اَرَءَیۡتَ اِنۡ كَذَّبَ وَتَوَلّٰی ؕ﴿۱۳﴾ اَلَمۡ یَعۡلَمۡ بِاَنَّ اللّٰهَ یَرٰی ؕ﴿۱۴﴾ كَلَّا لَئِنۡ لَّمۡ یَنۡتَهِ ۬ۙ لَنَسۡفَعًۢا بِالنَّاصِیَةِ ۙ﴿۱۵﴾ نَاصِیَةٍ كَاذِبَةٍ خَاطِئَةٍ ۚ﴿۱۶﴾ فَلۡیَدۡعُ نَادِیَهٗ ۙ﴿۱۷﴾ سَنَدۡعُ الزَّبَانِیَةَ ۙ﴿۱۸﴾ كَلَّا ؕ لَا تُطِعۡهُ وَاسۡجُدۡ وَاقۡتَرِبۡ ﴿۱۹﴾

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔

پڑھو (اے نبیؐ) اپنے ربّ کے نام کے ساتھ، جس نے پیدا کیا، جمے ہوئے خون کے ایک لوتھڑے سے انسان کی تخلیق کی۔ پڑھو، اور تمھارا رب بڑا کریم ہے، جس نے قلم کے ذریعے سے علم سکھایا، انسان کو وہ علم دیا جسے وہ نہ جانتا تھا۔ ہرگز نہیں، انسان سرکشی کرتا ہے اس بنا پر کہ وہ اپنے آپ کو بے نیاز دیکھتا ہے (حالاں کہ) پلٹنا یقیناً تیرے رب ہی کی طرف ہے۔ تم نے دیکھا اس شخص کو جو ایک بندے کو منع کرتا ہے جب کہ وہ نماز پڑھتا ہو؟ تمھارا کیا خیال ہے اگر (وہ بندہ) راہِ راست پر ہو یا پرہیزگاری کی تلقین

کرتا ہو؟ تمھارا کیا خیال ہے اگر (یہ منع کرنے والا شخص حق کو) جھٹلاتا اور منہ موڑتا ہو؟ کیا وہ نہیں جانتا کہ اللہ دیکھ رہا ہے؟ ہرگز نہیں، اگر وہ باز نہ آیا تو ہم اس کی پیشانی کے بال پکڑ کر کھینچیں گے، اس پیشانی کو جو جھوٹی اور سخت خطا کار ہے۔ وہ بلالے اپنے حامیوں کی ٹولی کو، ہم بھی عذاب کے فرشتوں کو بلالیں گے۔ ہرگز نہیں، اس کی بات نہ مانو اور سجدہ کرو اور (اپنے رب کا) قرب حاصل کرو۔

تشریح:

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ ۝ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۝ اِقْرَاْ وَ رَبُّکَ الْاَکْرَمُ ۝ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۝ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ ۝

(العلق:۱-۵)

”پڑھو (اے نبیؐ) اپنے رب کے نام کے ساتھ، جس نے پیدا کیا، جمے ہوئے خون کے ایک لوتھڑے سے انسان کی تخلیق کی۔ پڑھو، اور تمھارا رب بڑا کریم ہے، جس نے قلم کے ذریعے سے علم سکھایا، انسان کو وہ علم دیا، جسے وہ نہ جانتا تھا۔“[1]

کَلَّآ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَیَطْغٰٓی ۝ اَنْ رَّاٰهُ اسْتَغْنٰی ۝ (العلق:۶،۷)

”ہرگز نہیں، انسان سرکشی کرتا ہے اس بنا پر کہ وہ اپنے آپ کو بے نیاز دیکھتا ہے۔“

مغربی تہذیب کی ساری بنیاد دراصل اسی ایک خیال کے اوپر مبنی ہے کہ اُس نے اپنے آپ کو ”مستغنی“ سمجھا ہے۔ استغنیٰ ہی ہدایت سے بے نیازی کا سبب ہے اور پھر مال اُس کے اندر شامل ہے۔ قرآن مجید نے کئی جگہ اس بات کا ذکر کیا ہے کہ جب انسان کو نعمتیں ملتی ہیں، کشادگی حاصل ہوتی ہے، رزق اُبلنے لگتا ہے، کاروبار چلتے ہیں اور معاشی خوش حالی آتی ہے، دنیا میں غلبہ حاصل ہوتا ہے، بڑی بڑی پرشکوہ عمارتیں تعمیر ہوتی ہیں تو آدمی کہتا ہے: اِنَّمَآ اُوْتِیْتُهٗ عَلٰی عِلْمٍ (الزمر:۴۹) ”یہ تو مجھے علم کی بنا پر دیا گیا ہے۔“ دراصل یہ میرا اپنا علم، سائنس، ٹکنالوجی، مہارت اور قوت ہے، جس کے بل بوتے پر میں نے یہ سب کچھ حاصل کیا ہے۔

سورۂ کہف میں قصہ بیان ہوا ہے کہ دو آدمی ایک باغ میں داخل ہوتے ہیں۔ ایک آدمی کی معاشی حالت بڑی اچھی ہے، باغ ہیں، کھیتیاں ہیں اور کھیتوں میں نہریں بہتی ہیں، زیادہ طاقت

---

[1] آیات ۱-۵ کا درس بوجوہ ریکارڈ نہ ہو سکا (ادارہ)

اور نفری رکھتا ہے، جب کہ دوسرا آدمی مفلس ہے۔ امیر آدمی کہتا ہے کہ یہ سب میں نے کمایا ہے، میری محنت کا نتیجہ ہے لیکن دوسرا آدمی جو مردِ مومن ہے، اس سے کہتا ہے کہ تو نے شرک کیا ہے:

وَ لَوْلَآ اِذْ دَخَلْتَ جَنَّتَکَ قُلْتَ مَاشَآءَ اللّٰهُ ۙ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ

(الکہف:۳۹)

"اور جب تو اپنی جنت میں داخل ہو رہا تھا تو اس وقت تیری زبان سے یہ کیوں نہ نکلا کہ مَا شَآءَ اللّٰهُ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ۔"

یعنی جو اللہ نے چاہا وہ ہوا اور کوئی قوت کسی کے پاس اللہ کے ماسوا نہیں ہے تو یہ درست بات ہوتی۔ یہ دراصل استغنیٰ ہے۔

اس سورہ میں دراصل وحی سے بے نیازی، لاپروائی اور بغاوت برتنے سے جو خرابی پیدا ہوتی ہے اس کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ اس لیے فرمایا گیا کہ وہ طغیانی اختیار کرتا ہے، حدود سے نکلتا ہے، اور حدود سے وہی نکلتا ہے جو اللہ کی ہدایت سے بے نیاز ہو جائے اور اپنے آپ کو مستغنی سمجھتا ہو۔

اِنَّ اِلٰی رَبِّکَ الرُّجْعٰیؕ (العلق:۸)

"پلٹنا یقیناً تیرے رب ہی کی طرف ہے۔"

اپنے رب کی طرف لوٹنے سے کیا مراد ہے؟ یہ خطاب کس سے ہے؟ قرآن کو سمجھنے میں یہ سوال بڑا اہم ہے کہ بات کس سے کہی جا رہی ہے۔ قرآن کا اندازِ بیان، خطاب اور تقریر کا سا ہے، کتاب کا اندازِ بیان نہیں اور اس کے مخاطبین بہت سارے ہوا کرتے تھے۔ کبھی حضورؐ سے خطاب ہوتا تھا، کبھی آپؐ کے ساتھیوں سے خطاب ہوتا تھا اور کبھی مخالفین سے خطاب ہوتا تھا۔ اس لیے اس میں گنجایش ہوتی ہے کہ خطاب کئی طرف ہو سکے۔

یہاں یہ امکان بھی ہو سکتا ہے کہ رب کی طرف سے انسان سے خطاب ہو۔ انسان ہی کا ذکر ابتدا سے چل رہا ہے۔ انسان کو پیدا کیا، انسان کو اسی نے تعلیم دی، انسان ہی ہے جو سرکشی اختیار کرتا ہے، انسان ہی اپنے آپ کو مستغنی اور بے نیاز سمجھتا ہے، اسی سے کہا جا رہا ہے کہ اِنَّ اِلٰی رَبِّکَ الرُّجْعٰیؕ (العلق:۸) "تجھے اپنے رب ہی کی طرف لوٹنا ہے۔"

یہ مفہوم بھی ہو سکتا ہے کہ جس بندے پر کلام نازل ہو رہا ہے، یعنی حضورؐ سے خطاب ہو کہ ان سب کو بالآخر تمھارے رب کی طرف ہی لوٹنا ہے۔ اگر دونوں مطالب کو مان لیا

جائے تو دونوں کا اپنا اپنا الگ سیاق ہے۔ ایک طرف تو مخالفین ہیں جو سرکشی پر تلے ہوئے ہیں اور اپنے آپ کو اللہ کی ہدایت سے بے نیاز سمجھتے ہیں اور جن کی مخالفت اپنے عروج پر پہنچی ہوئی ہے۔ اگر اس جملے میں حضورﷺ سے خطاب ہے تو اس میں آپ ﷺ کے لیے تسلی اور حوصلے کا سامان ہے، کہ یہ جو سرکشی اور مخالفت پر تلے بیٹھے ہیں، بالآخر ان کو فیصلے کے لیے اللہ ہی کی طرف لوٹنا ہے۔

اگر مخالفین سے خطاب ہے، تو یہ ایک تادیب ہے اور ایک ڈانٹ ہے کہ تم نے جو سرکشی پر کمر باندھ رکھی ہے اور ہدایت کو رد کیا ہے، تو تمھیں اس سے غافل نہیں ہونا چاہیے کہ جس کی طرف سے یہ ہدایت دی گئی ہے، جس نے اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ o سے اپنی ہدایت کا آغاز کیا ہے، بالآخر تمھیں اپنی ساری سرکشی، ساری طغیانی اور سارے فساد اور ظلم کا حساب اپنے رب کے پاس جا کر دینا ہوگا۔

رجعیٰ کے معنی لوٹنے کے ہیں۔ یہاں پر اس بات کا کوئی ذکر نہیں ہے کہ کہاں لوٹنا ہے؟ کیا اس سے مراد آخرت میں لوٹنا ہے یا دنیا میں؟ پھر اس کے معنی یہ ہوں گے کہ سارے کام تو بالآخر اپنے فیصلے کے لیے اللہ کی طرف لوٹتے ہیں:

لَہٗ مُلْکُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط وَ اِلَی اللّٰہِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ o (الحدید:۵)

”وہی زمین اور آسمانوں کی بادشاہی کا مالک ہے اور تمام معاملات فیصلے کے لیے اسی کی طرف رجوع کیے جاتے ہیں۔“

قرآن مجید میں اس بات کو ایک دوسرے مقام پر یوں بیان کیا گیا ہے کہ سارے کام اپنے فیصلے کے لیے بالآخر اللہ کی طرف لوٹتے ہیں، اور پھر یہ بھی کہ سب چیزوں کی اصل تو اللہ ہی ہے۔ اگر ہر چیز کو فنا ہونا ہے، ہر چیز کو ہلاک اور تباہ ہونا ہے اور بالآخر ہر چیز کو اللہ ہی کی طرف لوٹنا ہے تو انسان پھر کس چیز پر ناز کرتا ہے اور سمجھتا ہے کہ یہ سب میرے زورِ بازو کی کمائی ہے۔

ہدایت کی جو راہ پہلی پانچ آیات میں دکھائی گئی ہے، اس ہدایت سے انحراف کے نتیجے میں بگاڑ اور گمراہی کے جو راستے نکلتے ہیں اور اُس کے انسانی فطرت میں اور معاشرے کے اندر جو اسباب ہیں، اُن سب کو اس سورہ کے اندر چھوٹے چھوٹے جملوں میں سمیٹ دیا گیا ہے۔

اَرَءَیْتَ الَّذِیْ یَنْھٰی o عَبْدًا اِذَا صَلّٰی o (العلق:۹،۱۰)

”تم نے دیکھا اس شخص کو جو ایک بندے کو منع کرتا ہے، جب کہ وہ نماز پڑھتا ہو؟“

جو آیات یہاں سے شروع ہوتی ہیں اور آخر سورہ تک چلتی ہیں، یا بعض کے نزدیک کَلَّآ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَیَطْغٰٓیۙ (العلق:٦) سے شروع ہوتی ہیں، مفسرین نے ان کی شانِ نزول یہ بیان کی ہے کہ ابوجہل نے یہ گستاخانہ دعویٰ کیا کہ اگر حضور ﷺ نے خانہ کعبہ کے سامنے نماز پڑھی تو میں آپ ﷺ کی گردن پر پاؤں رکھ دوں گا اور اُس کو توڑ دوں گا اور بھی بہت ساری دھمکیاں دیں۔ یہ اُس کی طرف اشارہ ہے۔

شانِ نزول کے بارے میں بہترین بات وہ ہے جو شاہ ولی اللہ علیہ الرحمہ اور علامہ جلال الدین سیوطیؒ جیسے بڑے مفسرین نے کہی ہے۔ شانِ نزول کا مفہوم یہ نہیں ہوتا کہ یہ آیت اُس واقعے کے موقع پر یا اُس شخص کے لیے نازل ہوئی ہے۔ اَلَّذِیْ سے مراد کوئی خاص شخص نہیں ہے، یہ عام ہے۔ اس سے مراد ابوجہل یا ابولہب، یا ولید بن مغیرہ ہے یا کوئی بھی ہوسکتا ہے۔

شاہ ولی اللہؒ نے فرمایا کہ قرآن مجید کی تو ایک ہی شان نزول ہے وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ کو ابد تک سارے انسانوں کو ہدایت دینا مقصود تھا۔ گمراہی کی جتنی بھی شکلیں آخری زمانے تک آنے والی ہیں، اُن سب کا رد مقصود ہے۔ لہٰذا ہر زمانے میں ہر دور میں وہ اَلَّذِیْ پایا جائے گا، جس کا ذکر قرآن مجید کر رہا ہے۔ وہ بھلائیاں بھی پائی جائیں گی جن کی طرف قرآن مجید اشارہ کر رہا ہے، اور وہ برائیاں بھی پائی جائیں گی جن کا ذکر قرآن مجید میں ہے۔

ہوسکتا ہے کہ ابوجہل نے بھی ایسا کہا ہو لیکن یہ بات ہر زمانے کے لیے ہے اور ہر شخص کے لیے ہے۔ عَبْدًا اگر اُسی زمانے کے لیے ہے اور اس میں حضور ﷺ کو ایک بندہ کہہ کر جو ذکر کیا گیا ہے، یہ دراصل حضور ﷺ کی شان اور ان کی عظمت کے لیے ہے۔ عربی زبان میں ایک طریقہ یہ ہے کہ کسی خاص شخص کا ذکر مقصود ہو اور پھر اُس کا ذکر عام انداز میں کیا جاے تو اَلْعَبْدُ کہا جاتا ہے اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ کسی ایک بندے کا ذکر ہے۔ عَبْدًا کے معنی ایک بندے کے ہیں۔ یہ ذکر دراصل کسی بندے کی عظمت اور اس کی شان کے اظہار کے لیے کیا جاتا ہے۔

اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ نماز جو اللہ سے بندگی کا اظہار ہے، جس کے معنی دراصل یہ ہیں کہ پوری زندگی میں اللہ کی بندگی کا جو نمونہ ہے وہ اپنایا جائے جو کہ دین کی بنیاد ہے تو جو بندہ بھی اللہ کی بندگی پوری زندگی میں اختیار کرے اور اُسے جو بھی روکے تو اُس کے اوپر اِس آیت کا اطلاق ہوتا ہے۔ علامہ رازیؒ، علامہ آلوسیؒ اور بہت سارے مفسرین نے اِس پر کلام کیا ہے کہ یہ

ایک شخص کے بارے میں نہیں ہے بلکہ ہر اس شخص کے بارے میں ہے جو ایسا کرے۔ نماز کا مطلب صرف نماز نہیں ہے بلکہ نماز اور نماز کی دعوت مراد ہے۔ اس لیے کہ نماز دراصل ایک دعوت ہے اُس زندگی کی طرف جو اللہ کی بندگی کی زندگی ہے، اور خیال میں، سوچ میں، عمل میں، جو بھی بندگی کے اس راستے کو اختیار کرے، اس کو اِس راستے سے روکنا، اِس کی یہاں مذمت کی جارہی ہے۔

روکنے سے مراد محض زبردستی بندگی سے روکنا نہیں ہے بلکہ روکنے کے اندر یہ بات بھی شامل ہے کہ آدمی یہ کہے کہ اپنی زندگی گزارنے کے لیے ہم خود ہی کافی ہیں، خدا کی ہدایت کی کیا ضرورت ہے، یہ بھی یَنْھٰی کی تعریف میں آئے گا۔ لہٰذا جس طریقے سے بھی زندگی کے کسی بھی دائرے میں، سوچ میں، فکر میں، عمل میں، اللہ کی بندگی کے راستے سے روکا جائے تو یہ اِس آیت کی تعریف میں آئے گا۔

قرآن مجید کے اندر جہاں فساد اور ظلم کا ذکر ہے وہاں پر ایک اور بہت بڑے جرم کا بھی ذکر ہے، جس کو صَدٌّ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ کہا گیا ہے، یعنی اللہ کے راستے میں رکاوٹ پیدا کرنا۔

اَلَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَ صَدُّوْا عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ زِدْنٰھُمْ عَذَابًا فَوْقَ الْعَذَابِ بِمَا کَانُوْا یُفْسِدُوْنَ ؀ (النحل:۸۸)

”جن لوگوں نے خود کفر کی راہ اختیار کی اور دوسروں کو اللہ کی راہ سے روکا انھیں ہم عذاب پر عذاب دیں گے، اس فساد کے بدلے جو وہ دنیا میں برپا کرتے رہے۔“

جو لوگ اللہ کے راستے میں چلنا چاہیں اُن کو گمراہ کرنا خواہ مال کی کشش سے یا خیالات کی کشش سے، فلسفۂ زندگی سے یا علم کے ذریعے، یا ذرائع ابلاغ سے، یہ سب بندگی میں رکاوٹ ڈالنے کے مترادف ہے۔

نماز چوں کہ بدرجۂ اولیٰ ساری زندگی اللہ کی بندگی میں گزارنے کی علامت ہے، اس لیے مسجدوں سے روکنا، مسجدوں کے دروازے بند کرنا اور مسجدوں میں فرقہ واریت پھیلانا کہ دوسرے لوگ یہاں نماز نہ پڑھیں، یہ سب قرآن مجید کی رو سے بہت بڑے اور بدترین گناہ ہیں:

وَ مَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰہِ اَنْ یُّذْکَرَ فِیْھَا اسْمُہٗ وَ سَعٰی فِیْ خَرَابِھَا ط (البقرۃ:۱۱۴)

”اور اس شخص سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا، جو اللہ کے معبدوں میں اس کے نام کی یاد سے روکے اور ان کی ویرانی کے درپے ہو؟“

حرم میں جانے سے روکنا بھی اسی لیے بہت بڑا گناہ اور جرم قرار دیا گیا ہے۔ بہت سے مفسرین کے نزدیک، جو حرم کے طواف اور عمرے کے لیے آئے، اس کو روکنا اِسی تعریف میں آتا ہے۔ اِس لیے بہت سے لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ اس پر پابندیاں عاید کرنا، یہ بھی شرعاً جائز نہیں ہے۔ اگر کوئی ایئر پورٹ پر پہنچ جائے کہ مجھے عمرہ کرنا ہے تو قرآن مجید اور نبی کریم ﷺ کی تعلیمات کی رو سے اُسے روکا نہیں جاسکتا، اس کو انکار نہیں کیا جاسکتا۔ اس لیے کہ وہ اگر اللہ کے گھر، اللہ کی مسجد میں جانا چاہتا ہے اور عمرہ کرنا چاہتا ہے تو اس کا راستہ کھلا ہونا چاہیے۔ البتہ اگر کوئی انتظامی مسئلہ ہو تو استثنیٰ ہے۔ اس طرح سے یہ مختلف پہلو ہیں جو اس آیت کے ضمن میں سامنے آتے ہیں۔

اَرَءَیْتَ اِنْ کَانَ عَلَی الْھُدٰٓیۙ۝ اَوْ اَمَرَ بِالتَّقْوٰیؕ۝ اَرَءَیْتَ اِنْ کَذَّبَ وَ تَوَلّٰیؕ۝ اَلَمْ یَعْلَمْ بِاَنَّ اللّٰہَ یَرٰیؕ۝ (العلق ۹۶:۱۱-۱۴)

"تمھارا کیا خیال ہے کہ اگر (وہ بندہ) راہِ راست پر ہو یا پرہیز گاری کی تلقین کرتا ہو؟ تمھارا کیا خیال ہے اگر (یہ منع کرنے والا حق کو) جھٹلاتا اور منہ موڑتا ہو؟ کیا وہ نہیں جانتا کہ اللہ دیکھ رہا ہے؟"

یہاں بھی اندازِ بیان ایک لحاظ سے مبہم ہے۔ "کیا تم نے دیکھا؟" کس کے بارے میں یہ کہا جارہا ہے، کس سے کہا جارہا ہے، یہ بات واضح نہیں ہے۔ چناں چہ یہاں بھی مفسرین کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے۔ بعض نے کہا کہ یہ خطاب پہلی آیت: اِنْ کَانَ عَلَی الْھُدٰٓیۙ۝ اَوْ اَمَرَ بِالتَّقْوٰیؕ۝ (۱۱-۱۲)، "اگر (وہ بندہ) راہِ راست پر ہو یا پرہیز گاری کی تلقین کرتا ہو" کی روشنی میں دراصل ان بندوں کے بارے میں ہے، جن کو تقویٰ کا حکم کرنے سے روکا جاتا ہے۔ روکنے والا یہ نہیں سوچتا کہ اللہ کے رسول، اللہ کی ہدایت پر چلنے والے جو تقویٰ کی تعلیم دیتے ہیں، یہی سیدھے راستے پر ہوں گے۔

امر کے معنی صرف حکم دینے کے نہیں ہوتے۔ جہاں امر کا لفظ آتا ہے اردو جاننے والے کے ذہن میں فوراً اس کے معنی حکم دینے کے آتے ہیں۔ کوئی آرڈی نینس ہو، کوئی قانون پاس کیا جائے، کوئی حکمراں محتسب مقرر کرے تو یہ امر بالمعروف یا امر بالتقویٰ ہے۔ امر کے معنی عربی زبان میں حکم کے بھی ہیں، تعلیم کے بھی ہیں، سکھانے اور کوئی بات بتانے کے بھی ہیں۔ شاہ

عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ اس کا ترجمہ ''سکھانا'' کرتے ہیں۔ اَوْ اَمَرَ بِالتَّقْوٰیؕ○ (العلق: ۱۲) ''یا سکھلانا ڈر کے کام۔'' یعنی حکم دینے کے نہیں بلکہ سکھلانے اور تعلیم دینے کے معنوں میں وہ اسے استعمال کرتے ہیں۔ دوسری آیت میں مخالفین کا ذکر ہے کہ یہ اگر جھٹلا رہے ہوں اور اللہ کی اطاعت سے منہ موڑ رہے ہوں تو انھیں سوچنا چاہیے کہ وہ اللہ کی نظروں میں ہیں اور اللہ انھیں دیکھ رہا ہے۔

اس کے دوسرے معنی یہ ہیں کہ جو آدمی اللہ کے راستے سے روک رہا ہے وہ اپنے زعم میں یہ سمجھتا ہے کہ میں صحیح ہوں، اور مجھے اِس بات کا علم ہے کہ کیا صحیح ہے اور میں دراصل اس بات کی تعلیم دے رہا ہوں کہ جسے انسان کو اختیار کرنا چاہیے اگر اس کی یہ روش ہے تو کیا وہ نہیں سمجھتا کہ وہ غلط سمجھ رہا ہے؟ اور کیا وہ نہیں جانتا کہ اللہ تعالیٰ اُس کو دیکھ رہا ہے اور وہ خوب واقف ہے۔ اگر ایسا ہے تو وہ ہدایت کے راستے پر نہیں ہے اور وہ تقویٰ کی تعلیم نہیں دے رہا ہے۔ اسی طریقے سے اَرَءَیْتَ اِنْ کَذَّبَ وَ تَوَلّٰیؕ○ کا مفہوم یہ ہوا کہ ایک تو اسے اپنے بارے میں غلط زعم ہے اور پھر اس زعم میں وہ حقیقت کو بھی جھٹلاتا ہے، اور یہ بھول جاتا ہے کہ اللہ اسے دیکھ رہا ہے۔

چناں چہ تین درجات میں اُس آدمی کا ذکر کیا گیا ہے جو جھٹلاتا ہے۔ پہلے تو اس کی کوئی اور صفت نہیں بیان ہوئی، صرف یہ کہا گیا کہ وہ نماز پڑھنے سے یعنی اللہ کے راستے سے روکتا ہے۔ پھر فرمایا گیا کہ اس کے باوجود وہ یہ زعم بھی رکھتا ہے کہ میں صحیح راستے پر ہوں اور میں انسان کو صحیح راستے پر چلا رہا ہوں اور اُس کو صحیح رہنمائی دے رہا ہوں۔ پھر زعم ہی نہیں رکھتا بلکہ عملاً اُس صحیح بات کو جس کی تعلیم اللہ نے دی ہے، اُس کی تکذیب کرتا ہے، اللہ کی اطاعت سے منہ موڑتا ہے اور روگردانی کرتا ہے۔ گویا تکذیب یا جھٹلانے کے تین درجات ہو گئے جس میں ایک کے بعد دوسرا درجہ شدید تر ہے۔ ایک میں صرف کام کا ذکر ہے، دوسرے میں اپنے بارے میں غلط زعم کا ذکر ہے اور تیسرے میں جھٹلانے کا اور منہ موڑنے کے عمل کا ذکر ہے۔

اَلَمْ یَعْلَمْ بِاَنَّ اللّٰہَ یَرٰی○ (العلق: ۱۴)

''کیا وہ نہیں جانتا کہ اللہ دیکھ رہا ہے۔''

اَنَّ عربی گرامر میں 'اگر اس نے ایسا کیا' اور 'اگر وہ آئے گا' کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ ہم بھی اردو زبان میں شرط کے طور پر بولتے ہیں۔ شرط کے جواب میں کوئی اور بات بھی کہی

جاتی ہے، مثلاً ''اگر وہ آئے گا تو میں اُس کا اکرام کروں گا''، ''اگر اُس نے درخواست دی تو میں اُس کو ملازمت دے دوں گا'' اور ''اگر اس نے امتحان دیا تو وہ پاس ہو جائے گا'' ان جملوں پر اگر آپ غور کریں تو اگر کے بعد ایک اور جملہ بھی آتا ہے جو اُس ''اگر'' کا جواب ہوتا ہے۔ اسی طرح عربی کے اندر بھی ہے لیکن یہاں دوسرے جملے کا تذکرہ نہیں ہے، اور جب شرطیہ جملے میں جواب محذوف ہو اور جواب نہیں دیا جاتا، تو پھر اس کے یہ معنی ہوتے ہیں کہ اس بات کے جتنے بھی مفہوم ہو سکتے ہیں وہ سب اس کے اندر شامل ہیں۔ یہاں بھی اسی انداز میں سب باتوں کو سمیٹ کر فرما دیا گیا ہے کہ وہ یہ سب کام کرتا ہے اور یہ نہیں جانتا کہ اس کے یہ سارے کام اللہ دیکھ رہا ہے۔ اگر اسے یہ احساس ہو، وہ جانتا ہو کہ اللہ تعالیٰ اسے دیکھ رہا ہے اور وہ اس کے ایک ایک عمل سے باخبر ہے، تو یہ احساس ہی اُس کو برے کاموں سے روک سکتا ہے۔

دوسرے مفہوم کو بھی یہاں پر واضح کر دیا گیا ہے کہ جو وحی، ہدایت اور تعلیم اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری نبی ﷺ کو عطا فرمائی ہے، جس میں انسان کی بھلائی اور اس کی کامیابی کی راہ مضمر ہے، سرکشی اور استغنیٰ کا بھی امکان ہے، وہ یہی ہے کہ آدمی اِس بات کو یاد رکھے کہ ہر چیز کا مرجع اللہ تعالیٰ ہے۔ یہ سرکشی اور گمراہی سے بچنے کا بھی نسخہ ہے کہ آدمی یہ سمجھ لے کہ ہر چیز اللہ کی طرف سے آئی ہے اور اسی کی طرف لوٹ کر جانے والی ہے۔ اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ ○ (البقرۃ:۱۵۶) ''ہم اللہ ہی کے ہیں اور اللہ ہی کی طرف ہمیں لوٹ کر جانا ہے۔'' یہ آیت بھی اسی بات کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ یہ عقیدہ کہ ہر چیز اللہ کی ہے، ہر چیز اللہ کی طرف سے ملی ہے، ہر چیز کا مرجع اللہ تعالیٰ ہے، ہر کام کا آخری فیصلہ اسی کے پاس ہوتا ہے اور ہمیں بالآخر لوٹ کر اسی کی طرف جانا ہے، اور ہر چیز کا حساب دینا ہے، جس کا یہ عقیدہ ہو اور جواب دہی کا یہ احساس ہو، یہ بات طغیانی سرکشی اور ظلم و فساد اور تکبر اور استغنیٰ سب کو ختم کرنے کا نسخہ ہے۔ پھر یہ چیز کہ آدمی اِس بات کو سمجھے کہ جو کچھ بھی ہے وہ اللہ کے علم میں ہے، اللہ تعالیٰ ہر چیز کو دیکھ رہا ہے، یہ احساس آدمی کو ان ساری برائیوں سے بچانے کا کام کرتا ہے، جن کا ذکر کہ اس سورہ میں تین تین آیات کے، ان دو حصوں میں ہوا ہے۔ یہی مفہوم اس آیت کا بھی ہے کہ ''کیا وہ نہیں جانتا کہ بے شک اللہ تعالیٰ دیکھتا ہے۔''

اس کے بعد پھر سلسلۂ کلام کا رُخ بدلتا ہے۔ اب ان مخالفین سے خطاب ہے جو شدت کے ساتھ آپ ﷺ کی مخالفت کر رہے تھے یا جو ہر دور میں حق کی مخالفت کرتے ہیں۔ خطاب کے

الفاظ کے اندر سخت تنبیہ اور عذاب کی دھمکی ہے۔

كَلَّا لَئِنْ لَّمْ يَنْتَهِ ۵ۙ لَنَسْفَعًاۢ بِالنَّاصِيَةِ ۝ نَاصِيَةٍ كَاذِبَةٍ خَاطِئَةٍ ۝

(العلق:۱۵، ۱۶)

''ہرگز نہیں، اگر وہ باز نہ آیا تو ہم اس کی پیشانی کے بال پکڑ کر کھینچیں گے، اس پیشانی کو جو جھوٹی اور سخت خطا کار ہے۔''

نَاصِيَة کا لفظ عربی زبان میں سامنے کے وہ بال جن کی چوٹی بنتی ہے، یا جس طرح گھوڑے کے بال ہوتے ہیں، جن کو آدمی پکڑتا ہے، ان سب کے لیے یہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔ کیوں کہ پیشانی جسم کی سب سے اعلیٰ اور برتر جگہ ہے، اس لیے پھر یہ لفظ پورے انسانی وجود کے لیے استعمال ہونے لگا اور اس سے پوری شخصیت مراد لی جانے لگی۔ یہ دونوں معنوں میں استعمال ہوتا ہے، بالوں کے لیے بھی اور بالآخر محاورے کے طور پر پوری شخصیت کے لیے بھی۔

لَنَسْفَعًا یعنی اگر یہ اپنی سرکشی اور طغیانی سے اور حق کو جھٹلانے اور حق کی مخالفت سے باز نہ آیا، تو ہم اسے چوٹی سے پکڑ کر گھسیٹیں گے۔ یہاں مخالفین کو بھی تنبیہ کی جارہی ہے اور حضور ﷺ کو بھی تسلی دی جارہی ہے کیوں کہ آپ ﷺ شدید مخالفتوں کے درمیان کھڑے ہوئے تھے اور اُن کا مقابلہ کر رہے تھے۔ دراصل سفع کے معنی ہوتے ہیں کسی چیز کو زور سے پکڑ کے شدت کے ساتھ گھسیٹنا اور اگر ان الفاظ پر غور کیا جائے تو نَسْفَعًا. کے الفاظ کے اندر بھی بڑی شدت پائی جاتی ہے اور لہجے میں بھی کہ ہم ضرور اِس کی چوٹی پکڑ کے زور کے ساتھ گھسیٹیں گے۔

کیوں گھسیٹیں گے؟ اس کی وجہ بھی بیان فرمادی کہ وہ شخص ایسا ہے: كَاذِبَةٍ خَاطِئَةٍ یعنی وہ پیشانی جو جھوٹی اور گناہ گار ہے۔ یہاں اسی کے دو جرائم بیان ہوئے ہیں۔ ایک، تکذیب اور دوسرے، خطا کار۔ ایک کا تعلق قول اور عقیدے سے ہے اور دوسرے کا تعلق عمل سے ہے، اور ان دونوں نے اُس کی ساری غلط کاریوں کو سمیٹ لیا ہے۔ ایک طرف تو وہ جھوٹا ہے، جو آدمی بھی حق کے خلاف بات کرتا ہے وہ جھوٹ بولتا ہے، جو اللہ کا انکار کرتا ہے وہ بھی جھوٹ بولتا ہے، اور جو ظلم کی ترغیب دیتا ہے وہ بھی جھوٹ بولتا ہے۔ اس لحاظ سے وہ کاذب ہے اور خطا کار بھی۔ یہاں یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ اُسے جو سزا دی جارہی ہے، اس کو پکڑ کے گھسیٹا جارہا ہے، یہ بے وجہ نہیں ہے، اور کسی کے ذہن میں بھی کہیں یہ خیال نہ ہو کہ اللہ تعالیٰ جزا و سزا یوں ہی نہیں دے گا کہ کسی کے ہاتھ

پرجزا رکھ دی، جنت دے دی اور کسی کو دوزخ میں جھونک دیا۔ قرآن مجید تو ہر صفحے پر، ہر مقام پر اس کی مکمل تردید کرتا ہے۔ آدمی کو جو کچھ بھی ملے گا، اللہ کی رحمت اور مغفرت اور جنت اور انعام، سب اُس کے اعمال کی وجہ سے ملے گا اور اگر سزا ملے گی تو وہ بھی اعمال ہی کی وجہ سے ملے گی۔

فَلْيَدْعُ نَادِيَهُ ۝ سَنَدْعُ الزَّبَانِيَةَ ۝ (العلق:۱۷، ۱۸)

''وہ بلالے اپنے حامیوں کی ٹولی کو، ہم بھی عذاب کے فرشتوں کو بلالیں گے۔''

ندا کے معنی پکارنے کے ہوتے ہیں۔ اسی سے پھر یہ لفظ ایک دوسرے کے ساتھ جمع ہو کر مشورہ دینے کے معنوں میں استعمال ہونے لگا۔ جن مفسرین نے اس واقعے کو ابوجہل کے واقعے تک محدود کیا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ مکہ میں، خانہ کعبہ میں ایک 'دارالندوہ' تھا، جہاں پر قریش کے سردار جمع ہو کر اجتماعی معاملات پہ مشورے کیا کرتے تھے۔ اسلام کی مخالفت کے سارے مشورے دارالندوہ میں ہی ہوتے تھے۔ حضورؐ کے قتل کا جو آخری فیصلہ ہوا وہ بھی یہیں ہوا تھا۔ پھر نَادِيَہ مجلس کے معنوں میں بھی استعمال ہونے لگا، اور ساتھی اور ٹولی اور پارٹی کے معنوں میں بھی۔ مطلب یہ ہوا کہ یہ اپنے ساتھیوں کو، اپنی ٹولی کو اور جو بھی ان کی قوت ہے اُس کو جمع کرلیں، جتنے مشورے دینے والے ہیں وہ بھی جمع ہو جائیں۔

بعض لوگوں نے کہا کہ اس کو یہاں تک بھی محدود کرنے کی ضرورت نہیں ہے کہ انسان سارے انسانوں کو جمع کرلے بلکہ تمہارے اپنے جتنے بھی مشورے ہوں، جتنے بھی ذہن میں خیال آئیں، سب کچھ جمع کرلو۔ زَبَانِيَة کے معنی ہیں پیادے اور سپاہی کے، جو کسی کا دفاع کرے۔ گویا ایک طرف ہم ہوں گے اور ایک طرف تمہاری یہ مجلس ہوگی۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ یہ آیت ابوجہل کے جواب میں آئی ہے تو ان کے نزدیک اس کا پہلا مظاہرہ تو غزوۂ بدر میں ہوا کہ جب غزوۂ بدر میں کفار نے اپنی ساری طاقت جمع کرلی، ایک ہزار کی تعداد میں میدان بدر میں پہنچے قریش کے جتنے بڑے بڑے سردار تھے، سوائے ابولہب کے جس نے اپنا مال و دولت دے کر اور اپنے بدلے کسی اور کو لڑنے کے لیے بھیج دیا، کوئی بھی سردار پیچھے نہیں رہا، جب کہ مسلمان صرف ۳۱۳ کی تعداد میں تھے۔ اسلحہ بھی نہ ہونے کے برابر تھا، سواریاں بھی ناکافی تھیں، کپڑے بھی پھٹے ہوئے تھے۔ اس حال میں مقابلے کے لیے جمع ہوئے تھے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اُس دن بدر کے میدان میں ۷۰ کفار جن میں وہ بڑے بڑے سردار بھی شامل تھے جو ۱۳ برس تک حضورؐ کی

شدید مخالفت کرتے رہے، سب کو ہلاک کرادیا۔ اللہ کا عذاب صرف زلزلے اور آتش فشاں پہاڑ کے پھٹنے اور پتھروں کی بارش کی صورت میں نہیں آتا بلکہ مومنین کے ہاتھوں کفار کے استحصال، ان کی تباہی کی صورت میں بھی آتا ہے۔

اس طرح اللہ کے فرشتے بھی بدر کے میدان میں نازل ہوئے۔ یہ دراصل اس وقت کی پیشین گوئی یہاں پر کی گئی ہے اور ویسے بھی یہ اللہ کی طرف سے دھمکی بھی ہے اور تسلی بھی۔ دھمکی مخالفین کے لیے ہے اور تسلی حضور ﷺ کے لیے اور حضور ﷺ کے بعد جو بھی آنے والے ہوں، جو حضور ﷺ کے دین کے لیے کھڑے ہوں، اُن سب کے لیے ہے۔

كَلَّا ؕ لَا تُطِعْهُ وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ ۝ (العلق:۱۹)

''ہرگز نہیں، اس کی بات نہ مانو اور سجدہ کرو اور (اپنے رب کا) قرب حاصل کرو۔''

ان سب کو بالآخر اللہ ہی کی طرف لوٹنا ہے۔ یہ جو کچھ کررہے ہیں وہ اللہ تعالیٰ دیکھ رہا ہے، جس کو بھی اپنی مدد کے لیے چاہیں بلالیں، جو ساز وسامان بھی چاہیں جمع کرلیں، جتنا اسلحہ چاہیں جمع کرلیں، خواہ کتنی ہی بڑی سوپر پاور ہو، ہرگز کوئی چیز کام نہیں آئے گی۔

اس کے بعد پھر حضور ﷺ سے اور آپ ﷺ کے بعد آنے والے سارے پیروکاروں سے جو کہ آپ ﷺ کی طرح قرآن مجید کا پیغام لے کر کھڑے ہوں، سب کو تین ہدایات دی گئی ہیں۔ ایک یہ کہ لَا تُطِعْهُ ''ان کی اطاعت نہ کرو''، وَاسْجُدْ ''اور سجدہ کرو'' اور وَاقْتَرِبْ ''(اپنے رب کا) قرب حاصل کرو۔''

اطاعت کے معنی پیروی کرنے کے بھی آتے ہیں، اور کہنا ماننے کے بھی، پیچھے چلنے کے بھی آتے ہیں اور کسی نمونے کو پسند کرلینے کے بھی۔ قرآن مجید نے اس لفظ کو کہیں ایک معنی میں، کہیں دونوں معنوں میں اور کہیں سب معنوں میں استعمال کیا ہے۔ یہاں پر تو ظاہر ہے کہ حضور ﷺ کے بارے میں یہ اندیشہ پیدا نہیں ہوسکتا تھا کہ آپ ﷺ مخالفین کی اطاعت شروع کردیں گے، اُن معنوں میں کہ جن معنوں میں ہم اردو میں اطاعت کا لفظ استعمال کرتے ہیں، یعنی کہنا ماننا، اور نہ اس کا خطرہ بعد میں ہوسکتا ہے، جس کا ایمان صادق اور سچا ہو۔ لیکن یہ کہ اُن کے کہنے میں آجانا، اُن کی روش پہ چلنا، اُن کی خاطر اپنے مسلک کو تبدیل کرلینا، اس کے اندر مصالحت اختیار کرلینا، اُن کے نمونوں کو پسند کرنا کہ یہ لوگ تو واقعی اچھے ہیں، صحیح بات کہتے نظر

آتے ہیں، ان سب کی یہاں پر تردید کی گئی ہے۔ سورۂ کہف میں بھی یہ بات کہی گئی ہے:

لَا تُطِعۡ مَنۡ اَغۡفَلۡنَا قَلۡبَهٗ عَنۡ ذِكۡرِنَا وَاتَّبَعَ هَوٰهُ وَ كَانَ اَمۡرُهٗ فُرُطًا۝

(الکہف: ۲۸)

''کسی ایسے شخص کی اطاعت نہ کرو، جس کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا ہے اور جس نے اپنی خواہش نفس کی پیروی اختیار کر لی ہے اور جس کا طریق کار افراط و تفریط پر مبنی ہے۔''

یہاں اُن سارے لوگوں کے بارے میں جو وحی اور حق کی مخالفت پر کھڑے ہو گئے ہوں، کہا جا رہا ہے کہ ان سے اطاعت کا تعلق، ان کی پیروی کا تعلق، اُن کے پیچھے چلنے کا تعلق، اُن کو پسند کرنے کا تعلق، اُن کو اپنے ماڈل اور نمونہ بنانے کا تعلق، یہ اختیار مت کرو۔

وَاسۡجُدۡ (العلق: ۱۹) اور ''سجدہ کرو'' کا مفہوم بھی وضاحت طلب ہے۔

نماز میں سجدہ وہ عمل ہے، جس میں انسان اپنی پوری شخصیت کو اپنے رب کے آگے ڈال دیتا ہے۔ پہلے بھی نَاصِيَةٌ کا، اور پیشانی کے بالوں کا ذکر آچکا ہے، اور سجدے میں وہی پیشانی اپنے رب کے آگے جا کر خاک پہ ٹک جاتی ہے۔ یہ اب وہ پیشانی نہیں ہے جو جھوٹی اور خطا کار ہو بلکہ یہ وہ پیشانی ہے جو اللہ کے آگے جھک گئی ہے، اس نے اپنے آپ کو اللہ کے آگے ڈال دیا ہے۔ اس کا پہلا مطلب تو ہو گا نماز پڑھو، لیکن نماز پڑھنے کے لیے تو سیدھے سادے یہ الفاظ بھی آسکتے ہیں کہ ''نماز پڑھو'' تو پھر الگ سے سجدے اور رکوع کا ذکر کیوں ہوا ہے؟ پھر اس کے ایک معنی یہ ہوں گے کہ سجدے میں دراصل اُن عبادات کا ذکر ہے جو آدمی اپنی مرضی اور اپنی خواہش سے کرتا ہے، اس میں خاص طور پر رات کی نماز ہے۔

جب یہ سورہ نازل ہو رہی تھی اس وقت پانچ نمازیں فرض نہیں تھیں اور جماعت کا نظام بھی نہیں تھا، کوئی مسجد بھی نہیں تھی بلکہ اس وقت لوگ راتوں کو نمازیں پڑھتے تھے یا دارِ ارقم میں حضورؐ کے پاس جمع ہو کر قرآن پڑھتے تھے یا نمازیں پڑھتے تھے۔

شروع میں یہی حکم تھا کہ راتوں کو کھڑے رہو۔ لہٰذا اس کا ایک مفہوم تو یہ ہے اور سجدے کے بارے میں یہ حدیث بخاری اور مسلم دونوں میں ہے کہ ''بندہ اپنے رب کے سامنے سب سے زیادہ نزدیک اُس وقت ہوتا ہے جب وہ سجدے کی حالت میں ہوتا ہے۔'' یہاں مراد غفلت کا

سجدہ نہیں بلکہ وہ سجدہ ہے، جس میں ساری روح، ساری شخصیت سمٹ کر اپنے آپ کو اللہ کے سپرد کر دے۔ یہ سجدہ آدمی کو اللہ کے قریب کرتا ہے۔

حضور ﷺ کے ایک غلام تھے حضرت ثوبانؓ۔ ایک دفعہ حضور ﷺ نے اُن سے کہا: ''جو مانگنا ہے مانگ لو؟'' آپ نے فرمایا: مر افقة فی الجنة ''میں تو جنت میں آپ ﷺ کی رفاقت اور آپ ﷺ کی صحبت چاہتا ہوں۔''

دیکھیے! اُن لوگوں کی آرزوئیں اور تمنائیں کن چیزوں پر مرکوز تھیں کہ جنت میں آپ ﷺ کی رفاقت اور صحبت ہو۔ آپ ﷺ نے کہا اور کچھ نہیں؟ انھوں نے کہا: ''نہیں اور کچھ نہیں۔'' آپ ﷺ نے کہا: ''تو میری مدد کرو، سجدوں کی کثرت سے، یعنی اللہ کی اطاعت اور اس کے آگے جھکنے سے۔''

قرآن مجید میں آتا ہے کہ سورج، چاند، ستارے اور درخت سب اللہ کے آگے سجدہ کرتے ہیں۔ سب کے لیے یہی لفظ استعمال ہوتا ہے:

اَلشَّمْسُ وَالْقَمَرُ بِحُسْبَانٍ ۝ وَّالنَّجْمُ وَالشَّجَرُ يَسْجُدٰنِ ۝

(الرحمٰن: ۵،۶)

''سورج اور چاند ایک حساب کے پابند ہیں اور تارے اور درخت سب سجدہ ریز ہیں۔''

یہ وہ سجدہ نہیں کرتے جیسا کہ ہم نماز میں پیشانی ٹیکنے سے مراد لیتے ہیں۔ یہاں سجدے کے معنی ہیں کہ جو اللہ نے کہہ دیا بس وہی کرتے چلے جاتے ہیں، اُسی مدار میں گھومتے ہیں، اسی طرح اُگتے ہیں، اُسی طرح پروان چڑھتے ہیں، اُسی طرح پھل دیتے ہیں، سارے کام اُسی طرح کرتے ہیں، جیسے انھیں حکم دیا گیا ہے۔

گویا وہ سجدہ جو پیشانی ٹیک کر ہوتا ہے، وہ سجدہ جو رات کی تنہائیوں میں ہوتا ہے، وہ سجدہ جو اللہ سے قریب ہونے کے لیے ہوتا ہے، اور وہ سجدہ جو جسم کی ظاہری شکل سے نہیں ہوتا، لیکن دل کے اندر ہوتا ہے، اور وہ سجدہ جو عمل میں اللہ کی اطاعت سے ہوتا ہے۔ یہ سجدے کی مختلف کیفیات ہیں اور یہ اللہ سے قرب کا ذریعہ ہیں۔

وَاقْتَرِبْ (العلق: ۱۹) ''اور (اپنے رب کا) قرب حاصل کرو۔'' یہاں خدا کا قرب حاصل کرنے کی دعوت دی جا رہی ہے۔

اگر غور کریں تو محسوس ہوگا کہ قرآن مجید کی ہر سورہ میں تلاوت کا بھی ذکر ہے، اور قرآن مجید، یعنی اللہ کے پیغام کو پہنچانے کا بھی ذکر ہے۔ سورۂ ضحیٰ اس بات پر ختم ہوئی تھی:

وَ اَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّکَ فَحَدِّثْ ○ (الضحیٰ:۱۱)

''اور اپنے رب کی نعمت کا اظہار کرو۔''

اور سورۂ الم نشرح بھی اسی بات پر ختم ہوئی تھی:

وَ اِلٰی رَبِّکَ فَارْغَبْ ○ (الم نشرح:۸)

''اور اپنے رب ہی کی طرف راغب رہو۔''

گویا دونوں چیزیں ساتھ ساتھ ہیں۔ ایک طرف خود ہدایت حاصل کرنا اور دوسری طرف اسے دوسروں تک پہنچانا ہے۔ حضور ﷺ کا تو فرض ہی یہ تھا کہ آپ ﷺ ہدایت کو پہنچائیں۔ آپ ﷺ کی امت کا بھی یہی فرض ہے اور اس کے لیے اللہ سے قرب اور للّٰہیت بھی ضروری ہے۔ اللہ کی طرف رغبت کرو، اللہ کی طرف جھکو، اللہ سے قریب ہو جاؤ، ہر سورہ کے آخر میں آپ کو کوئی نہ کوئی اِس قسم کا جملہ ضرور ملے گا۔ اللہ سے گہرے تعلق کے بغیر، اللہ کی قربت کے بغیر، اور اللہ کے حضور اپنے آپ کو حاضر و ناظر جانے بغیر، وہ کام نہیں ہو سکتا کہ جو کام اللہ نے اپنے نبی ﷺ کے سپرد کیا یا اُمت محمدی ﷺ کے سپرد کیا ہے۔

☙❧

سورۃ القدر

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○

اِنَّاۤ اَنۡزَلۡنٰہُ فِیۡ لَیۡلَۃِ الۡقَدۡرِ ۚ﴿۱﴾ وَ مَاۤ اَدۡرٰىکَ مَا لَیۡلَۃُ الۡقَدۡرِ ؕ﴿۲﴾ لَیۡلَۃُ الۡقَدۡرِ ۬ۙ خَیۡرٌ مِّنۡ اَلۡفِ شَہۡرٍ ؕ﴿۳﴾ تَنَزَّلُ الۡمَلٰٓئِکَۃُ وَ الرُّوۡحُ فِیۡہَا بِاِذۡنِ رَبِّہِمۡ ۚ مِنۡ کُلِّ اَمۡرٍ ۛ﴿۴﴾ سَلٰمٌ ۟ۛ ہِیَ حَتّٰی مَطۡلَعِ الۡفَجۡرِ ﴿۵﴾

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔

ہم نے اس (قرآن) کو شب قدر میں نازل کیا ہے۔ اور تم کیا جانو کہ شب قدر کیا ہے؟ شب قدر ہزار مہینوں سے زیادہ بہتر ہے۔ فرشتے اور روح اس میں اپنے رب کے اذن سے ہر حکم لے کر اترتے ہیں۔ وہ رات سراسر سلامتی ہے طلوعِ فجر تک۔

تشریح: سورۂ قدر وہ سورہ ہے، جس میں شب قدر کی نسبت سے قرآن مجید کا مقام، اس کی عظمت اور اس کی اصل حقیقت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس سورہ سے قبل، سورۂ علق میں پہلی وحی کے نزول کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم ﷺ پر پہلی وحی رات کے وقت اور فجر سے کچھ قبل نازل ہوئی تھی۔ اس سورہ میں جب بات شروع ہوتی ہے تو یہ نہیں فرمایا کہ کیا چیز اتاری ہے بلکہ یہ فرمایا گیا ہے:

اِنَّاۤ اَنۡزَلۡنٰہُ فِیۡ لَیۡلَۃِ الۡقَدۡرِ ۚ○ (القدر:۱)

"ہم نے اس کو شب قدر میں نازل کیا ہے۔"

گویا کہ جو چیز اتاری گئی وہ اتنی جانی پہچانی ہے اور جس سیاق وسباق میں یہ بات ہو رہی ہے، وہ بات اتنی روشن اور واضح ہے کہ یہ کہنے کی ضرورت ہی نہیں ہے کہ قرآن مجید کو اتارا گیا۔ چناں چہ بہت سے ترجمہ کرنے والوں نے ترجمہ ہی اس طرح کیا ہے کہ ہم نے اس قرآن کو اتارا ہے۔ اگر چہ بعض مترجمین نے ترجمے میں قرآن مجید کا لفظ تو استعمال نہیں کیا ہے لیکن اس بات کو واضح کیا ہے کہ 'اس' سے اشارہ قرآن مجید کی طرف ہے، جس کا تذکرہ پچھلی سورہ، سورۂ علق میں ہو چکا ہے۔ یہ بات بھی قرآن مجید میں ایک دوسرے مقام پر بیان ہوئی ہے کہ ہم نے قرآن مجید کو رمضان المبارک کے مہینے میں اتارا:

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ (البقرۃ:۱۸۵)

"رمضان وہ مہینہ ہے، جس میں قرآن نازل کیا گیا۔"

ان دونوں آیتوں کو ملا کر دیکھا جائے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ لیلۃ القدر رمضان المبارک ہی کی ایک رات ہے۔ سورۂ دُخان کے آغاز میں بھی اللہ تعالیٰ نے اس بات کی طرف اشارہ فرمایا ہے:

وَالْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ۝ اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ (الدخان:۲،۳)

"قسم ہے کتاب مبین کی کہ ہم نے اسے ایک بڑی خیر وبرکت والی رات میں نازل کیا ہے۔"

یہاں خیر وبرکت والی رات سے مراد لیلۃ القدر ہے۔

سورۂ قدر میں اِنَّا کا لفظ آغاز ہی میں جس اہتمام کے ساتھ آیا ہے اور اس میں جتنی قطعیت پائی جاتی ہے کہ بے شک ہم نے یہ کام کیا ہے، یہ دراصل اسی چیز کی طرف توجہ دلا رہا ہے جس کا قرآن مجید بار بار ذکر کرتا ہے، یعنی یہ اللہ کی کتاب ہے اور اسی کی اتاری ہوئی ہے، اس میں کسی مخلوق کا کسی قسم کا کوئی عمل دخل نہیں ہے۔ خود اس کتاب کو لانے والے (یعنی جبریل علیہ السلام) کا اس کتاب کے مضامین اور تعلیمات میں کوئی حصہ نہیں ہے۔ کسی شیطان یا کسی جن کا کوئی بس نہیں تھا کہ وہ اس میں کسی قسم کی ملاوٹ کر سکے۔ جو کتاب لوحِ محفوظ میں ہے، وہ کتاب اسی طرح لفظ بہ لفظ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک پر نازل کر دی گئی تھی۔ 'اِنَّا' کا لفظ استعمال کر کے اس بات کی وضاحت بھی کر دی گئی ہے کہ یہ کتاب اللہ نے اتاری ہے۔ محمدؐ کی اپنی تصنیف کردہ نہیں ہے۔

اس سورہ میں لَیۡلَۃُ الۡقَدۡرِ کا لفظ استعمال ہوا ہے، جس کا ترجمہ شب قدر ہے۔ لفظ قدر کے مفہوم کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ اردو زبان میں قدر تین معنوں میں بولا جاتا ہے۔ ایک قدرت یعنی کسی چیز پر اختیار یا طاقت رکھنا۔ دوسرا، تقدیر کے معنوں میں جس کا مطلب ہے چیزوں کا منصوبہ بنانا، ان کا اندازہ اور پیمانہ مقرر کرنا اور تیسرے معنی قدر و قیمت یا کسی چیز کے مقام عظمت کے ہیں۔ ''قدر'' کا لفظ عربی زبان میں بھی انھی معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ یہاں یہ تینوں معنی مراد ہیں۔

لہٰذا شب قدر وہ رات ہے، جس میں اللہ تعالیٰ اپنے اختیار اور قدرت سے معاملات کو طے کرتا ہے۔ اگلی آیات میں اس بات کا ذکر ہے کہ اس رات میں اللہ کے حکم سے فرشتے ہر کام کے فیصلے لے کر اترتے ہیں۔ گویا کائنات کے دن رات کے نظام میں جو اللہ تعالیٰ نے قائم کیا ہے، اللہ نے ایک رات ایسی مخصوص کی ہے، جس میں سال بھر کے فیصلے اور احکامات فرشتوں کے سپرد کیے جاتے ہیں۔ وہ رات شب قدر ہے۔

اللہ تعالیٰ کے لیے ''آج کل'' یا ''آگے اور پیچھے'' جیسے الفاظ بے معنی ہیں۔ یہ الفاظ ہمارے جیسے انسانوں کے لیے ہیں جو آج اور کل کے چکر میں ہیں، جن کا علم اور اندازہ اسی پر مبنی ہے۔ مگر اللہ جو کہ اول بھی ہے اور آخر بھی، جس کا علم ظاہر و باطن ہر چیز پر حاوی ہے، اس کے لیے جو کچھ کل ہونے والا ہے وہ اس طرح ہے جیسے آج ہونے والا ہے۔ البتہ فرشتے اللہ کی مخلوق ہیں اور عالم الغیب نہیں ہیں۔ اور فرشتوں کے ذریعے ہی اللہ تعالیٰ اس کائنات میں تدبیر کرتا ہے۔ چنانچہ شب قدر کا دوسرا مفہوم یہ ہے کہ یہ وہ رات ہے، جس میں اللہ کی طرف سے فیصلے ہوتے ہیں۔ اس بات کو سورۂ دخان میں یوں بیان کیا گیا ہے:

فِيهَا يُفْرَقُ كُلُّ اَمْرٍ حَكِيمٍ ۝ اَمْرًا مِّنْ عِنْدِنَا ؕ (الدخان: ۴، ۵)

''یہ وہ رات ہے، جس میں ہر معاملے کا حکیمانہ فیصلہ ہمارے حکم سے صادر کیا جاتا ہے۔''

اس سلسلے میں تیسری بات یہ ہے کہ قرآن مجید کا نزول اور کائنات کے نظام کی تقدیر، تدبیر یا فیصلوں کو فرشتوں کے سپرد کیے جانے کی وجہ سے بھی اس رات کی عظمت و بزرگی اور قدر و قیمت بہت زیادہ ہے۔ انسان کی ہدایت، انسان کی تمام ضروریات، اس کی موت و زندگی، رزق اور عمر کے فیصلوں کے حامل ہونے کی بنا پر یہ رات منفرد مقام رکھتی ہے۔

اس رات کی ایک منفرد خصوصیت یہ ہے کہ اس رات کو قرآن مجید کے نزول کے لیے، جو کہ سب سے بڑی حکیمانہ نعمت ہے، منتخب کیا گیا:

اِنَّآ اَنۡزَلۡنٰہُ فِیۡ لَیۡلَۃٍ مُّبٰرَکَۃٍ (الدخان:۲)

''ہم نے اسے ایک بڑی خیر و برکت والی رات میں نازل کیا ہے۔''

اس برکت والی رات میں اللہ تعالیٰ تمام امرِ حکیم کا فیصلہ کرتا ہے۔ اللہ کے تمام احکامات امرِ حکیم ہی ہوتے ہیں۔ لفظ حکیم کے دو معنی ہیں۔ ایک معنی حکمت والی چیز کے ہیں، دوسرے معنی یہ کہ جس کے اندر کوئی دخل نہ دے سکے اور کوئی اس سے سرتابی نہ کر سکے۔ اللہ تعالیٰ کے احکامات اگر ایک طرف حکمت سے لبریز ہوتے ہیں تو دوسری طرف کسی کی قدرت اور بس میں نہیں ہے کہ وہ اس کے احکام سے سرمو تجاوز کر سکے یا ان سے باہر نکل سکے۔ قرآن مجید اس کی حکمت کا شاہ کار ہے، جو اس نے اس رات میں نازل کیا۔

یہاں اس بات کی طرف بھی اشارہ ہے کہ پوری کائنات ایک مربوط نظام کے تحت چل رہی ہے۔ اللہ رب العزت جیسی حکیم ہستی اس نظام کو چلا رہی ہے۔ اس چھوٹی سی آیت میں نظامِ کائنات کے اس امر کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ جس کے تحت قرآن مجید کا شب قدر میں نزول ہوا۔ قرآن مجید کا لوحِ محفوظ میں محفوظ ہونا، اس کا نزول، وحی کی نوعیت وغیرہ ایسے معاملات ہیں، جن پر قرآن مجید اور وحی کا پورا انحصار ہے۔ یہ کائنات کے نظام کے ایسے اسرار و رموز ہیں کہ ان کی ابجد سے بھی انسان پوری طرح واقف نہیں ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔ اس لیے کہ یہ اس کے فہم سے بالاتر ہیں۔

کائنات کو جاننا ایک مشکل امر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کائنات کے چھپے ہوئے نظام کو سمجھنا تو بہت دور کی بات ہے، جو نظام نگاہوں کے سامنے ہے وہ بھی انسان کی سمجھ میں پورا نہیں آ سکتا۔ جدید فلکیات کی رو سے ۹۰ فی صد کائنات، ستارے اور سیارے وغیرہ انسان کی نگاہوں سے محو ہیں۔ انسان انھیں دیکھ نہیں سکتا۔ کائنات میں بلیک ہول (Black hole) نام کی چیز پائی جاتی ہے، جسے انسان صرف فارمولے، کلیات اور اعداد و شمار ہی سے جان سکتا ہے۔ اس کے علاوہ اس کو دیکھنے یا جاننے کا کوئی اور ذریعہ نہیں ہے۔ انسان اگر یہ جاننا چاہے کہ زمین کے اندر ایک میل تک کیا کیا چیزیں پائی جاتی ہیں تو وہ یہ جاننے سے بھی قاصر ہے۔ انسان ابھی تک یہ نہیں

جان سکا کہ اس کرۂ ارض کے اندر زیرِ زمین کیا کچھ چھپا ہوا ہے۔ کائنات کے اسرار و رموز کو جاننا تو بہت بڑی بات ہے۔ کائنات ایک طرف اللہ تعالیٰ کی کبریائی اور عظمت کی امین ہے تو دوسری طرف انسان کی بے بسی کا کھلا ثبوت ہے کہ وہ کتنا مجبور اور بے بس ہے۔

کائنات کے اسرار و رموز میں سے ایک نزول وحی بھی ہے۔ وحی کیا ہے؟ یہ کس طرح نازل ہوتی ہے؟ اس کو جاننا انسان کے بس سے باہر ہے۔ اس لیے کہ انسان کو نہ اس کا تجربہ ہے اور نہ انسانی علوم میں سے کوئی علم ہی ایسا ہے، جس کے ذریعے انسان وحی کے بارے میں جان سکے۔ یہ تو صرف انبیاء پر نازل ہوتی تھی اور صرف اللہ کے حکم سے نازل ہوتی تھی۔ البتہ نزولِ وحی کے حوالے سے کچھ اشارے ملتے ہیں، جن کے ذریعے اس کے بارے میں جانا جاسکتا ہے۔

قرآن مجید میں 'روح' کا لفظ مختلف معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ اس سورہ میں بھی اس کا ذکر آیا ہے۔ 'روح' سے مراد روح الامین، حضرت جبریلؑ بھی ہیں اور یہ لفظ وحی کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ مشرکین مکہ سوال کرتے تھے کہ روح کون ہے؟ اس پر اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ "آپ ﷺ کہہ دیں کہ یہ امرِ ربی یعنی وحی ہے۔ مگر تم کو اس کے بارے میں کم علم دیا گیا۔"

قُلِ الرُّوۡحُ مِنۡ اَمۡرِ رَبِّیۡ وَ مَاۤ اُوۡتِیۡتُمۡ مِّنَ الۡعِلۡمِ اِلَّا قَلِیۡلًا ۝

(بنی اسرائیل:۸۵)

"یہ لوگ تم سے روح کے متعلق پوچھتے ہیں۔ کہو، یہ روح میرے رب کے حکم سے آتی ہے، مگر تم لوگوں نے علم سے کم ہی بہرہ پایا ہے۔"

لیلۃ القدر وہ رات ہے، جب ملأ اعلیٰ کا زمین کے ساتھ ربط قائم ہوا۔ خدائے لامکاں جو کہیں نہیں ہے، جو انسانوں کی طرح کلام نہیں کرتا، اس کی کوئی مخصوص زبان نہیں، وہ کسی خاص مقام پر موجود نہیں مگر ہر جگہ موجود ہے اور جس کی مثل کوئی شے نہیں، اس نے اپنے ایک ایسے بندے سے کلام کیا، جو اس کی مخلوق ہے۔ یہ واقعہ اپنی جگہ ایک حیرت انگیز واقعہ ہے۔ ہزارہا برس سے سوچنے والے مفکرین، فلسفی اور مفسرین اس بات میں سرگرداں ہیں کہ خدا کا اپنے بندے سے ہم کلام ہونا، وحی اور روح کا نزول ہونا، آخر اس کی حقیقت کیا ہے؟ اسی بات کا جواب اللہ تعالیٰ نے سورۂ قدر کی ابتدائی آیت میں اس طرح سے دیا کہ ہم نے اس قرآن کو لیلۃ القدر میں نازل کیا، جو رمضان المبارک کی ایک رات تھی۔

لیلۃ القدر میں نزولِ قرآن سے کیا مراد ہے؟ یہ بات سب جانتے ہیں کہ قرآن مجید تھوڑا تھوڑا کر کے ۲۳ برس میں مکمل کتاب کی شکل میں نازل ہوا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ شب قدر میں اس کے نازل ہونے کا کیا مطلب ہے؟ اس حوالے سے مفسرین نے مختلف توضیحات کی ہیں۔ بعض کے خیال میں اللہ تعالیٰ نے اس رات پورے قرآن مجید کو لوحِ محفوظ سے اتار کر فرشتوں کے سپرد کر دیا اور پھر وہ اللہ کے حکم کے تحت، مختلف مواقع کی نسبت سے، اسے زمین پر لے کر اترتے رہے۔ دیگر مفسرین کی رائے میں یہ وہ رات ہے، جب قرآن کے نزول کا آغاز ہوا۔ یہ بات زیادہ واضح اور حقیقت کے قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس قدر والی رات میں قرآن کو نازل کرنا شروع کیا۔

وَمَآ اَدْرٰکَ مَا لَیْلَةُ الْقَدْرِ ۝ (القدر:۲)

''اور تم کیا جانو کہ شب قدر کیا ہے؟''

اس آیت کے لغوی معنی کیے جائیں تو وہ یہ ہوں گے کہ کیا چیز ہے، جس نے تم کو یہ سمجھ دی ہے کہ لیلۃ القدر کیا ہے؟ اس کا سیدھا سادا مفہوم، جو مفسرین نے لیا وہ یہ ہے کہ تم نے کیا سمجھا کہ یہ شب قدر کیا چیز ہے؟ میرے خیال میں، اس آیت کا مفہوم اس وقت بہ خوبی واضح ہو جاتا ہے، جب ہم اردو محاورے کے تحت یہ کہتے ہیں کہ تمھیں کیا پتا کہ شب قدر کیا ہے؟

اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں دو چیزوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ ایک تو یہ کہ اس رات کا مقام، اس کی عظمت اور اس رات میں وحی الٰہی کے نزول کا واقعہ انسانی ادراک سے بالاتر ہے۔ دوسرا اشارہ دراصل شوق دلانے کے لیے ہے کہ کیا تمھیں کچھ پتا بھی ہے کہ شب قدر کیا چیز ہے؟ گویا کہ اس بات کی ترغیب دلائی جا رہی ہے کہ اس رات کی قدر و قیمت اور عظمت و مقام کو سمجھنے کی کوشش کرو۔

لَیْلَةُ الْقَدْرِ ۵ خَیْرٌ مِّنْ اَلْفِ شَهْرٍ ۝ (القدر:۳)

''شب قدر ہزار مہینوں سے زیادہ بہتر ہے۔''

اللہ تعالیٰ نے لیلۃ القدر کے لفظ کو دہراتے ہوئے فرمایا: شب قدر ہزار مہینوں سے زیادہ بہتر ہے۔ اگر یہاں صرف خَیْرٌ مِّنْ اَلْفِ شَهْرٍ ''یہ ہزار مہینوں سے بہتر ہے'' کہا جاتا، تو بھی عربی زبان کے اصولوں کے مطابق بات مکمل ہو جاتی۔ لیلۃ القدر کے لفظ کو بار بار دہرانے کی

حکمت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے امام رازیؒ نے فرمایا کہ دراصل اس رات کی عظمت کی طرف اشارہ ہے۔ درحقیقت اس رات کی عظمت اور مقام کو اجاگر کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے لیلۃ القدر کے لفظ کو تین مرتبہ دہرایا ہے۔

ہزار مہینوں کے مفہوم کو واضح کرنے کے لیے مفسرین نے بہت کچھ لکھا ہے مگر اس میں صحیح بات وہی ہے جو امام رازی علیہ الرحمہ نے فرمائی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ دراصل عربی زبان میں کسی چیز کی کثرت اور بہت بڑی تعداد کو ظاہر کرنے کے لیے اَلْف (ہزار) کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ اس لیے یہاں ہزار مہینے سے مراد ایک ہزار مہینے نہیں ہیں بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ یہ رات ہزار ہا مہینوں اور سالوں سے بہتر رات ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ رات کن معنوں میں ہزار برس سے بہتر ہے؟ اس سوال کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے "خیر" کا لفظ استعمال کیا ہے۔ مفسرین کے مطابق اس رات میں خیر کا ایک پہلو تو یہ ہے کہ اس رات میں کی جانے والی عبادت اپنے اجر وثواب اور درجات کے لحاظ سے اللہ کے ہاں ہزار مہینے کی عبادت سے زیادہ برتر اور افضل ہے۔ یہ بات حدیث میں بھی آئی ہے: جس نے لیلۃ القدر میں ایمان اور احتساب کے ساتھ قیام کیا، اس کے پچھلے سارے گناہ معاف کردیے جاتے ہیں۔ ایک حدیث میں ہے کہ جو لیلۃ القدر کے خیر سے محروم رہا وہ درحقیقت بہت بڑے خیر سے محروم رہا۔ ان احادیث کی روشنی میں خیر کا ایک پہلو یہ اجاگر ہو کر سامنے آتا ہے کہ اس رات میں عبادت کرنا، اللہ کا ذکر کرنا، اس کے حضور قیام کرنا اور سجدہ ریز ہونا، تلاوتِ قرآن پاک کرنا، اپنے گناہوں پر گڑگڑانا، توبہ استغفار کرنا اور اس سے دعائیں مانگنا ایسی چیز ہے، جو ہزار مہینوں سے بہتر ہے۔

ایک روایت کے مطابق جب نبی اکرمؐ نے پہلی امتوں کے اعمال دیکھے تو وہ طویل عمر ہونے کی بنا پر بہت زیادہ تھے۔ اس پر حضور ﷺ نے سوچا کہ میرے امتیوں کی عمریں تو بہت چھوٹی ہیں، یہ اپنے اجر میں ان تک کہاں پہنچ پائیں گے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے لیلۃ القدر، جیسی عظیم نعمت کا انعام فرمایا۔ اس امت پر اللہ تعالیٰ کا ایک بہت بڑا احسان یہ ہے کہ اس نے کم کاموں پر اور کم وقت میں، اس امت کے لیے اتنا اجر اور برکت رکھ دی ہے، جو دوسری امتوں کے حصے میں نہیں آئی۔

ایک حدیث میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک مزدور کو کسی کام کی مزدوری کے لیے فجر

کے وقت سے لے کر ظہر کی نماز تک کے لیے رکھا اور اس سے مزدوری طے کی۔ اس نے جب کام مکمل کر لیا تو اللہ تعالیٰ نے اس کی مزدوری اسے دے دی۔ اس کے بعد ایک دوسرے مزدور کو عصر تک کے لیے رکھا اور کام مکمل ہونے پر اسے بھی مزدوری دے دی اور وہ بھی فارغ ہو گیا۔ اس کے بعد ایک تیسرا مزدور عصر سے مغرب تک کے لیے رکھا مگر اس سے جو مزدوری طے کی وہ پہلے دونوں مزدوروں سے کئی گناہ زیادہ تھی۔ اس نے جب کام پورا کر لیا تو اسے بھی مزدوری دے دی گئی۔ اس حدیث کے مطابق اس پر اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ میں نے، جو تم سے وعدہ کیا تھا میں نے وہ پورا نہیں کیا؟ وہ جواب دیں گے کہ آپ نے وعدہ تو پورا فرما دیا ہے اس پر اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ بس پھر تمھارے پاس شکایت کا کوئی جواز نہیں ہے۔ اس کے بعد نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ پہلی مثال یہودیوں کی ہے، دوسری عیسائیوں کی اور تیسری میری امت کی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ رمضان المبارک میں ایک نفل فرض کے برابر ہوتا ہے اور ایک فرض پر ۷۰ فرضوں کے برابر ثواب ملتا ہے۔ اسی طرح جمعہ اور دیگر عبادات کے اجر و ثواب میں اضافے کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے۔ لیکن اصل بات یہ ہے کہ یہ رات اس لحاظ سے ہزاروں مہینوں اور برسوں سے بہتر ہے کہ اس میں اللہ تعالیٰ نے وہ کتاب اور ہدایت نازل فرمائی، جس نے آنے والے ہزاروں برسوں کے لیے انسان کا مقدر متعین کر دیا۔ اخلاق، اقدار، احکام اور شریعت کے حوالے سے اس کتاب کے ذریعے جو کچھ عطا کیا گیا، یہ وہ کام تھا جو ہزاروں برسوں میں بھی نہیں ہو سکتا تھا، صرف اس ایک رات میں انجام پا گیا۔ قرآن مجید کا نازل ہونا ایک ایسا کام ہے، اس کے ذریعے انسانی تاریخ میں جو تغیر و تبدل اور انقلاب آیا وہ اتنا عظیم الشان واقعہ ہے کہ اتنا بڑا اور عظیم الشان کام ہزاروں مہینوں میں بھی سر انجام نہیں پا سکتا تھا، جو کہ صرف اس ایک رات میں انجام پا گیا۔

تَنَزَّلُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ فِيْهَا بِاِذْنِ رَبِّهِمْ ۚ مِنْ كُلِّ اَمْرٍ ۛ سَلٰمٌ ۛ هِيَ حَتّٰى مَطْلَعِ الْفَجْرِ ۝ (القدر: ۴،۵)

"فرشتے اور روح اس میں اپنے رب کے اذن سے ہر حکم لے کر اترتے ہیں۔ وہ رات سراسر سلامتی ہے طلوع فجر تک۔"

ان آیات کو دو طرح سے پڑھا جا سکتا ہے۔ ایک انداز اس طرح سے ہو سکتا ہے تَنَزَّلُ

الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ فِيْهَا بِاِذْنِ رَبِّهِمْ ۚ مِنْ كُلِّ اَمْرٍ ۝ سَلٰمٌ ۛ هِيَ حَتّٰى مَطْلَعِ الْفَجْرِ ۝ "یہ وہ رات ہے، جس میں فرشتے اور روح اترتے ہیں اپنے رب کے حکم سے، ہر کام کا حکم لے کر۔ اور یہ سراسر سلامتی کی رات ہے جو فجر تک رہتی ہے۔" اسی آیت کی تلاوت کا دوسرا انداز اس طرح سے ہوگا تَنَزَّلُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ فِيْهَا بِاِذْنِ رَبِّهِمْ ۚ مِنْ كُلِّ اَمْرٍ ۝ سَلٰمٌ ۛ هِيَ حَتّٰى مَطْلَعِ الْفَجْرِ ۝ "یہ وہ رات ہے، جس میں فرشتے اور روح اپنے رب کا حکم لے کر اترتے ہیں، ہر کام کا حکم لے کر سلامتی کے ساتھ۔ یہ رات فجر کے طلوع ہونے تک باقی رہتی ہے۔" ان آیات کے مختلف انداز میں تلاوت کرنے سے آیت کے مفہوم میں کوئی تضاد واقع نہیں ہوتا، مطلب ایک ہی رہتا ہے۔ البتہ دو مختلف پہلو کھل کر سامنے آجاتے ہیں۔

پہلی بات یہاں یہ فرمائی گئی ہے کہ روح اور فرشتے اللہ کے حکم سے اترتے ہیں۔ اس مقصد کے لیے تَنَزَّلُ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ یہ تَتَنَزَّلُ کا مخفف ہے۔ اس کے اصل معنی ہجوم کے ہیں۔ گویا فرشتوں کی ایک بہت بڑی تعداد ہے، جو اس رات میں اترتی ہے اور رات بھر فرشتوں کا آسمان سے زمین کی طرف آنا جانا لگا رہتا ہے۔

اس آیت میں ایک اور لفظ "روح" استعمال ہوا ہے۔ قرآن مجید میں "روح" کا لفظ کئی معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ ایک معنی تو انسانی روح کے ہیں، جس سے زندگی اور حیاتِ انسانی وابستہ ہے۔ اسے اللہ تعالیٰ نے ایک پھونک کی طرح کہا ہے: وَ نَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ (الحجر:۲۹) "میں نے جسد انسانی میں اپنی روح پھونک دی۔"

روح کا لفظ جبریل امین علیہ السلام کے لیے بھی استعمال کیا گیا ہے جو کہ وحی لے کر نازل ہوئے۔ اسی بنا پر بہت سے ترجموں میں اس لفظ کا ترجمہ جبریل امین علیہ السلام ہی کیا گیا ہے۔ لیکن قرآن مجید میں کوئی لفظ ایسا نہیں ہے جو اس بات کو ظاہر کرے کہ یہاں اس لفظ کے معنی جبریل امین علیہ السلام کے ہیں۔ اس کا مطلب جبریل علیہ السلام بھی ہوسکتا ہے اور دوسرے معنی بھی ہوسکتے ہیں۔ جہاں اس لفظ سے جبریل امین علیہ السلام مراد ہیں، وہاں قرآن نے اس لفظ کی تصریح کر دی ہے: نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ ۝ عَلٰى قَلْبِكَ (الشعراء:۱۹۳، ۱۹۴) "اسے (قرآن) لے کر تیرے دل پر امانت دار روح (جبریل علیہ السلام) اتری ہے۔" یہاں پر روح الامین سے واضح طور پر مراد حضرت جبریل علیہ السلام ہیں۔ لیکن اس جگہ پر تصریح نہیں کی گئی ہے بلکہ صرف

اتنا فرمایا گیا ہے کہ فرشتے اور روح اترتے ہیں۔

قرآن مجید میں ’’روح‘‘ کا لفظ ’’وحی‘‘ کے لیے بھی استعمال کیا گیا ہے وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا ط (الشوریٰ: ۵۲) ’’اور اسی طرح (اے نبیؐ) ہم نے اپنے حکم سے ایک روح تمھاری طرف وحی کی ہے۔‘‘ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں جہاں بھی روح کا لفظ وحی کے لیے استعمال کیا ہے وہاں پر اپنے ’’امر‘‘ کا لفظ بھی استعمال کیا ہے۔ مثلاً وہ جانتا ہے کہ روح کو کہاں اتارے یا جس بندے پر چاہتا ہے اپنی روح کو اتارتا ہے۔ ان تمام جگہوں پر اللہ تعالیٰ نے مِنْ اَمْرِهٖ، مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ، مِنْ اَمْرِنَا، جیسے الفاظ کا استعمال کیا ہے۔ جن سے واضح ہوتا ہے کہ اس نے ’’امر‘‘ کا لفظ ساتھ ساتھ استعمال کیا ہے۔

گویا اگر ’’روح‘‘ سے مراد فرشتے ہیں تو یہ وہ رات ہے، جس میں فرشتے اور جبریل امین علیہ السلام اللہ کے حکم سے زمین پر اترتے ہیں۔ اگر ’’روح‘‘ سے مراد ’’وحی‘‘ لیا جائے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ فرشتے وحی لے کر اپنے رب کے حکم سے اس رات میں اترتے ہیں۔ لیلۃ القدر میں فرشتے اترتے ہیں یا روح الامین اللہ کے حکم سے اترتے ہیں، اصل بات یہ ہے کہ یہ رات ملائکہ اور وحی، دونوں کے نور سے جگمگاتی اور روشن ہوتی ہے۔

اگر غور کیا جائے تو یہاں ’’روح‘‘ کا لفظ وحی کے لیے اس لیے بھی استعمال ہوا ہے کہ وحی اللہ تعالیٰ کا ایک فعل ہے، جس کی پوری حقیقت، انسانی ادراک اور سمجھ سے باہر ہے۔ البتہ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ وحی کے ذریعے مردہ دل زندہ ہو جاتے ہیں اور مردہ قومیں کھڑی ہو جاتی ہیں۔ جس طرح وحی (امرِ ربی) کے ذریعے آسمان سے بارش برستی ہے، جس میں روح پھونک دی جائے تو مردہ جسم کھڑا ہو جاتا ہے، اسی طرح دل بھی زندہ ہو جاتے ہیں، قومیں بھی زندہ ہو جاتی ہیں، اخلاق بھی زندہ ہو جاتے ہیں اور روح جو مردہ ہو چکی ہو وہ بھی زندہ ہو جاتی ہے۔ یہ وحی ہی ہے، جس کے ذریعے معمولی لوگ بڑے بڑے لوگ بن جاتے ہیں۔ ان میں ایسی زندگی پھونک دی جاتی ہے کہ بدو، کاشت کار اور تاجر دنیا کے بہترین حکمراں، کمانڈر اور عالم فاضل بن کر ساری دنیا پر چھا جاتے ہیں۔

وحی کی کیفیت انسانی روح جیسی ہے کہ جب تک جسم میں روح موجود ہو، انسان زندہ رہتا ہے۔ جب روح جسم سے نکل جائے تو ہاتھ پاؤں اور آنکھ، ناک، کان تو ویسے ہی رہتے ہیں

مگر جسم بے حس ہو جاتا ہے۔ بالکل اسی طرح جو فرد یا قوم اس وحی کو قبول کر لے اور اپنے اندر جذب لے کر تو وہ زندہ ہو جاتی ہے اللہ کے انعام و اکرام اور اجر کی مستحق ٹھیرتی ہے اور جو اسے قبول نہ کرے وہ اس سے محروم ہو جاتی ہے۔ دراصل وحی وہ چیز ہے جو کسی قوم کے اندر وہ روح پھونک دیتی ہے، جس سے وہ قوم زندہ بن جاتی ہے۔ اسی بات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے علامہ اقبالؒ نے کہا تھا:

زندگانی را بقا از مدعا ست

(زندگی تو تب زندگی ہے، جب اس کے سامنے کوئی مقصد ہو)

یہی معاملہ قوموں کی زندگی کا ہے۔ قوموں کی زندگی مقصد سے وابستہ ہوتی ہے۔ صرف افراد سے، چلتے پھرتے انسانوں سے، سڑکوں اور کارخانوں کی تعمیر سے قوموں کی زندگی باقی نہیں رہتی۔ قوموں کے سامنے جب کوئی مقصد ہوتا ہے تو وہ زندہ تصور کی جاتی ہیں۔ وحی کسی قوم کو ایک مقصد سے آشنا اور معمور کر دیتی ہے۔

اس رات کی ایک خصوصیت اور بھی ہے، جس سے اس کے ہزار مہینے سے بہتر ہونے کا اظہار ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ اس رات میں نزول قرآن کا آغاز ہوا اور اللہ تعالیٰ نے سورۂ علق کی ابتدائی پانچ آیات نازل فرمائیں جنھیں جبریل امین علیہ السلام اپنے رب کے اذن سے لے کر آتے ہیں۔ اذن کا لفظ استعمال کر کے یہاں ایک اور لطیف بات مزید کہہ دی گئی ہے۔ اذن کے معنی صرف حکم کے نہیں ہیں، اجازت کے بھی ہیں۔ اجازت مانگنے پر دی جاتی ہے، خود سے نہیں لی جاتی۔ اس سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ فرشتے خود اس بات کے مشتاق ہوتے ہیں کہ انسانوں کے پاس جائیں۔ جب انھیں اجازت دی جاتی ہے تو وہ اس رات میں آسمان سے زمین پر جوق در جوق نازل ہوتے ہیں۔ زمین و آسمان فرشتوں سے بھر جاتے ہیں۔ وہ انسانوں تک اللہ کا کلام اور پیغام پہنچاتے ہیں جو سلامتی کا پیغام ہے، دل کی سلامتی، گھروں کی سلامتی، قوم اور تہذیب و تمدن کی سلامتی۔ ایک روایت کے مطابق فرشتے گلیوں اور راستوں میں ایسے لوگوں کو ڈھونڈتے پھرتے ہیں، جو اللہ کی یاد میں مشغول ہوتے ہیں۔

قرآن مجید میں جنت کے حوالے سے بھی فرشتوں کا ذکر بہت واضح الفاظ میں ملتا ہے:

وَالْمَلٰٓئِكَةُ يَدْخُلُوْنَ عَلَيْهِمْ مِّنْ كُلِّ بَابٍ ۝ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ (الرعد: ۲۳، ۲۴) ”ملائکہ ہر طرف

سے ان کے استقبال کے لیے آئیں گے اور ان سے کہیں گے: تم پر سلامتی ہے۔'' اس طرح جنت کے ہر دروازے سے فرشتے اہلِ جنت کے سامنے آتے ہیں اور انھیں سلامتی کا ہدیہ پیش کرتے ہیں۔

دنیا کے حوالے سے بھی کہا گیا ہے کہ فرشتے، ان مومن مردوں اور عورتوں کے لیے جو اخلاص اور دیانت کے ساتھ اللہ کی راہ پر چل رہے ہوں، استغفار کی دعا کرتے ہیں۔ قرآن کے مطابق فرشتے ان لوگوں کے ساتھی، مددگار اور ہمراہ ہوتے ہیں جو ''وحی'' کا راستہ اختیار کرتے ہیں۔ یہ بات بھی قرآن مجید میں مختلف مقامات پر کھول کر بیان کی گئی ہے:

اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَیْھِمُ الْمَلٰٓئِکَۃُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَ اَبْشِرُوْا بِالْجَنَّۃِ الَّتِیْ کُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ۝ نَحْنُ اَوْلِیٰٓؤُکُمْ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَ فِی الْاٰخِرَۃِ ج

(حٰمٓ السجدۃ: ۳۰، ۳۱)

''جن لوگوں نے کہا کہ اللہ ہمارا رب ہے اور پھر وہ اس پر ثابت قدم رہے، یقیناً ان پر فرشتے نازل ہوتے ہیں اور ان سے کہتے ہیں کہ نہ ڈرو، نہ غم کرو اور خوش ہو جاؤ اس جنت کی بشارت سے جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے۔ ہم اس دنیا کی زندگی میں بھی تمھارے ساتھی ہیں اور آخرت میں بھی۔''

گویا جو لوگ رب پر ایمان لائیں اور اس پر استقامت کے ساتھ جم جائیں، ان پر فرشتے اترتے ہیں اور ان کو خوف اور ڈر سے محفوظ رکھتے ہیں۔ قرآن مجید میں اس بات کا تذکرہ بھی ہے کہ جب انسان مرنے لگتا ہے، یعنی موت کے وقت بھی فرشتے اسی طرح اترتے ہیں۔ حق و باطل کا اگر کوئی معرکہ پیش آ جائے جیسا کہ غزوۂ بدر کے موقعے پر پیش آیا، تو قرآن مجید اس بات پر شاہد ہے کہ اس موقعے پر بھی فرشتے اترتے ہیں اور دلوں کی طمانیت، سکینت اور حوصلوں کو بلند کرنے کی خدمت سرانجام دیتے ہیں۔ بعض روایات کے مطابق لڑائی میں حصہ بھی لیتے ہیں۔

دراصل فرشتوں کا نزول ''وحی'' کے ساتھ ہی وابستہ ہے۔ اس میں تسکین و تسلی کا سامان بھی ہے اور اس رات کی عظمت کا بیان بھی۔ ''روح'' سے جبریل امین علیہ السلام مراد لیا جائے یا وحی، جو کہ جبریل امین علیہ السلام لے کر آتے ہیں، دونوں صورتوں میں اس سے لیلۃ القدر

کا مقام اور اس کی عظمت اجاگر ہوتی ہے۔ مِنۡ كُلِّ اَمۡرٍ سَلٰمٌ میں اگر مِنْ كُلِّ اَمْرٍ کو پہلے حصے کے ساتھ ملایا جائے، جس کو میں ترجیح دیتا ہوں، تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ فرشتے اور روح اس رات میں اللہ کے حکم سے اترتے ہیں اور ان تمام کاموں کے فیصلے لے کر اترتے ہیں، جو اللہ صادر کرنا چاہتا ہے۔

یہ بات قابل غور ہے کہ جہاں بھی وحی کا لفظ آیا ہے، وہاں اللہ تعالیٰ نے اپنے امر کا ذکر بھی کیا ہے: اَلَا لَهُ الۡخَلۡقُ وَالۡاَمۡرُ (الاعراف: ۵۴) ''تخلیق بھی اسی کی ہے اور حکم بھی اسی کا چلتا ہے۔'' یہاں ایک اہم نکتہ قابل غور ہے وہ یہ کہ خدا کے بارے میں یہ عقیدہ تو بہت عام ہے کہ انسان کو خدا نے پیدا کیا ہے لیکن یہ عقیدہ کہ اس کائنات میں صرف اسی کا حکم چلتا ہے، جو کچھ پیش آتا ہے صرف اسی کے حکم سے پیش آتا ہے، يُدَبِّرُ الۡاَمۡرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَى الۡاَرۡضِ (السجدۃ: ۵) ''وہ آسمان سے زمین تک دنیا کے معاملات کی تدبیر کرتا ہے۔'' سارے معاملات وہی طے کرتا ہے، وَاِلَى اللّٰهِ تُرۡجَعُ الۡاُمُوۡرُ۝ (البقرۃ: ۵) ''آخر کار سارے معاملات پیش تو اللہ ہی کے حضور ہونے والے ہیں۔'' عرش جو کائنات کا مرکز سلطنت ہے، اس پر وہی قائم ہے۔ ثُمَّ اسۡتَوٰى عَلَى الۡعَرۡشِ (یونس: ۳) ''پھر وہ تخت سلطنت پر جلوہ گر ہو کر کائنات کا نظام چلا رہا ہے۔'' یہ عقیدہ اللہ تعالیٰ کو انسان کی زندگی میں ایک جیتی جاگتی حقیقت بنا کر زندہ رکھتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ شاہ جہاں نے تاج محل بنایا۔ اس سے کوئی تعلق ہماری زندگی کا نہیں ہے۔ شاہ جہاں کو تو اتنا خراج عقیدت پیش کیا جاتا ہے کہ اس نے دنیا کا ایک عجوبہ، تاج محل بنایا تھا حالاں کہ ہماری عملی زندگی میں اس کا کوئی دخل نہیں ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ کے بارے میں بھی عقیدہ صرف اتنا ہی ہو کہ اس نے اس دنیا کو بنایا ہے اور وہ اس کا خالق ہے تو یہ بات خلاف حقیقت ہے۔ اس لیے کہ قرآن مجید جہاں بھی تقویٰ کا ذکر کرتا ہے وہاں اس بات کی وضاحت بھی کرتا ہے کہ: ثُمَّ اسۡتَوٰى عَلَى الۡعَرۡشِ (یونس: ۳) ''پھر وہ تخت سلطنت پر جلوہ گر ہو کر کائنات کا نظام چلا رہا ہے۔'' وہ کاموں کی تدبیر کر رہا ہے اور سارے کام اسی کے حکم سے انجام پا رہے ہیں۔

سَلٰمٌ ۛ هِىَ حَتّٰى مَطۡلَعِ الۡفَجۡرِ۝ (القدر: ۵)

''وہ رات سراسر سلامتی ہے طلوع فجر تک۔''

عربی زبان میں الفاظ تین حروف سے مل کر بنتا ہے۔ سَلٰمٌ کا لفظ تین حروف س، ل،

اور م سے مل کر بنا ہے۔اس کے معنی امن اور حفاظت کے ہیں۔ اسی سے لفظ اسلام بنا ہے۔ دونوں لفظ گرامر کی رو سے ایک ہی مادے سے بنے ہیں۔ اسلام کے معنی اپنے آپ کو اللہ کے آگے ڈال دینا اوراس کے سپرد کر دینا ہے۔ انسانی زندگی کے لیے سلامتی اور امن اسی بات میں پوشیدہ ہے۔

قرآن مجید کے نزول کے لحاظ سے سَلٰمٌ کے ایک معنی تو یہ ہوتے ہیں کہ یہ وہ رات ہے، جس میں قرآن مجید اور اللہ تعالیٰ کے احکام نازل ہوتے ہیں اور قرآن کی حفاظت اور تحفظ کا نظام مکمل طور پر موجود ہے اوراس میں کوئی تغیر وتبدل یا تحریف کرنا بھی چاہے تو نہیں کرسکتا۔ یہاں یہ بات ایک لفظ سَلٰمٌ میں کہہ دی گئی ہے۔ کیوں کہ یہ ایک چھوٹی سورت ہے۔ مگر دیگر مقامات پر یہ بات تفصیل کے ساتھ بیان کی گئی ہے: لَا یَمَسُّہٗٓ اِلَّا الْمُطَھَّرُوْنَ ۝ (الواقعہ:۷۹) ’’(قرآن کو) مطہرین کے سوا کوئی چھو نہیں سکتا۔‘‘ یعنی سوائے پاکیزہ لوگوں کے کوئی اس کلام کو ہاتھ نہیں لگا سکتا۔ اس رات میں اگر شیطان مداخلت کرنا چاہیں تو انھیں شہاب ثاقب مارے جاتے ہیں۔ وہ اللہ کے احکام میں کوئی مداخلت نہیں کرسکتے اور سن گن تک حاصل نہیں کر سکتے۔ اس بنا پر وحی الٰہی بالکل محفوظ ہے۔ کوئی اس میں تبدیلی نہیں کرسکتا۔ فِیْ صُحُفٍ مُّکَرَّمَۃٍ ۝ۙ مَّرْفُوْعَۃٍ مُّطَھَّرَۃٍ ۝ۙ بِاَیْدِیْ سَفَرَۃٍ ۝ۙ کِرَامٍۭ بَرَرَۃٍ ۝ؕ (عبس:۱۳-۱۶) ’’یہ ایسے صحیفوں میں درج ہے جو مکرم ہیں، بلند مرتبہ ہیں، پاکیزہ ہیں، معزز اور نیک کاتبوں کے ہاتھوں میں رہتے ہیں۔‘‘ گویا درمیان میں کوئی ایسی جگہ نہیں ہے، جس کی بنا پر یہ کہا جاسکے کہ رسول کریمؐ نے اسے خود تخلیق کیا ہے یا کسی اور نے اس میں کوئی ردوبدل کر دیا ہے۔ گویا وحی، اللہ کا کلام ہے اور اس کی حفاظت کا مکمل اہتمام ہے۔ کوئی اس میں ردوبدل نہیں کرسکتا۔

اس آیت کا دوسرا مفہوم یہ ہے کہ اس رات میں اللہ کی طرف سے جو فیصلے کیے جاتے ہیں، وہ سراپا سلامتی و امن ہوتے ہیں۔ ان فیصلوں میں قوموں کو عذاب دینا، زندگی اور موت کا فیصلہ کرنا اور رزق کو گھٹانے بڑھانے کے فیصلے بھی شامل ہوتے ہیں جو کہ بظاہر خیر اور امن کے فیصلے نہیں ہوتے۔ اس بات کا جواب چھٹے کلمے میں اس طرح سے دیا گیا ہے کہ خیر اور شر کی قدرت صرف اللہ کے پاس ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کائنات کے مجموعی نظام میں بظاہر فیصلہ کیسا ہی ہو، اس میں اللہ کی طرف سے سلامتی اور بہتری ہی ہوتی ہے۔ حتیٰ کہ قوموں پر عذاب کے فیصلوں

کے بارے میں بھی کہا جاتا ہے کہ یہ بھی اللہ کی طرف سے اس قوم کے لیے رحمت اور اس کے عدل کی نشانی ہوتے ہیں۔ اگر ظالموں کی گرفت نہ کی جائے اور ان کا خاتمہ نہ کیا جائے تو یہ عدل و انصاف کے خلاف ہوگا۔ اس کے نتیجے میں امن و سلامتی خطرے میں پڑ جانے کا خدشہ ہوتا ہے۔ اسی لیے ظالموں کی جڑ کات دی جاتی ہے۔ ارشادِ ربانی ہے: فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ۭ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ○ (الانعام:۴۵) ''ظالم قوموں کی جڑ کاٹ دی گئی۔ ہزار ہزار شکر ہے اللہ کا جو رب العالمین ہے۔'' یہ ایک قسم کی سلامتی ہے، جو اللہ کی طرف سے انسانوں پر اتاری جاتی ہے۔ پھر وہ چیز جو اس رات میں اتاری گئی ہے یعنی قرآن جس کا ابتدائی آیت میں ذکر کیا گیا ہے، یہ وہ چیز ہے جو انسانوں کی زندگی، فکر، تہذیب و تمدن اور نظامِ فکر و عمل کے لیے سراسر سلامتی ہے۔ گویا اس رات میں جو کام یا فیصلے ہوتے ہیں، وہ سلامتی پر مبنی ہوتے ہیں اور یہ رات بھی اپنی جگہ سلامتی کی رات ہے۔

حَتّٰى مَطْلَعِ الْفَجْرِ ○ (القدر:۵)

''یہ رات طلوعِ فجر تک رہتی ہے۔''

یہ وہ وقت ہے جب تہجد اور سحری کا وقت ختم ہوتا ہے، صبح کاذب ہوتی ہے اور پو پھوٹتی ہے۔ اس سے یہ بات واضح طور پر متعین ہوگئی کہ یہ رات فجر کے وقت تک باقی رہتی ہے۔

ایک اور پہلو جس کا آیت کی تفسیر سے بظاہر کوئی تعلق نہیں لیکن اپنی جگہ وزن رکھتا ہے، یہ ہے کہ اس رات میں جو فیصلے کیے جاتے ہیں، وحی اتار کر انسان کو جس ہدایت سے نوازا گیا اور سلامتی کا جو نظام دیا گیا، یہی وہ چیز ہے، جس سے انسان کو صبح کی روشنی نصیب ہوتی ہے۔ یہاں صبح سے میری مراد سورج کا طلوع ہونا نہیں ہے بلکہ وہ صبح ہے جو ظلم کی اندھیری رات کے بعد امن و سکون، سکھ چین اور عدل و انصاف کو لے کر طلوع ہوتی ہے۔ گویا یہ روشنی مایوسی کے گھٹا ٹوپ اندھیروں میں زندگی اور امید کا پیغام لے کر نمودار ہوتی ہے۔

روشنی اور تاریکی کا یہ مفہوم براہِ راست تفسیر کے دائرے میں تو نہیں آتا مگر ذہن اس طرف بھی جاتا ہے کہ اس رات میں انسان کو جو ہدایت، کتاب اور روشنی دی گئی وہ انسان کے لیے صبح ہے۔ اس کے نتیجے میں ہی انسانیت کو امن، چین، سکھ، تہذیب و تمدن، آزادیِ فکر، ضمیر کی آزادی اور حقیقی آزادی نصیب ہوئی۔

لیلۃ القدر کون سی رات ہے؟ اس کے متعلق بہت سی روایات ملتی ہیں۔ البتہ اس حد تک بات یقینی ہے کہ یہ رمضان المبارک کی ایک رات ہے۔ کیوں کہ قرآن مجید نے اس طرف اشارہ کیا ہے کہ قرآن مجید رمضان میں نازل ہوا اور شب قدر میں نازل ہوا۔ بعض علما کے نزدیک یہ رمضان المبارک کی پہلی رات ہے۔ امام شافعیؒ کے نزدیک یہ ۱۷ ر رمضان کی رات ہے۔ اس لیے کہ یہ غزوۂ بدر کا دن ہے۔ ایسی احادیث بھی ملتی ہیں جن کے مطابق یہ آخری عشرے کی کوئی ایک رات یا کوئی طاق رات ہے۔ امام رازی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس رات کو بھی اسی طرح چھپا دیا جس طرح اس نے اپنی اطاعت کو بہت سے نیک کاموں میں چھپا دیا تاکہ آدمی ہر نیک کام کرے۔ اپنے غضب کو بہت سے گناہوں میں چھپا دیا تاکہ آدمی ہر گناہ سے بچے۔ اپنے اسم اعظم کو اپنے سارے ناموں کے اندر چھپا دیا تاکہ آدمی اس کے سارے نام لے۔ اسی طریقے سے اس نے اس رات کو بھی چھپا دیا تاکہ آدمی ہر رات کو اس کے حضور کھڑا ہو، ہر رات کو جستجو اور کوشش کرے تاکہ وہ اس رات کو پاسکے۔ اس رات کی عبادت، اس کے نور اور اس رات میں جو کام انجام پایا ہے اس سے واقف ہو سکے۔

ہمارے لیے اس میں یہ سبق ہے کہ آج دنیا مادیت کا شکار ہو چکی ہے، سائنس اور ٹکنالوجی کے میدان میں بے شمار ترقی ہوئی ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ زمانہ بہت تیز ہو گیا ہے، جو فاصلے پہلے برسوں میں طے ہوتے تھے وہ اب منٹوں اور سکنڈوں میں طے ہوتے ہیں۔ جو آواز کہیں نہیں پہنچ پاتی تھی وہ اچانک ہزاروں میل کا سفر طے کر کے ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچ جاتی ہے۔ بظاہر یوں معلوم ہوتا ہے کہ دنیا بہت آگے بڑھ رہی ہے۔ لیکن فی الواقع اس صدی میں اخلاق، روح اور اقدار کی جو موت ہوئی ہے اس کی وجہ سے دنیا کی تاریخ میں یہ صدی سب سے زیادہ خون ریز صدی ہے۔ اس صدی میں انسان کا اتنا خون بہا ہے کہ جس کی کوئی مثال انسانی تاریخ میں نہیں ملتی۔ یہ خون عصبیت، نسل اور رنگ کے نام پر، مال و دولت اور دنیا کی بین الاقوامی مارکیٹوں پر قبضہ جمانے کے لیے اور کمزور قوموں کو کچلنے کے لیے بہایا گیا ہے۔ اس کے نتیجے میں انسانی زندگی عدم سکون کا شکار ہو کر رہ گئی ہے۔

ایک نومسلم، محمد اسد جو یہودی تھے پھر مسلمان ہوئے اور انھوں نے بہت سی کتابیں بھی لکھی ہیں، اپنے قبولِ اسلام کا واقعہ بیان کرتے ہیں۔ لکھتے ہیں کہ وہ برسوں مسلم ممالک میں

پھرتے رہے، اسلام کو سمجھ بھی لیا اور اس کے قائل بھی ہو گئے مگر مسلمان نہ ہوئے۔ ایک دن وہ برلن میں بس میں سفر کر رہے تھے۔ دوران سفر انھوں نے مسافروں کے چہروں کے تاثرات کا جائزہ لیا تو انھیں یوں محسوس ہوا کہ جیسے ہر شخص کے چہرے پر ایک قسم کی آگ، تپش، سوزش اور جلن ہو۔ ہر شخص بے چین اور مضطرب نظر آ رہا تھا۔ گھر جا کر انھوں نے قران مجید کھولا تو پہلی آیت یہ نظر آئی:

اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ ۝ حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ ۝ (التکاثر: ۱، ۲)

"تم لوگوں کو زیادہ سے زیادہ اور ایک دوسرے سے بڑھ کر دنیا حاصل کرنے کی دھن نے غفلت میں ڈال رکھا ہے۔ یہاں تک کہ تم لبِ گور تک پہنچ جاتے ہو۔"

گویا کثرت کی ہوس کہ یہ بھی ہو جائے، اور وہ بھی ہو جائے، اس نے تم کو غافل کر دیا ہے اور اب تم اپنی آنکھوں سے جہنم کو دیکھ لو گے۔ اس طرح سے انھیں احساس ہوا کہ ہوس پرستی کی وجہ سے لوگ کس طرح بے چینی اور اضطراب کے جہنم میں جل رہے ہیں اور ان کی زندگی سکون سے محروم ہے۔ یہ واقعہ ان کے قبولِ اسلام کا باعث بنا۔

غور کیا جائے تو آج ہر شخص مضطرب و بے چین ہے۔ ایک جہنم ہے کہ جو چہروں، دلوں اور زندگیوں میں بھڑک رہی ہے۔ اس کا علاج وہی سلامتی کا پیغام ہے، جو شب قدر میں اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا تھا۔ انسانیت کے لیے امن وچین، سکون ونجات اور بہتری اگر کسی چیز میں پوشیدہ ہے تو وہ اس کلامِ الٰہی میں پوشیدہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے انسانیت کی نجات کی سلامتی والی رات، لیلۃ القدر میں اتارا تھا۔ امت مسلمہ کو اس کتاب کا امین بنایا گیا ہے، اور یہ ذمے داری ان کے سپرد کی گئی ہے کہ وہ خود بھی اس پر عمل کریں اور دوسروں کو بھی اس کی دعوت دیں۔ یہی وہ بات ہے جو کہ ہزار مہینوں سے بہتر ہے، جس کا اس سورہ میں ذکر کیا گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں اس کتاب کی قدر و قیمت کو جاننے، پہچاننے اور اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

꧁꧂

سورة البيّنة

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ ○

لَمۡ يَكُنِ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا مِنۡ اَهۡلِ الۡكِتٰبِ وَالۡمُشۡرِكِيۡنَ مُنۡفَكِّيۡنَ حَتّٰى تَاۡتِيَهُمُ الۡبَيِّنَةُ ۙ﴿۱﴾ رَسُوۡلٌ مِّنَ اللّٰهِ يَتۡلُوۡا صُحُفًا مُّطَهَّرَةً ۙ﴿۲﴾ فِيۡهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ ؕ﴿۳﴾ وَمَا تَفَرَّقَ الَّذِيۡنَ اُوۡتُوا الۡكِتٰبَ اِلَّا مِنۡۢ بَعۡدِ مَا جَآءَتۡهُمُ الۡبَيِّنَةُ ؕ﴿۴﴾ وَمَاۤ اُمِرُوۡۤا اِلَّا لِيَعۡبُدُوا اللّٰهَ مُخۡلِصِيۡنَ لَهُ الدِّيۡنَ ۙ حُنَفَآءَ وَيُقِيۡمُوا الصَّلٰوةَ وَيُؤۡتُوا الزَّكٰوةَ وَذٰلِكَ دِيۡنُ الۡقَيِّمَةِ ؕ﴿۵﴾ اِنَّ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا مِنۡ اَهۡلِ الۡكِتٰبِ وَالۡمُشۡرِكِيۡنَ فِىۡ نَارِ جَهَنَّمَ خٰلِدِيۡنَ فِيۡهَا ؕ اُولٰٓـئِكَ هُمۡ شَرُّ الۡبَرِيَّةِ ؕ﴿۶﴾ اِنَّ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۙ اُولٰٓـئِكَ هُمۡ خَيۡرُ الۡبَرِيَّةِ ؕ﴿۷﴾ جَزَآؤُهُمۡ عِنۡدَ رَبِّهِمۡ جَنّٰتُ عَدۡنٍ تَجۡرِىۡ مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ خٰلِدِيۡنَ فِيۡهَاۤ اَبَدًا ؕ رَضِىَ اللّٰهُ عَنۡهُمۡ وَرَضُوۡا عَنۡهُ ؕ ذٰلِكَ لِمَنۡ خَشِىَ رَبَّهٗ ﴿۸﴾ ع ۸/۲۲

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔

اہلِ کتاب اور مشرکین میں سے جو لوگ کافر تھے، (وہ اپنے کفر سے) باز آنے والے نہ تھے جب تک کہ ان کے پاس دلیلِ روشن نہ آجائے۔ (یعنی) اللہ کی طرف سے ایک رسولؐ جو پاک صحیفے پڑھ کر سنائے، جن میں بالکل راست اور درست تحریریں لکھی ہوئی ہوں۔ پہلے جن لوگوں کو کتاب دی گئی تھی اُن میں تفرقہ برپا نہیں ہوا مگر اس کے بعد کہ اُن کے پاس (راہِ راست کا) بیان واضح آچکا تھا۔ اور اُن کو اس کے سوا کوئی حکم نہیں دیا

گیا تھا کہ اللہ کی بندگی کریں، اپنے دین کو اُس کے لیے خاص کر کے، بالکل یکسو ہو کر اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں۔ یہی نہایت صحیح و درست دین ہے۔ اہل کتاب اور مشرکین میں سے جن لوگوں نے کفر کیا ہے وہ یقیناً جہنم کی آگ میں جائیں گے اور ہمیشہ اس میں رہیں گے، یہ لوگ بدترین خلائق ہیں۔ جو لوگ ایمان لے آئے اور جنھوں نے نیک عمل کیے، وہ یقیناً بہترین خلائق ہیں۔ اُن کی جزا اُن کے رب کے ہاں دائمی قیام کی جنتیں ہیں، جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی، وہ ان میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے۔ یہ کچھ ہے اُس شخص کے لیے، جس نے اپنے رب کا خوف کیا ہو۔

تشریح: یہ سورہ، سورۂ لم یکن اور سورۂ بینہ کے نام سے اور کئی دوسرے ناموں سے قرآن مجید کے مصاحف میں مذکور ہے۔ سورۂ علق میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے پہلی وحی کی صورت میں رسول اللہ ﷺ کو جو پیغام ملا وہ یہی تھا کہ اس وحی کو انسانوں تک پہنچائیں۔ اس کے پیچھے سند، اللہ تعالیٰ کا نام ہے اور علم کا سرچشمہ وہی ہے، اور وہی صحیح ہدایت دے سکتا ہے۔ اس طرح قرآن مجید کا نزول شروع ہوا۔ اس کے بعد والی سورہ، سورۂ قدر میں قرآن مجید کی عظمت اور اس کا مقام، پھر اس بات کی تاکید کہ اس کے اتارنے والے ہم ہیں اور ہم نے اس کو اس رات میں اتارا ہے، جس میں ہزاروں مہینوں اور ہزاروں برسوں کا کام انجام پاتا ہے۔ سلامتی اور امن کی اس رات میں، یعنی لیلۃ القدر میں، یہ کتاب سلامتی اور امن کا پیغام لے کر آئی ہے۔

یہ سورہ جو سورۂ قدر کے فوراً بعد آئی ہے، اس میں ایک طرف تو یہ بتایا گیا ہے کہ قرآن مجید کے نازل ہونے کا مقصد کیا ہے اور قرآن مجید کی صفات بھی بیان کی گئی ہیں۔ دوسری طرف یہ بتایا گیا ہے کہ جو لوگ قرآن مجید کو جھٹلانے، اس کو نہ ماننے اور اس کا انکار کرنے پر کمر باندھے ہوئے ہیں، اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ ان لوگوں کے پاس کوئی روشن دلیل نہیں آئی بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کا اپنا کبر اور حسد ہے جو اُن کو ایمان لانے سے روکے ہوئے ہے۔

لَمْ يَكُنِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَالْمُشْرِكِيْنَ مُنْفَكِّيْنَ حَتّٰى تَاْتِيَهُمُ الْبَيِّنَةُ ۝ (البینۃ:۱)

''اہل کتاب اور مشرکین میں سے جو لوگ کافر تھے، (وہ اپنے کفر سے) باز آنے والے نہ تھے جب تک کہ ان کے پاس دلیل روشن نہ آ جائے۔''

یہ کہا جا رہا ہے کہ اہلِ کتاب اور مشرکین میں سے جن لوگوں نے کفر کیا، یہ باز آنے والے نہیں ہیں، اپنی روش ترک کرنے والے نہیں ہیں، یہاں تک کہ ان کے پاس بینہ آ جائے۔ امام رازیؒ، واقدی کا قول نقل کرتے ہیں کہ '' قرآن مجید میں اپنی تفسیر، تاویل اور مضمون کے لحاظ سے یہ آیت بڑی مشکل آیت شمار کی جاتی ہے، اور اکثر مفسرین اس کا صحیح مفہوم نہیں سمجھ سکے ہیں۔''

اگر ہم اس پر غور کریں تو اس میں ایک بات بہت صاف اور واضح ہے اور وہ یہ ہے کہ یہاں دو گروہوں کا ذکر ہے۔ ایک گروہ اہلِ کتاب کا ہے اور دوسرا مشرکین کا۔ اہلِ کتاب وہ ہیں جو اپنے پاس اللہ تعالیٰ کی طرف سے آئی ہوئی ہدایت رکھتے ہیں، خواہ بگڑی ہوئی شکل میں ہو، تحریف شدہ ہو، ضائع ہو چکی ہو یا اس کے کچھ حصے رہ گئے ہوں۔ بہرحال وہ ایک الہامی کتاب رکھنے اور اس پر عمل کے دعوے دار ہیں۔ ان کی مثال یہودی اور عیسائی ہیں۔ بعض علما نے مجوسیوں اور پارسیوں کو بھی جو آتش پرست ہیں، اس میں شامل کیا ہے کہ ان کے پاس بھی کتاب ہے، اور بعض نے ہندوؤں کے گروہوں کو بھی اس میں شامل کیا کہ ان کے پاس بھی 'وید' کے نام سے کتاب ہے۔

قرآن مجید نے جگہ جگہ اس بات کی وضاحت کی ہے کہ اگرچہ اہلِ کتاب بھی کفر اور شرک کے مرض میں مبتلا ہیں، لیکن اس نے انھیں مشرک قرار نہیں دیا۔ عیسائیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا بنایا ہوا ہے، یہ بھی شرک ہے، لیکن قرآن نے ان پر بھی مشرکین کا لیبل نہیں لگایا، کہیں ان کو مشرکین کے گروہ میں شامل نہیں کیا۔ اس لیے کہ اپنے زعم میں وہ اپنے آپ کو مشرک نہیں سمجھتے بلکہ وہ اپنے آپ کو 'موحد' سمجھتے ہیں۔ یہودی تو اپنے آپ کو کہتے ہی موحد ہیں، توحید کے علم بردار۔ عیسائی تین خداؤں کو ماننے کے باوجود یہی سمجھتے ہیں کہ ہم توحید پر عمل پیرا ہیں اور توحید ہی کے قائل ہیں۔ ہندوؤں کے اندر بھی بہت سارے گروہ ایسے ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم توحید کے قائل ہیں اور یہ جو ہم نے پتھر کی مورتیاں بنا رکھی ہیں، یہ اللہ تعالیٰ کی صفات کو اپنے ذہن میں مستحضر کرنے کے لیے ہیں۔

جب قرآن مجید نازل ہو رہا تھا اس وقت جو اہل کتاب قرآن مجید کے سامنے تھے، وہ عیسائی اور یہودی تھے۔ اس کے علاوہ مکہ کے مشرکین بھی تھے۔ اگرچہ عیسائیوں اور یہودیوں کے

پاس کوئی صحیفہ موجود نہیں تھا لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام کی چھوڑی ہوئی تعلیمات ضرور ان کے پاس تھیں۔ اس سے یہ اصول بھی نکلتا ہے کہ مسلمانوں کے اندر بھی اگر کفر اور شرک کی بیماریاں پھیل جاتی ہیں تو ان پر کافر اور مشرک ہونے کا فتویٰ فوراً لگانا صحیح نہیں ہے۔ قرآن مجید نے تو عیسائیوں اور یہودیوں کو بھی علانیہ کافر اور مشرک نہیں کہا ہے بلکہ یہ کہا کہ یہ اہل کتاب ہیں۔ گو انھوں نے کفر کی روش اختیار کی، کفر کے اعمال کیے اور شرک میں پڑ گئے، مگر اس سب کے باوجود یہ نہیں کہا گیا کہ یہ مشرک ہیں۔ یہ دراصل دعوت و تبلیغ کی ایک حکمت بھی ہے اور انھی کے دعوے کے ذریعے ان کو توحید کی طرف لانے کا ایک طریقہ بھی۔

اس آیت کے مفہوم پر اگر غور کیا جائے تو اس کے ایک معنی تو بہت صاف اور واضح یہ ہیں کہ جب تک کہ بینہ (دلیل روشن) نہ آ جائے، یہ اپنے کفر سے باز آنے والے نہ تھے۔

جب قرآن مجید نازل ہو رہا تھا اس وقت جو لوگ کفر کے فساد کے اندر مبتلا تھے، ان کا فساد ایسا تھا کہ بینہ کے آئے بغیر ان کا اس سے نکلنا، باز آنا اور ہٹنا ممکن ہی نہ تھا۔ فَکّی کے معنی ہیں کسی چیز کو کسی چیز سے الگ کر لینا، کسی کو کسی سے کاٹ لینا، کسی کو کسی سے باز رکھنا یا کسی کی گردن چھڑانا۔ قرآن مجید فَکٌّ کا لفظ غلاموں کو آزاد کرنے فَکُّ رَقَبَۃٍ (البلد: ۱۳) ''کسی گردن کو غلامی سے چھڑانا'' استعمال کرتا ہے۔ یہ لفظ دراصل باز آنے، ہٹ جانے اور غلامی سے گردن چھڑانا، ان تمام معنوں استعمال ہوتا ہے۔ لہٰذا اس کے ایک معنی یہ ہوں گے کہ جس وقت حضور ﷺ تشریف لائے، آپ ﷺ کی بعثت ہوئی، اور قرآن مجید نازل ہوا، اس وقت تک اہل کتاب اور مشرکین کے درمیان جو فسق، فساد اور ظلم پھیل چکا تھا، اس سے یہ لوگ نہیں نکل سکتے تھے جب تک ان کے پاس بَیِّنَۃ نہ آ جائے۔ چنانچہ ہمیں یہ جاننے کی ضرورت ہے کہ قرآن مجید نے بَیِّنَۃ کا لفظ کن معنوں میں استعمال کیا ہے؟

بَیِّنَۃ کے معنی ہیں ایسی بات جو بالکل کھلی ہوئی ہو، بالکل واضح اور روشن ہو، اور جس بات میں اتنی قطعیت ہو کہ اس کے بعد کسی اور دلیل اور حجت کی گنجائش باقی نہ رہے۔ قرآن مجید میں بَیِّنَۃ کا لفظ بڑی کثرت کے ساتھ وحی الٰہی کے لیے بھی استعمال ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے بے شمار رسولوں نے کہا ہے کہ وہ بَیِّنَۃ پر فائز ہیں۔ اللہ کی طرف سے دل کے اندر جو ہدایت ڈالی جاتی ہے اس کے لیے بَیِّنَۃ کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ یہاں جو فرمایا گیا کہ ''ان لوگوں، یعنی اہل کتاب

کے پاس بَیِّنَة آ گئی ہے"، یہاں بَیِّنَة کے ساتھ ہدایت ورحمت کا لفظ بھی استعمال ہوا ہے اور وہ قرآن مجید کے لیے ہے۔ چنانچہ بعض لوگوں کے نزدیک اس سے مراد قرآن مجید ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری نبیؐ پر نازل کیا، جس کا ذکر مسلسل سلسلۂ بیان میں چلا آ رہا ہے، یعنی وحی جو قرآن کی صورت میں نازل ہوئی۔

رَسُوْلٌ مِّنَ اللّٰهِ يَتْلُوْا صُحُفًا مُّطَهَّرَةً ۝ (البینۃ:۲)

"اللہ کی طرف سے ایک رسول جو پاک صحیفے پڑھ کر سنائے۔"

قرآن مجید میں رَسُوْل کا لفظ دو معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ ایک تو اس سے مراد وہ فرشتہ ہے، جو اللہ کی طرف سے اللہ کی رسالت کا پیغام لے کر اللہ کے رسول اور نبی کے پاس آتا ہے۔ جبریل امین علیہ السلام کے لیے بھی اللہ تعالیٰ نے رَسُوْل کا لفظ استعمال کیا ہے:

اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ۝ ذِىْ قُوَّةٍ عِنْدَ ذِى الْعَرْشِ مَكِيْنٍ ۝ مُّطَاعٍ ثَمَّ اَمِيْنٍ ۝ (التکویر:۱۹-۲۱)

"یہ فی الواقع ایک بزرگ پیغام بر کا قول ہے، جو بڑی توانائی رکھتا ہے، عرش والے کے ہاں بلند مرتبہ ہے، وہاں اس کا حکم مانا جاتا ہے۔ وہ بااعتماد ہے۔"

ان معنوں میں یہ لفظ قرآن مجید میں کئی جگہ استعمال ہوا ہے۔

اس کے دوسرے معنی اس رسول کے ہیں، جسے اللہ تعالیٰ نے انسانوں میں سے اپنا رسول منتخب کیا ہو اور انسانوں کی ہدایت اور رہنمائی کا فریضہ اسے سونپا ہو۔ چناں چہ جب انسانوں میں سے اللہ نے اپنے آخری نبی محمدؐ کو رسول بنا کر بھیجا اور اگر وہ بَیِّنَة ہیں تو اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ رسول چوں کہ خود اپنی ذات میں رسالت کی طرف روشن دلیل ہے، اس لیے اس کے بعد اس کے انکار کی کوئی گنجائش ہی نہیں ہے۔ رسول کریمؐ اگر وہ کتاب لے کر نہ آتے جس کو وہ لوگوں کے سامنے پیش کر رہے تھے، جس کی تلاوت کر رہے تھے، جس کا چرچا کر رہے تھے اور جس کا پیغام پہنچا رہے تھے، تو انسانوں کے لیے اُس دور میں کفر اور شرک کی گندگی اور فساد سے نکلنا ممکن نہ ہوتا، بلکہ بعد میں آنے والے کسی بھی انسان کے لیے فساد، کفر اور شرک سے نکلنا ممکن نہ ہوتا جب تک کہ وہ کسی رسول کا دامن نہ پکڑ لے، جو اللہ کی طرف سے آیا ہو، جو خود بَیِّنَة ہو اور اپنی ذات میں اپنے اوپر گواہ ہو۔ گویا رسول کریمؐ کا اخلاق، ان کا پیغام، ان کی تعلیمات، ان

کی دعوت اوران کی پوری زندگی، سب اس بات کے اوپر گواہ ہیں کہ وہ اللہ کے رسول ہیں۔ یہی دراصل بَیِّنَة ہے اوراسی کوقرآن نے بَیِّنَة کہا ہے۔

یہاں اس بات کی طرف بھی اشارہ کیا جارہا ہے کہ اللہ کی طرف سے آنے والا رسول اپنے ساتھ پاک صحیفہ بھی لے کر آیا ہے، جس کی تلاوت کرتا ہے اورلوگوں کو پڑھ کر سناتا ہے۔ 'صحف' یا صحیفہ اوراق کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے اور لکھے ہوئے اوراق کے لیے خاص طور پر استعمال ہوتا ہے۔ گویا اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے کتاب ہے اور یہ بھی ایک واضح نشانی یا کھلی دلیل ہے۔ یہ صُحُفًا مُّطَهَّرَةً ۝ (البینۃ:۲) وہ صحیفے ہیں جن میں اللہ کی وحی لکھی ہوئی ہے۔ یہاں یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ اللہ نے اپنی ہدایت، اپنی رضا اور اپنی وحی، انسان کو کسی اور ذریعے سے نہیں بلکہ اپنی کتاب کے ذریعے سے دی ہے۔

مُطَهَّرَةٌ کے معنی ہیں وہ چیز جو پاک کی ہوئی ہو۔ قرآن مجید نے مُطَهَّرَةٌ کا لفظ کتاب کے لیے کئی معنوں میں استعمال کیا ہے۔ ایک تو ان معنوں میں کہ یہ کتاب جس ذریعے سے پہنچی ہے، یعنی اللہ کے فرشتوں کے ذریعے لوحِ محفوظ سے رسول اللہؐ تک، اس کے درمیان کوئی آمیزش نہیں ہوئی، کوئی اضافہ اور کمی نہیں ہوئی۔ بعینہٖ وہی کتاب جو لوح محفوظ میں ہے وہی اللہ کے رسول تک منتقل ہوئی ہے۔ اس کو لانے والے لوگ بھی پاکیزہ ہیں۔ اس کے یہ معنی بھی ہیں کہ یہ وہ کتاب ہے جو کفر و شرک اور نفاق و باطل کی ہر گندگی سے بالکل پاک ہے۔ کتاب کی تعلیم بھی یہی ہے، اوراسی کی پیروی اوراس کی تعلیمات پر عمل درآمد کر کے ہی اہلِ کتاب اور بنی نوعِ انسان ہدایت و رہ نمائی پاسکتے ہیں۔

فِيهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ ۝ (البینۃ:۳)

''جن میں بالکل راست اور درست تحریریں لکھی ہوئی ہوں۔''

یہاں قَيِّمَةٌ کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ قَيِّمَةٌ کے معنی ہیں سیدھی، مستقیم، قوی، معتدل اور منصفانہ۔ مختلف جگہ پر اپنے معنوں میں بھی قائم ہو اور مستحکم بھی ہو۔ لیکن کُتُبٌ کے کیا معنی ہوئے؟ کتاب تو واضح ہے لیکن یہ کہنا کہ کتاب کے اندر کتب ہیں، یہ بات بھی وضاحت طلب ہے۔

کتاب کا لفظ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں کئی معنوں میں استعمال کیا ہے۔ ایک تو اسی کتاب کے لیے کہ جو قرآن مجید کی صورت میں ہے۔ یا اس سے پہلے تورات اور انجیل کی صورت میں یا دیگر الہامی کتابوں کی صورت میں جو اللہ نے اپنے انبیا کو دیں۔ کتاب کا لفظ نوشتۂ تقدیر کے

معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ یہ لفظ اعمال نامے کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے اور اللہ کے احکام کے لیے بھی۔

ایک مقام پر قرآن مجید میں ہے:

حٰمٓ ۞ تَنْزِیْلُ الْکِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِیْزِ الْحَکِیْمِ ۞ (الجاثیۃ: ۱، ۲)

''ح م۔ اس کتاب کا نزول اللہ کی طرف سے ہے جو زبردست اور حکیم ہے۔''

اس کے دو معنی ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ اسی قرآن مجید کے اندر ان تمام الہامی کتابوں کی تعلیم کو محفوظ کر دیا گیا ہے جو پہلے سے موجود تھیں۔ اس کے دوسرے معنی یہ ہو سکتے ہیں کہ اس کے احکام بڑے سیدھے سادھے، صاف، مستقیم اور محکم ہیں جو اس میں لکھے ہوئے ہیں۔ کُتُبٌ کے معنی کتابیں نہیں ہیں بلکہ اللہ کے وہ احکام ہیں جو قرآن مجید میں بیان کر دیے گئے ہیں۔ بعض لوگوں نے کہا کہ اس سے مراد قرآن مجید کی تمام تعلیمات ہیں۔ بیش تر اسی فکر کے حامل ہیں۔

اب اگر ایک بار پھر آیت کے ابتدائی حصے، یعنی اہل کتاب اور مشرکین نے کفر کیا، کا جائزہ لیں تو یہاں قرآن مجید نے اس بات کی صراحت نہیں کی کہ لوگوں نے کس چیز سے کفر کیا۔ لیکن اس کے معنی واضح ہیں کہ انھوں نے رسالت محمدیؐ اور قرآن مجید کا انکار کیا، یا بعض لوگوں کے نزدیک اس میں کفر کی ہر صورت شامل ہے۔ اگر کوئی یہ کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہے لیکن اس کی صفات کا انکار کرتا ہے تو وہ بھی کفر کرتا ہے۔ اگر کوئی اللہ کے ساتھ کسی کو شریک بناتا ہے تو یہ بھی کفر ہے۔ اگر کوئی اللہ کا انکار کرتا ہے تو یہ بھی کفر ہے، اور اگر کوئی اللہ کے احکام کا انکار کرتا ہے تو یہ بھی کفر ہی ہے۔ کفر کی ان ساری شکلوں کو اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں مختلف مقامات پر بیان کیا ہے۔ گویا کفر کی ساری شکلیں اس کے اندر شامل ہیں۔ قرآن مجید کے نازل ہونے کا مقصد اور غایت بھی یہی ہے کہ انسان کفر کی لعنت سے نکل سکے۔ اگر یہ کھلی، روشن کتاب نہ آتی، یا اگر اللہ کا رسولؐ اس کھلی، روشن کتاب کو لے کر نہ آتا، جس کی کہ وہ تلاوت فرما رہے ہیں اور جس کا پیغام وہ پہنچا رہے ہیں، جو لکھی ہوئی کتاب ہے اور ہر گندگی، آلائش اور سقم سے پاک ہے اور جس کے اندر وہ احکام اور تعلیمات دی گئی ہیں کہ جو سیدھی سادی، آسان، ہر قسم کے شک وشبہے سے پاک اور صراطِ مستقیم کی طرف رہنمائی کرنے والی ہیں، انسانیت کے لیے، چھٹی صدی عیسوی میں بھی اور آنے والے کسی بھی دور میں کفر و شرک کی لعنت و گمراہی سے نکلنا ممکن نہ ہوتا۔ آج بھی اسی بینہ، اسی رسولؐ،

اسی کتاب کے بغیر انسانیت کے لیے ان تمام لعنتوں، عذابوں، تکالیف، مشکلات اور مصائب سے چھٹکارا ممکن نہیں ہے، جو کفر و شرک کی وجہ سے انسانیت کو درپیش ہیں۔

اس پر اگر ایک اور پہلو سے غور کریں تو اس کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ یہاں دراصل ان اہل کتاب اور مشرکین کا قول نقل کیا جا رہا ہے کہ جو یہ کہتے تھے کہ وہ اس وقت تک کفر نہیں چھوڑیں گے جب تک کہ ان کے پاس بینۃ نہ آ جائے۔ یہ بینۃ اس صورت میں طلب کرتے تھے کہ آسمان سے کوئی فرشتہ نازل ہو اور کتاب لے کر آئے اور پھر کتاب کو ان کی نگاہوں کے سامنے پڑھ کر سنائے۔ اس کے بعد وہ کفر چھوڑ کر ایمان کی روش پر آئیں گے۔ قرآن مجید میں یہی بات مختلف جگہ پر نقل کی گئی ہے کہ لوگ کہتے ہیں کہ آسمان سے فرشتہ کیوں نہیں اترتا، ورق کیوں نہیں آتے پھر ہم دیکھتے کہ اللہ کی کتاب کون سی ہے۔ جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کو الواح پر لکھ کر تورات دی گئی تھی اسی طرح قرآن مجید لکھ کر کیوں نہیں حوالے کیا گیا؟ ایک دوسری جگہ یہودی ذہنیت کی طرف اشارہ یوں کیا گیا ہے کہ یہودی بار بار کہتے ہیں کہ یہ لے آؤ، وہ لے آؤ، طرح طرح کے مطالبات کرتے اور اعتراضات اٹھاتے ہیں۔ لہٰذا اس سے یہ معنی بھی لیے جا سکتے ہیں کہ دراصل یہ یہود کا قول ہے اور ان کا یہ مطالبہ تھا کہ ہمیں کوئی معجزہ دکھایا جائے یا جس طرح پتھر کی سلوں پر لکھ کر تورات کے احکام دیے گئے تھے اس طرح احکام دیے جائیں، تب جا کر ہم مانیں گے، زبانی کلامی ہم ماننے کے دینے والے نہیں ہیں۔

یہاں پر دونوں معنی لیے جا سکتے ہیں۔ قرآن مجید کا ایک ہی آیت کے مختلف معنی بیان کرنے کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ ان معنوں میں کوئی اختلاف ہے، یا ان میں کوئی تضاد پایا جاتا ہے۔ یہ دراصل ایک ہی آیت کے مختلف پہلو ہوتے ہیں جو مختلف مفسرین بیان کرتے ہیں۔ اگر ہم بینۃ کے معنی قرآن مجید کو لیں یا حضور ﷺ کی ذات کو لیں، یا جبریل علیہ السلام کو لیں تو یہ دراصل ایک ہی بات کے تین پہلو ہیں۔ حضورؐ رسول اس لیے تھے کہ اللہ نے آپؐ کو قرآن مجید کی نعمت دی اور رسالت کا فریضہ بھی یہ تھا کہ آپؐ قرآن مجید کی نعمت کو انسانوں تک پہنچائیں۔ حضور ﷺ، قرآن مجید اور جبریل امین علیہ السلام، ان تینوں میں ہدایت کے پہلو سے کوئی فرق نہیں ہے اور یہ ایک ہی بات کے تین مختلف پہلو ہیں۔ اسی طرح یہ بات کہ وہ لوگ ماننے والے نہیں ہیں جو کفر کی روش پر گامزن ہیں یہاں تک کہ ان کے پاس بینۃ آ جائے، یا یہ کہ یہ کفر کی لعنت سے نہیں نکلیں گے جب

تک کہ یہ اس کی پیروی نہیں کریں گے کہ جو کتاب اللہ کے رسول لے کر آئے ہیں یا یہ کہ یہ یہود کا قول ہے۔ یہ بھی ایک ہی بات کے مختلف پہلو ہیں۔

وَ مَا تَفَرَّقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنَةُ ۝
(البینۃ:۴)

"پہلے جن لوگوں کو کتاب دی گئی تھی ان میں تفرقہ برپا نہیں ہوا مگر اس کے بعد کہ ان کے پاس (راہِ راست کا) بیان واضح آ چکا تھا۔"

یہ دراصل اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ بینہ کا آ جانا بھی اس بات کے لیے کافی نہیں ہے کہ جو ہٹ دھرمی، ضد اور غرور کے اندر مبتلا ہو، جس کے دل میں خدا کا خوف اور خشیت نہ ہو وہ ہدایت پا لے گا۔ اس کی مثال اہل کتاب ہیں۔ اہل کتاب نے طرح طرح کے معجزات کا مطالبہ کیا اور سب معجزات ان کو دکھائے گئے۔ یہودیوں کے اوپر من وسلویٰ بھی اترا، طور کا پہاڑ بھی ان کے سروں پر کھڑا کر دیا گیا، ان کو لکھ کر کتاب بھی دی گئی اور بے شمار معجزات ہیں جو ان کے سامنے آئے لیکن اس سب کے باوجود انھوں نے گمراہی کا راستہ ہی اختیار کیا۔ اسی طرح یہودیوں کے درمیان حضرت مسیح علیہ السلام آئے۔ انھوں نے مردوں کو زندہ کر کے دکھایا، مٹی کے پرندے بنائے اور ان کے معجزے سے وہ اڑنے لگے، کوڑھی اچھے ہو گئے، اندھے دیکھنے لگے، معذور چلنے لگے لیکن وہ یہودی جو کہ نہ ماننے پر تلے ہوئے تھے جو اپنے بارے میں بڑائی کا زعم رکھتے تھے، استکبار، کبر اور حسد کی بیماری کے اندر مبتلا تھے، آنکھیں رکھنے کے باوجود صراطِ مستقیم نہ دیکھ سکے۔ اس کے باوجود کہ وہ چل سکتے تھے مگر صحیح راہ پہ نہ چلے۔ گو اخلاقی طور پر وہ مردہ ہو چکے تھے لیکن حضرت عیسیٰ علیہ السلام زندگی کا جو پیغام لے کر آئے تھے، اس سے انھوں نے کوئی رہنمائی حاصل نہ کی۔ بینہ آنے کے بعد بھی اہل کتاب انکار اور کفر کی راہ پر ہی چلے۔ گویا بینۃ کا آنا بھی ہدایت کے لیے کافی نہیں ہے بلکہ اس کے لیے کسی اور چیز کی ضرورت ہے، جس کا ذکر اس سورہ کے آخر میں کیا گیا ہے۔

وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۙ۬ حُنَفَآءَ وَ يُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَ يُؤْتُوا الزَّكٰوةَ وَ ذٰلِكَ دِيْنُ الْقَيِّمَةِ ۝ (البینۃ:۵)

"اور ان کو اس کے سوا کوئی حکم نہیں دیا گیا تھا کہ اللہ کی بندگی کریں، اپنے دین کو اس کے لیے خالص کر کے، بالکل یک سو ہو کر، اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں۔ یہی نہایت صحیح و درست دین ہے۔"

جو لوگ دین کی پیروی اختیار کرنے اور اس کے مطالبات پورے کرنے کے لیے معجزات طلب کر رہے تھے، ان کے سامنے اب دین کے بنیادی مطالبات رکھے جا رہے ہیں، جو بہت صاف سیدھے سادے اور مختصر ہیں۔ ان میں کوئی گنجلک، پیچیدہ پن اور کوئی مشکل چیز نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو ہدایت آئی ہے وہ کوئی الجھی ہوئی بات نہیں بلکہ موٹی موٹی تین باتوں پر مشتمل ہے، اگر چہ یہ دین باتیں پورے دین کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہیں۔

ایک یہ کہ خلوص نیت کے ساتھ صرف اللہ کی بندگی کرو۔ مُخْلِصِیْنَ کے معنی وہ لوگ ہیں جو پوری زندگی صرف اللہ کی بندگی کریں اور ان کی نیت بھی خالص ہو۔ کچھ حصہ اللہ کی بندگی میں اور کچھ حصہ اللہ کے علاوہ دوسرے معبودوں کی بندگی میں نہ گزاریں۔ اخلاص کے معنی بھی یہی ہیں کہ نیت صرف اللہ کے لیے خالص ہو اور پوری زندگی میں پوری بندگی صرف اللہ کے لیے مخصوص ہو۔ دین کا ترجمہ زندگی بھی کیا جاتا ہے اور بندگی بھی۔ مطلب ایک ہی ہے اور وہ یہ ہے کہ اللہ کے علاوہ کوئی معبود نہ ہو۔

اسی اخلاص کو پھر کھول کر بیان فرمایا اور اللہ کی بندگی کی دو صفات بیان کیں۔ ایک یہ کہ مُخْلِصِیْنَ ہوں اور دوسرے یہ کہ حنفاء ہوں۔ حُنَفَآء کے معنی یہ ہیں کہ جو سب سے کٹ کر صرف اللہ کا ہو جائے اور اللہ کے علاوہ کسی دوسرے کی طرف اس کی توجہ نہ ہو۔ توجہ کے معنی ہیں جیسے کسی انسان کی کسی انسان کی طرف توجہ ہوتی ہے، مثلاً باپ کی بیٹے کی طرف۔ ایسا ہی معاملہ معبود اور بندے کا بھی ہے۔ انسان کی پسند ناپسند، محبت و نفرت اور دوستی دشمنی کا معیار صرف اللہ کی ذات ہو۔ اگر کسی کو محبت کرنی ہو تو صرف اللہ کی ذات سے کرنی چاہیے جو ڈوبنے والی نہیں ہے، جسے کبھی زوال یا فنا نہیں ہے، جو کبھی ہلاک نہیں ہوگی۔ اسی طرح ہم پوری زندگی اللہ کے حوالے کر دیتے ہیں:

قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَ نُسُکِیْ وَ مَحْیَایَ وَ مَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝
لَا شَرِیْکَ لَہٗ (الانعام: ۱۶۲، ۱۶۳)

”کہو، میری نماز، میرے تمام مراسم عبودیت، میرا جینا اور میرا مرنا، سب کچھ اللہ رب العالمین کے لیے ہے، جس کا کوئی شریک نہیں۔“

اللہ کے مخلص بندے اور حنیف کا بہتری ماڈل حضرت ابراہیم علیہ السلام تھے۔ وہ ہر وقت اور ہر حال میں اللہ کی اطاعت کے لیے اور اس کی رضا و خوشنودی کے لیے ہر طرح کی

قربانی پر آمادہ رہتے تھے کہ اللہ تعالیٰ جو حکم دے وہ اس کی اطاعت کریں۔

اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗۤ اَسْلِمْ ۙ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ○ (البقرۃ:۱۳۱)

''جب اس کے رب نے اس سے کہا ''مسلم ہو جا'' تو اس نے فوراً کہا: میں مالک کائنات کا ''مسلم'' ہو گیا۔''

جب بھی ان سے ان کے رب نے کہا کہ یہ کام کرو، یہ راہ اختیار کرو، میری اطاعت کرو، وہ اس کی اطاعت اور پیروی کے لیے حاضر ہوتے تھے۔ اسی لیے لوگوں نے اس کا ترجمہ ابراہیم علیہ السلام کی راہ پر بھی کیا ہے۔ یہ حنیف کی بہترین مثال ہے۔

یہاں پہلا حکم اخلاص کے ساتھ اللہ کی بندگی کا دیا گیا ہے۔ ہر زمانے میں، ہر نبی کی زبان سے پہلا حکم یہی دیا گیا۔ یہ بات دوسری جگہ قرآن مجید نے کھول کر بیان کر دی کہ ہر زمانے میں جو بھی اللہ کا رسول آیا وہ یہی ایک پیغام لے کر آیا۔ یہ بات بھی بیان فرمائی گئی ہے کہ ہر قوم میں اللہ کا رسول ضرور آیا۔ ہندستان میں بھی آیا ہو گا، اور جگہ بھی آیا ہو گا۔ اگرچہ سب کے نام قرآن نے بیان نہیں کیے، لیکن اس بات کی بڑی صراحت سے وضاحت کی ہے کہ ہم نے ہر قوم میں اپنا نبی یا پیغمبر ضرور بھیجا ہے۔ سب ایک ہی پیغام لے کر آئے۔ سب کا یہی پیغام تھا کہ تم اللہ کی بندگی کرو، صرف اسی کو اپنا الٰہ بناؤ، اپنی زندگی کو اس کے لیے خالص کر لو اور اس کے علاوہ جو بھی اللہ کے باغی ہیں اور طاغوت ہیں ان سے اپنے آپ کو دور کر لو۔ ہر ایک نے اللہ کا یہی پیغام دیا:

اِنَّنِیْۤ اَنَا اللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنَا فَاعْبُدْنِیْ ۙ وَ اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِیْ ○ (طٰہٰ:۱۴)

''میں ہی اللہ ہوں۔ میرے سوا کوئی خدا نہیں ہے، پس تو میری بندگی کر اور میری یاد کے لیے نماز قائم کر۔''

دوسرا حکم نماز قائم کرنے کے بارے میں دیا گیا ہے۔ 'نماز کا قائم کرنا' دراصل قرآن مجید کی ایک اصطلاح ہے۔ اس کے معنی محض یہ نہیں ہے کہ ایک مذہبی رسم کی بطورِ عبادت بجا لائے، بلکہ نماز انسان کے جسم، روح، ذہن، زبان، اور اپنی پوری شخصیت کو اللہ کو بندگی میں میں لا کر حاضر کر دینے اور سپر ڈال دینے کا نام ہے۔ حالت نماز میں آدمی کا رُخ بھی اللہ کی طرف ہوتا ہے، چہرہ اور نگاہیں بھی اللہ کی طرف ہوتی ہیں، آدمی اللہ کے حضور ہی میں کھڑا ہوتا ہے، اسی کے

سامنے جھکتا ہے، دوزانوں ہوکر بیٹھتا ہے، اپنی پیشانی ٹیکتا ہے اور زبان سے جو کچھ نکلتا ہے اس میں بھی اللہ کی تسبیح و تحلیل ہوتی ہے، ذہن میں بھی اسی کا خیال ہوتا ہے اور دل میں بھی اسی کی محبت ہوتی ہے۔ دراصل نماز اللہ کی بندگی اور اس سے تعلق ناپنے کا ایک عمدہ نمونہ اور پیمانہ ہے۔ مومن کی پوری زندگی اسی نماز کا نمونہ ہونی چاہیے۔ سیاست ہو یا معیشت، تجارت ہو یا خاندانی زندگی یا بیوی بچے، غرض انسان جہاں بھی جائے، اس کے سارے بدن کے افعال اور اعمال، اس کا ذہن، اس کی زبان، اس کا قول، سب اللہ کی بندگی و طاعت کریں۔ ان معنوں میں اللہ نے نماز کو قائم کرنے کا حکم دیا ہے۔ نماز بحیثیت ایک رسمی عبادت کے، جسے ہم اور آپ پڑھتے ہیں، دراصل اسی کی ایک علامت اور تربیت کا ذریعہ ہے اور یہ اس بات کے لیے تیار کرتی ہے کہ پوری زندگی اللہ کی بندگی میں بسر ہوتی چلی جائے۔

نماز کے بعد دوسرا حکم جو بار بار دیا گیا ہے وہ زکوٰۃ کی ادائیگی کا ہے۔ یہ بھی اس لیے ہے کہ جسم و ذہن اور بدن و دماغ کے علاوہ آدمی کے پاس جو کچھ بھی مال و متاع ہو، یعنی دنیا کا مال و دولت، مکان، جائداد، بنک بیلنس یا کارخانہ وغیرہ، سب کچھ اللہ کی بندگی میں لگنا چاہیے اور اس کے حکم کے مطابق کمایا جانا چاہیے، اور اس میں سے جو حصہ اس نے مقرر فرما دیا ہے وہ اس میں سے نکال کر راہِ خدا میں دیا جانا چاہیے۔

یہ ہیں اسلام کی بنیادی تعلیمات جو بالکل صاف، واضح اور سادہ ہیں۔ ان کو سمجھنے کے لیے اور ان پر عمل درآمد میں کوئی مشکل نہیں ہے۔ ہر نبی یہی پیغام لے کر آیا ہے، ہر ایک نے اسی بندگی کی دعوت دی اور جن کو کتاب بھی دی گئی انھیں بھی یہی تعلیم دی گئی۔ اتنی واضح تعلیمات، ٹھوس دلائل بینہ، دلیل روشن، وحی الٰہی، کتاب اللہ اور اللہ کے رسول کے آنے کے بعد بھی جس نے راہِ ہدایت سے منہ موڑا، اور معجزات طلب کیے، ایسے لوگوں پر معجزات بھی کیا اثر انداز ہوں گے۔

یہ اسلام کی بنیادی تعلیمات ہیں۔ ان کی اہمیت کے پیش نظر بار بار مختلف حوالوں سے ان کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ لیکن اتنی تاکید کے باوجود اللہ کی بندگی کے ساتھ دوسری بندگیاں شامل کر دی گئیں۔ ایمان کے مقابلے میں کفر اور شرک اختیار کیا گیا۔ نماز کو بھی ضائع کر دیا گیا۔ یہ محض ایک رسم بن کر رہ گئی اور لوگ اپنی خواہشات کی پیروی کرنے لگے۔

فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ

فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا (مریم:۵۹)

''پھر ان کے بعد وہ ناخلف لوگ ان کے جانشین ہوئے جنھوں نے نماز کو ضائع کیا اور خواہشاتِ نفس کی پیروی کی، پس قریب ہے کہ وہ گمراہی کے انجام سے دوچار ہوں۔''

نماز کو ضائع کرنا، نماز کو چھوڑنا ہے۔ آج مسلمانوں کی اکثریت نے نماز کو ترک کر دیا ہے اور جو پڑھنے والے ہیں انھوں نے بھی نماز کو ان معنوں میں قائم نہیں کیا کہ نماز کی طرح پوری زندگی کو اللہ کی بندگی میں دے دیا جائے۔ نماز تو فحش اور منکرات سے روکتی ہے لیکن جو شخص نماز پڑھے اور گناہوں، منکرات اور فواحش کا اسی طرح مرتکب ہو جیسا کہ ایک بے نمازی ہوتا ہے، اس کی مثال ایسی ہے کہ جیسے کوئی شخص پانچ وقت نہر میں غسل کرے، لیکن گندگیاں اور ساری آلائشیں اُسی طرح لے کر واپس چلا جائے جو کہ نہانے سے قبل اس کے بدن پر لگی ہوئی تھیں۔ گویا نمازی نماز کے لیے وضو کرے، نماز ادا کرے لیکن اس کا اس پر کوئی اثر نہ پڑے۔ تربیتی کورس تو پورا ہو جائے لیکن اس کا کوئی اثر عملی زندگی پر نہ پڑے تو یہ تربیت کو ضائع کرنے کے مترادف ہے۔ یہ اسی طرح ہے کہ نصاب سارا پڑھا جائے، کتاب پوری پڑھی جائے لیکن پلے کچھ نہ پڑے۔ یہ نماز کو ضائع کرنا ہے۔ کچھ ایسا ہی معاملہ زکوٰۃ کے ساتھ ہے۔ اس کی تقسیم کا طریقہ ایسا نکالا گیا یا تو یہ مخصوص مذہبی گھرانوں تک محدود ہو کر رہ گئی یا پھر نمود و نمائش کا ذریعہ بن کر رہ گئی کہ لمبی لمبی لائنیں لگوا کر زکوٰۃ کو تقسیم کیا جاتا ہے۔ اس طرح زکوٰۃ کا نظام بھی درہم برہم ہو کر رہ گیا۔ اس طرح دین کی بنیادی تعلیمات مٹ گئیں، دین کی بنیادیں ڈھے گئیں۔ یہی وہ تعلیمات ہیں جن کے لیے قرآن نے 'دین قیم' کی اصطلاح استعمال کی ہے۔

دِيْنُ الْقَيِّمَةِ کے عربی گرامر کے لحاظ سے دو معنی ہیں۔ ایک یہ کہ یہ دین اس ملت کا دین ہے جو کہ ملت قیمہ ہے، جو صحیح، راست اور صراطِ مستقیم پر قائم ہے اور محکم امت ہے۔ اس کے دوسرے معنی صفت موصوف کے لحاظ سے یہ ہیں کہ یہی وہ مضبوط دین ہے، جس کی اللہ تعالیٰ نے تعلیم فرمائی ہے۔

ان پانچ آیات سے دو باتیں بالکل واضح ہو گئی ہیں۔ پہلی بات تو یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی جو ہدایت بھیجی ہے وہ سیدھی، صاف اور سچی ہے اور تین باتوں پر مشتمل ہے۔ ایک یہ کہ آدمی ہر طرف سے کٹ کر اللہ کا ہو جائے، صرف اس کی بندگی کرے، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ

ٹھیرائے، اپنی نیت کو خالص کر کے صرف اسی کی بندگی کے لیے اپنی زندگی کو مخصوص کر دے۔ دوسرا یہ کہ اللہ نے اسے جو کچھ بھی دیا ہے، مال و دولت، سرمایہ، صلاحیتیں، سب کچھ اسی کے حوالے کر دے۔ تیسرا یہ کہ نماز کو قائم کرے اور اپنے مالِ دنیا میں سے وہ حصہ نکال کر راہِ خدا میں دے جو اللہ نے دوسروں کے لیے مقرر کیا ہے، یعنی زکوٰۃ ادا کرے۔ یہ بالکل واضح تعلیمات ہیں، نہ ان کو سمجھنا مشکل ہے اور نہ جاننا ہی مشکل ہے کہ یہ مطالبہ کس لیے کیا جا رہا ہے۔ لیکن انسان حسد، کبر اور دنیا پرستی کا شکار ہو جاتا ہے، اور چوں کہ دل اللہ کی خشیت سے خالی ہوتے ہیں، اس لیے پھر مان کے نہیں دیتا۔ پھر اس کے لیے نماز بھی مشکل ہو جاتی ہے، مال نکالنا بھی مشکل ہو جاتا ہے اور اپنی زندگی کو اللہ کے لیے خالص رکھنا بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں، جو مان کے نہیں دیتے اور ان لوگوں کی ہدایت و رہنمائی کے لیے اور ان پر اتمامِ حجت کے لیے روشن دلیل، کھلی نشانی، بینہ، اللہ کا رسول اور کتاب نازل کی جاتی ہے۔

اس طرح دو گروہ سامنے آ جاتے ہیں۔ ایک وہ جو اطاعت کرنے والا ہے اور دوسرا وہ جو نافرمان، سرکش اور کھلی کھلی نشانیوں کے باوجود ماننے کے لیے تیار نہیں ہے۔ اس کے بعد ان دونوں گروہوں کا کیا انجام ہونے والا ہے؟ اور ان کا اللہ کے نزدیک کیا مقام ہے؟ اس کو بیان فرمایا ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَالْمُشْرِكِيْنَ فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ اُولٰٓئِكَ هُمْ شَرُّ الْبَرِيَّةِ ۝ (البینۃ:۶)

"اہلِ کتاب اور مشرکین میں سے جن لوگوں نے کفر کیا ہے وہ یقیناً جہنم کی آگ میں جائیں گے اور ہمیشہ اس میں رہیں گے، یہ لوگ بدترین خلائق ہیں۔"

یہاں دو باتوں کا ذکر فرمایا گیا ہے: ایک نارِ جہنم کا جس میں ہمیشہ رہنا ہے، اور دوسرا ایسی مخلوق کا جو ساری مخلوق میں سے بدترین مخلوق ہے۔ یہ دونوں باتیں دراصل اسی سلسلۂ کلام کا حصہ ہیں جو پہلی سورتوں میں بیان ہوا ہے۔ انسان کے بارے میں کہا گیا ہے کہ ہم نے اسے احسنِ تقویم میں پیدا کیا ہے، بہترین صلاحیتوں سے آراستہ کیا ہے لیکن جب وہ نیچے گرتا ہے تو اتنا گرتا ہے کہ اس کی مثال کوئی دوسری مخلوق پیش نہیں کر سکتی۔ جب تباہی مچاتا ہے، قتل و غارت گری کرتا ہے، ظلم ڈھاتا ہے، فساد پھیلاتا ہے تو پھر درندوں کو بھی پیچھے چھوڑ جاتا ہے۔ جو لوگ آنکھیں رکھنے کے باوجود نہ دیکھیں، کان رکھنے کے باوجود نہ سنیں، اور عقل رکھنے کے باوجود نہ سوچیں تو

ان کے بارے میں قرآن مجید نے کہا ہے:

اُولٰٓئِکَ کَالۡاَنۡعَامِ بَلۡ هُمۡ اَضَلُّ ؕ اُولٰٓئِکَ هُمُ الۡغٰفِلُوۡنَ ۝
(الاعراف:۱۷۹)

''وہ جانوروں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ گئے گزرے، یہ وہ لوگ ہیں جو غفلت میں کھوئے ہوئے ہیں۔''

حضورؐ کے زمانے میں جو لوگ حق کا انکار کر رہے تھے، ان کے انکار کی ایک بڑی وجہ ان کا کبر تھا۔ ان کا اپنے آپ کو بڑا سمجھنا کہ ہم تو سردار ہیں، ہمارے پاس مال و دولت ہے، اور ہم اونچے منصب پر فائز ہیں۔ اس تصور پر بھی اللہ تعالیٰ نے ضرب لگائی ہے اور فرمایا کہ جو لوگ یہ روش اختیار کرتے ہیں وہ اپنے آپ کو اعلیٰ اور برتر نہ سمجھیں بلکہ وہ اللہ کی ساری مخلوقات میں سے جن میں جانور بھی شامل ہیں، سب سے بدتر مخلوق ہیں۔ حقیقت میں ان کا ٹھکانہ جہنم کی آگ ہے، جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔

اس کے بعد اس گروہ کا ذکر کیا جا رہا ہے، جو ایمان لایا اور جس نے عمل صالح کیے۔ فرمایا:

اِنَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِکَ هُمۡ خَیۡرُ الۡبَرِیَّةِ ؕ۝
(البیّنۃ:۷)

''جو لوگ ایمان لے آئے اور جنھوں نے نیک عمل کیے، وہ یقیناً بہترین خلائق ہیں۔''

اللہ کے ہاں برتری کا معیار حسب ونسب، رنگ، نسل، یا دولت نہیں بلکہ ایمان، عمل صالح اور اعلیٰ اخلاق ہے۔ لہٰذا جن لوگوں نے انکار کی روش اختیار کی وہ اللہ کی مخلوق میں سب سے بدترین مخلوق ہیں اور جنھوں نے ایمان اور عمل صالح کی راہ اختیار کی، وہ اللہ کی مخلوق میں سب سے بہترین مخلوق ہیں۔ ان لوگوں کے لیے اللہ کے پاس کیا اجر ہے، اس کا تذکرہ یوں کیا ہے:

جَزَآؤُهُمۡ عِنۡدَ رَبِّهِمۡ جَنّٰتُ عَدۡنٍ تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ
خٰلِدِیۡنَ فِیۡهَآ اَبَدًا ؕ (البینہ:۸)

''ان کی جزا، ان کے رب کے ہاں دائمی قیام کی جنتیں ہیں، جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی، وہ ان میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔''

بظاہر تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہاں صرف جنتوں کا ذکر فرمایا ہے لیکن اگر غور

کیا جائے تو اللہ نے اس آیت میں مومنین کے لیے جو جزا، فضل وکرم اور عنایات آخرت میں، جنت میں رکھی ہیں، اس کے بہت سارے پہلو کھول کر سامنے رکھ دیے ہیں۔

پہلی بات جزا و انعام سے متعلق ہے۔ یہ فرما کر کہ یہ جزا ان کے رب کے پاس ہے، اہل ایمان کو یہ یقین اور اطمینان دلایا گیا ہے کہ ان کا اجر ضائع ہونے والا نہیں۔ اس لیے کہ یہ جزا وانعام وہی ہستی دے گی جو رب العالمین ہے اور اس سے بڑھ کر کوئی نہیں ہے، جس کی بہترین جزا، بے شمار کرم فرمائیوں اور عنایات سے ہر شخص مستفید ہو رہا ہے خواہ وہ مسلم ہو یا غیر مسلم۔ جب ایسے فیاض رب کو اجر دینا ہو، تو نہ صرف اجر محفوظ ہے بلکہ بہترین اور بہت بڑے پیمانے پر انعام و اکرام کا ملنا یقینی ہے۔

رب کے اندر وہ سب کچھ آ گیا کہ جو اللہ کے بارے میں کہا جاسکتا ہے۔ اس کی پرورش، اس کی نعمتیں، اس کی طرف سے فراوانیاں، بخششیں اور عطائیں، یہ سب ہم دنیا کے اندر دیکھتے ہیں جو بے پناہ ہیں اور وہ یہ چیزیں کافروں اور مشرکوں، سب کو دیتا ہے۔ اسی رب کے پاس چوں کہ ایمان اور عمل صالح کا بدلہ محفوظ ہے اور وہ جنتوں اور بہترین باغات کی صورت میں ہے۔ وہ باغات کہ جن کی خصوصیت یہ بیان ہوئی ہے کہ یہ ہمیشہ رہنے کی جگہ ہے۔

فی الواقع یہ بہت بڑی نعمت ہے۔ دنیا کی عارضی زندگی میں ہر لمحے، ہر لحظے، ہر چیز آدمی سے چھن جانے کا خوف طاری رہتا ہے، نہ جانے کب سانس بند ہو جائے اور جان نکل جائے، نہ جانے کب مکان، دھن، دولت جو کچھ اللہ نے دیا ہے وہ چھن جائے۔ وہ رشتے دار اور دوست احباب جو انسان کو بہت عزیز ہوتے ہیں، جن کے درمیان آدمی زندگی بسر کرتا ہے ان میں سے کب کون مر جائے گا یہ کوئی نہیں جانتا؟ دنیا میں کوئی بھی چیز ایسی نہیں ہے کہ جو ختم ہونے کے خطرے سے محفوظ ہو۔ ہر چیز کو مٹ جانا ہے۔ اس کے مقابلے میں یہاں بار بار کہا گیا ہے کہ جنت وہ جگہ ہے جو ہمیشہ ہمیشہ رہنے کی جگہ ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو جنت خدا کی عظیم نعمت ہے، جس کا کوئی بدل نہیں ہے۔

ایک اور پہلو ہے جو بار بار واضح کیا گیا ہے وہ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ (البینہ:۸) ہے، جس کا ترجمہ عام طور پر یہ کیا جاتا ہے کہ جس کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔ دراصل نہر تو نیچے ہی ہوتی ہے لیکن قرآن نے اس لفظ کو جن معنوں میں استعمال کیا ہے، اس کا زیادہ صحیح مطلب یہ ہے کہ باغات

کے درمیان نہریں بہہ رہی ہوں گی۔ نہروں کے بہنے کی جو تشبیہ اللہ تعالیٰ نے دی ہے اس کا مطلب تازگی اور شادابی ہے اور یہ کہ اس بات کے قائم و دائم رہنے کا پورا انتظام اس باغ کے اندر ہی ہے۔ یہ باغ کیسا ہے؟ یہ نہریں کیسی ہیں؟ یہ ہم نہیں جان سکتے، اس لیے کہ یہ پہلو علم الغیب سے تعلق رکھتا ہے، یہ علوم غیبی میں سے ہے، جس کا علم انسان کو نہیں ہو سکتا۔ البتہ کسی جگہ یا مقام کے بارے میں جو اعلیٰ سے اعلیٰ تصور کیا جا سکتا ہے، وہ تصور قرآن نے جنت کا پیش کیا ہے اور اس کے لیے ہماری زبان کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ جس جگہ کوئی باغ ہو اور باغ کی سیرابی کا انتظام بھی باغ کے اندر ہی ہو تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ باغ ہمیشہ سرسبز و شاداب اور تر و تازہ رہے گا اور اس کے اندر جو پھل آئیں گے وہ بھی بہت عمدہ اور سدا بہار ہوں گے۔ یہ دراصل ہمیشگی اور دوام کا ایک تصور ہے۔

پھر فرمایا: خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ؕ (البینہ:۸) یعنی باغ بھی ہمیشہ رہنے والے ہیں اور ان میں رہنے والے بھی ان میں ہمیشہ رہیں گے۔ یہاں بھی دو باتیں الگ الگ کہی گئی ہیں۔ اگر ایک طرف باغات کی یہ صفت بیان ہو رہی ہے کہ یہ وہ باغات ہیں جو دنیا کے باغات، محل اور مال و اسباب کے مقابلے میں ہمیشہ ہمیشہ رہنے والے ہیں، تو دوسری طرف یہ خوبی کہ جو لوگ ان میں داخل ہوں گے وہ بھی ان میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رہیں گے۔ وہاں موت نہیں آئے گی اور موت ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے گی۔ موت کے ذریعے آدمی اللہ کے پاس پہنچے گا تو پھر جنت میں موت نہیں آئے گی۔ یہ سارے کے سارے انعامات ان کے لیے ہیں جو مخلوق میں سب سے بہتر ہیں اور جو اللہ کے واضح، روشن اور سیدھے سادے دین کو قبول کر لیں، اپنے آپ کو اللہ کے لیے خالص کر لیں، اس کے بن جائیں اور اس کی بندگی اپنے جسم و جان کے ساتھ بھی کریں اور اپنا مال اور جو بھی نعمتیں اللہ تعالیٰ نے دی ہیں اسی کی بندگی میں اور اسی کے حکم کے مطابق کھپائیں اور خرچ کریں۔

نعمتوں کا یہ بیان یہیں ختم نہیں ہوا بلکہ فرمایا:

رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَ رَضُوْا عَنْهُ ؕ (البینہ:۸)

”اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے۔“

رب کے ہاں دائمی قیام کی نعمتیں تو اہلِ جنت کو حاصل ہوں گی ہی، لیکن سب سے بڑھ کر نعمت یہ ہوگی کہ اللہ تعالیٰ ان سے راضی اور خوش ہوگا۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک غلام اور بندے کے لیے اپنے آقا اور معبود کی خوشنودی اور رضامندی سے بڑھ کر کوئی اور انعام نہیں ہو سکتا۔ آدمی جسے محترم سمجھتا

ہو، جس سے محبت کرتا ہو، جس کا اپنے آپ کو غلام سمجھتا ہو، اس کی ایک نگاہ اس کے لیے دنیا اور دنیا کی ساری نعمتوں سے زیادہ بیش قیمت اور محبوب ہوتی ہے۔ باپ اور بیٹے کے تعلق ہی کو دیکھ لیجیے۔ باپ، بیٹے کو کچھ بھی کہے لیکن محبت بھرا بول، محبت کی نظر اور شفقت کا ہاتھ بیٹے کے لیے سب سے بڑھ کر محبوب ہوتا ہے۔ دراصل یہاں یہ فرمایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہوجائے گا اور وہ اس سے راضی ہوجائیں گے اور جو کچھ ان کو دیا جائے گا وہ اس سے نہال ہوجائیں گے۔ سورۂ ضحیٰ میں اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیؐ سے کہا تھا: وَلَسَوْفَ يُعْطِيْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى ۝ (الضّحی:۵) ''عنقریب تمھارا رب تم کو اتنا دے گا کہ تم خوش ہوجاؤ گے۔'' لیکن یہاں جو انعام ہے وہ سب کے لیے عام کر دیا کہ جو آپؐ کی پیروی کرے گا اس کو بھی اللہ تعالیٰ اتنا دے گا کہ وہ نہال ہوجائے گا، اللہ اس سے خوش ہوجائے گا اور وہ اللہ سے راضی۔

ایک حدیث میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ اہلِ جنت کو پکارے گا کہ کیا وہ راضی ہیں، اور وہ جواب میں کہیں گے کہ ہاں، ہم راضی ہیں اور آپ نے ہم کو سب کچھ دے دیا ہے۔ ایک دوسری جگہ آیا ہے کہ اللہ پوچھے گا کہ کیا تم خوش ہو؟ وہ کہیں گے کہ جی ہاں، ہم خوش ہیں، آپ نے ہم کو اتنا دیا ہے کہ اس کے بعد ہمیں اور کیا چاہیے! پھر اس کے بعد اللہ تعالیٰ ان سے اپنے انعام کا ذکر فرمائے گا کہ میں اب تم سے کبھی ناراض نہیں ہوں گا۔

دنیا میں اللہ کی ناراضی کا ڈر لگا رہتا ہے اور یہ ڈر لگا رہنا چاہیے اور یہ ضروری ہے، اس لیے کہ اس کی ناراضی کے ڈر سے ہی آدمی جنت میں داخل ہوگا لیکن آخرت میں اللہ تعالیٰ کی ناراضی کا ڈر اور خوف نہیں ہوگا۔ یقیناً یہ اللہ کا بہت بڑا انعام ہے اور یہ بات انتہائی اطمینان اور سکون کا باعث ہوگی۔

ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ رَبَّهٗ ۝ (البینۃ:۸)

''یہ کچھ ہے اس شخص کے لیے جس نے اپنے رب کا خوف کیا ہو۔''

گویا یہ جنت، یہ رضامندی، یہ سب کے سب انعامات اس کے لیے ہیں جو اپنے رب سے ڈرا۔ ہمارے ہاں خشیت کے لیے ایک ہی لفظ ڈر اور خوف استعمال ہوتا ہے لیکن عربی زبان میں اس کے لیے کئی لفظ آتے ہیں۔ قرآن مجید نے 'ڈرنے کے لیے' خشیت اور خوف کا لفظ استعمال کیا ہے۔ خوف کسی اندیشے کا نام ہے، کہ یہ نہ ہوجائے اور وہ نہ ہوجائے۔ اسی کو خوف و ڈر

کہتے ہیں۔ خشیت کا لفظ دراصل اس خوف اور ڈر کے معنوں میں استعمال نہیں ہوتا جو کسی کی طاقت یا قوت کو دیکھ کر لاحق ہو یا سزا ملنے کے پیش نظر ہو۔ اس قسم کا ڈر خشیت نہیں ہے بلکہ خشیت وہ خوف اور ڈر ہے جو کسی کا جلال، شان، عظمت اور کسی کا مقام و مرتبہ دیکھ کر دل میں پیدا ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی عظمت کے دو پہلو ہیں۔ اس کا ایک پہلو تو یہ ہے کہ اس کی قدرت زبردست ہے، ساری کائنات اس کی مٹھی میں ہے، یہاں جو کچھ ہوتا ہے اس کی مرضی سے ہوتا ہے، ہر جگہ اسی کا حکم چلتا ہے اور سارے کام اس کے حکم سے ہوتے ہیں اور وہی ہر چیز کا مالک ہے۔ اس کا جلال، اس کی طاقت، اس کی قوت اور اس کا اقتدار ہر چیز پر محیط ہے۔ اس کی عظمت کا دوسرا پہلو ہمارے اوپر اس کی نعمتوں کی صورت میں اس کی عنایات اور کرم فرمائی ہے۔ چناں چہ اللہ تعالیٰ نے خشیت کا ذکر جہاں بھی کیا ہے وہاں اس کا رشتہ اس نے اپنی صفتِ رحمان سے جوڑا ہے:

مَنْ خَشِيَ الرَّحْمٰنَ بِالْغَيْبِ وَجَآءَ بِقَلْبٍ مُّنِيْبِ ۝ (قٓ:۳۳)

”جو بے دیکھے رحمٰن سے ڈرتا تھا، اور جو دل گرویدہ لیے ہوئے آیا ہے۔“

یہاں جو بات سمجھائی گئی ہے وہ یہ ہے کہ اللہ سے ڈرنا یہ نہیں ہے کہ اس کے عذاب، انتقام اور شدید پکڑ کے خوف سے ڈرا جائے، بلکہ رحمان سے ڈرنے کے معنی یہ ہیں کہ اس کی نعمتوں کا احساس ہو اور پھر یہ ڈر لگا رہے کہ اگر میں نے اس کی نافرمانی کی تو یہ نعمتیں مجھ سے چھن جائیں گی، وہ مجھ سے ناراض ہو جائے گا اور قیامت کے دن مجھے وہ نعمتیں نہیں ملیں گی جن کا ذکر یہاں پر ہوا ہے۔ یہ رحمان کی خشیت ہے نہ کہ عذاب کی خشیت۔ خشیت یہ بھی ہے کہ بن دیکھے رحمٰن کی نعمتوں، انعامات اور عنایتوں کو دیکھ کر شکر اور خوف کا جذبہ پیدا ہو۔

یہ قرآن مجید کا انداز بیان ہے۔ یہ محض بیان کر دینے کا ایک انداز ہی نہیں ہے بلکہ اس کے اندر وہ نسخہ بھی بیان کیا گیا ہے، جس پر عمل کر کے انسان بہترین خلائق، بہترین مخلوق بن سکتا ہے۔ خدا کی سدا بہار جنتوں میں داخل ہو کر اس کے اجر اور انعامات اور اس کی رضا و خوش نودی کا مستحق ٹھیر کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کامیابی اور ہمیشگی کی زندگی حاصل کر کے ان خوش نصیب لوگوں میں اپنا شمار کروا سکتا ہے، جنھیں رب کے دیدار کی لذت بھی حاصل ہوگی۔ اس پر مستزاد یہ کہ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ (البینہ:۸) ”اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے۔“

اگرچہ یہ جنت کا بیان ہے لیکن دنیا کے اندر بھی جو آدمی اللہ کے فیصلے پر راضی ہو، اس

کی رضا پر راضی رہے، جو کچھ وہ دے اور جو کچھ وہ واپس لے لے اس پر بھی راضی ہو، یہ دراصل ایمان، عمل صالح اور اللہ کی بندگی کا راستہ ہے۔ دوسری طرف ہر وقت اس کے دل میں خدا کی ناراضی کا کھٹکا اور خوف رہے کہ کہیں کوئی ایسا کام نہ ہو جائے، جس سے اللہ ناراض ہو جائے۔ ہر وقت اسے یہ خدشہ لگا رہے کہ کوئی قدم ایسا نہ اٹھ جائے، زبان سے کوئی ایسی بات نہ نکل جائے، جیب میں کوئی پیسا ایسا نہ چلا جائے کہ جس کی وجہ سے اللہ ناراض ہو جائے، اس کی نافرمانی ہو جائے اور اسکے نتیجے میں اس کے غضب، پکڑ اور انتقام کا شکار ہو جائے۔ دراصل یہی وہ طریقہ ہے، اس راستے پر چلنے کا جو فلاح، کامیابی اور بندگی کا راستہ ہے اور صراطِ مستقیم ہے، جس کا ذکر اس سورہ میں اللہ تعالیٰ نے کیا ہے اور جس کو بتانے کے لیے قرآن مجید نازل ہوا ہے۔

اس سورہ کی ابتدا میں قرآن مجید کے نزول کا جو ذکر ہوا ہے اس کو یہاں لا کر ختم کر دیا گیا ہے، اور بتا دیا گیا ہے کہ قرآن مجید کا نازل ہونا، قرآن مجید کے بغیر اور رسول کے بغیر، کفر اور شرک کی گندگیوں سے نکل کر ایمان اور عمل صالح کی راہ پر آنا ممکن نہیں ہے۔ یہ نہ اس وقت ممکن تھا جب قرآن مجید نازل ہو رہا تھا نہ آج بیسویں صدی میں اس کا کوئی امکان ہے۔ ایمان اور عمل صالح کی راہ ہی آدمی کو بہترین مخلوق بناتی ہے اور انسان اونچا اٹھتا چلا جاتا ہے۔ اس کے بغیر انسان اس منصب پر فائز نہیں ہو سکتا۔ اللہ کی خشیت بھی اسی چیز سے پیدا ہوتی ہے کہ آدمی کو اللہ سے ملاقات کا، اللہ کے سامنے حاضر ہونے کا اور اپنے اعمال کا جواب دہ ہونے کا پورا یقین ہو۔ آگے جو تین سورتیں آ رہی ہیں، یعنی سورۂ زلزال، سورۂ عادیات اور سورۂ قارعہ ان میں تصور آخرت پر مزید روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس لیے کہ وہی تو خشیت کے پیدا کرنے کا نسخہ ہے۔ قرآن مجید وہ کتاب نہیں ہے کہ جو چیزوں کو بیان کر کے آگے نکل جائے بلکہ وہ تو ایک معلم، ایک مدرس اور ایک مزکی ہے جو تدریس کرتا ہے، تزکیہ کرتا ہے، اور تربیت کرتا ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے موقع اور مضمون کی مناسبت سے چیزوں کو نگاہوں کے سامنے لا کر نقشہ کھینچ کر رکھ دیتا ہے، جیتی جاگتی، زندہ و متحرک تصویر نظروں کے سامنے لے آتا ہے تاکہ دل میں خشیت پیدا ہو اور انسان اللہ تعالیٰ کی رضا و خوشنودی کے حصول کے لیے تگ و دو اور جدوجہد کرے اور آگے بڑھ کر فوزِ عظیم (عظیم کامیابی) حاصل کر کے خدا کے مقرب و محبوب بندوں میں شامل ہو جائے۔

سورۃ الزلزال

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ○

اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ زِلْزَالَهَا ﴿۱﴾ وَاَخْرَجَتِ الْاَرْضُ اَثْقَالَهَا ﴿۲﴾ وَقَالَ الْاِنْسَانُ مَا لَهَا ﴿۳﴾ يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ اَخْبَارَهَا ﴿۴﴾ بِاَنَّ رَبَّكَ اَوْحٰى لَهَا ﴿۵﴾ يَوْمَئِذٍ يَّصْدُرُ النَّاسُ اَشْتَاتًا ۙ لِّيُرَوْا اَعْمَالَهُمْ ﴿۶﴾ فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ﴿۷﴾ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ﴿۸﴾

اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان اور نہایت رحم کرنے والا ہے۔

جب زمین اپنی پوری شدت کے ساتھ ہلا ڈالی جائے گی اور زمین اپنے اندر کے سارے بوجھ نکال کر باہر ڈال دے گی اور انسان کہے گا کہ یہ اس کو کیا ہو رہا ہے؟ اس روز وہ اپنے (اوپر گزرے ہوئے) حالات بیان کرے گی کیوں کہ تیرے رب نے اسے (ایسا کرنے کا) حکم دیا ہوگا۔ اس روز لوگ متفرق حالت میں پلٹیں گے، تاکہ ان کے اعمال ان کو دکھائے جائیں۔ پھر جس نے ذرّہ برابر نیکی کی ہوگی وہ اس کو دیکھ لے گا، اور جس نے ذرّہ برابر بدی کی ہوگی وہ اس کو دیکھ لے گا۔

تشریح: سورۂ زلزال کی آٹھ آیات ہیں۔ اس سے پہلے سورۂ بینہ گزر چکی ہے، اور اس میں اللہ تعالیٰ نے یہ بات بیان فرمائی ہے کہ اس کی رضا، جنت اور انعامات ان کے لیے ہیں، جو اللہ کے

حکم کی پابندی کریں، اس کے علاوہ کسی کے حکم کی پابندی نہ کریں، اپنے دین کو اور اپنی بندگی کو اسی کے لیے خالص کریں۔ سب سے کٹ کر اسی کے ہو جائیں، اس کے حنیف بن جائیں، نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں۔ ان سب کا مقصد یہ ہے کہ رب کی خشیت انسان کے اندر پیدا ہو: ذَالِکَ لِمَنْ خَشِیَ رَبَّہٗ (البینۃ:۸) ''یہ کچھ ہے اس شخص کے لیے جس نے اپنے رب کا خوف کیا ہو۔'' رب کی خشیت کی بنیاد اس کے انعامات اور احسانات ہیں اور ان کا حق ادا نہ ہونے کی صورت میں ان کے چھن جانے کا خدشہ، اور اس بات کا ڈر اور خوف کہ وہ ان کے بارے میں سوال کرے گا کہ جو کچھ بھی تم کو عطا کیا گیا تھا، اس کا تم نے کیا کیا؟ جب اس کی ربوبیت کا فیضان جاری تھا، جس سے ہر لمحے انسان فائدہ اٹھا رہا تھا، جن جن نعمتوں کی بارش اس پر ہو رہی تھی، ان کا کیا استعمال کیا؟ رب کی خشیت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ یہ اس کی رحمت کا تقاضا ہے کہ وہ عدل کرے اور نیکی کرنے والوں کو اچھا بدلہ دے اور برائی کرنے والوں کو اس کی سزا دے۔

یہاں سے سلسلۂ کلام جو مسلسل اور مربوط انداز میں چل رہا ہے، آخرت کی جزا و سزا کی طرف مڑ جاتا ہے۔ یہاں پر اس گھڑی کا ذکر کیا جا رہا ہے اور نقشہ کھینچا جا رہا ہے جب انسان خدا کے سامنے حاضر ہوں گے اور اپنے اعمال کا حساب دیں گے، اور اپنے اعمال اپنی نگاہوں سے دیکھ لیں گے، نیز ان اعمال کا بدلہ بھی سب کے سامنے آ جائے گا۔

قرآن مجید میں قیامت اور قیامت کے بعد کا جو بیان ہے، اس کا انداز اور اسلوب ایسا ہے کہ پورا منظر نگاہوں کے سامنے آ جاتا ہے۔ گویا کہ آدمی اپنی آنکھوں سے اس منظر کو دیکھ رہا ہے اور وہاں کی جو کیفیات و احوال ہیں ان کے اندر شریک ہے اور جس قسم کی بھی صورتِ حال وہاں پیش آ رہی ہے اس میں اپنے آپ کو شریک محسوس کرتا ہے۔ آخرت کے بارے میں اس اندازِ بیان ہی کا یہ نتیجہ تھا کہ جنھوں نے حضورؐ کی زبان سے قرآن مجید سنا، دنیا میں رہتے ہوئے بھی جنت، جہنم، حشر اور میزان، گویا سب ان کی نگاہوں کے سامنے ہوتا تھا۔ اس اندازِ بیان کی بہت ساری خصوصیات ہیں، جن میں سے چند خصوصیات اس سورہ میں کھل کر سامنے آئی ہیں۔

سلسلہ کلام اچانک یہ کہہ کر شروع ہو جاتا ہے:

اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ زِلْزَالَهَاۙ (الزلزال:۱)

''جب زمین اپنی پوری شدت کے ساتھ ہلا ڈالی جائے گی۔''

یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی زوردار آواز یا چیخ ایک دم سنائی دیتی ہے اور انسان چونک پڑتا ہے کہ یکا یک یہ کیا ہو گیا ہے، اور کیوں اتنا شور برپا ہے؟ اس طرح دل میں یہ تاثر بن جاتا ہے کہ جیسے اچانک کوئی بڑا واقعہ یا بڑا حادثہ پیش آنے والا ہے۔

سورہ کا آغاز یوں ہوتا ہے کہ وہ عظیم حادثہ پیش آنے والا ہے، جب زمین پوری شدت کے ساتھ ہلا ڈالی جائے گی، اس کو اس سے پہلے جو سلسلۂ کلام چلا آ رہا ہے اس سے بھی جوڑا جا سکتا ہے کہ مومنین سے جس اجر کا وعدہ کیا گیا ہے کہ ان کے لیے ہمیشہ رہنے کے باغات ہیں، ان کے درمیان نہریں بہتی ہیں، یہ کب پورا ہوگا؟ اور جو کفر کی راہ اختیار کریں ان کے لیے جو سزا بیان کی گئی ہے وہ کب ملے گی؟

یہ واقعہ کب پیش آئے گا، اس کی نشان دہی تو یہاں نہیں کی گئی اور ممکن بھی نہیں، البتہ یہ واقعہ کیسے رونما ہوگا اور اس وقت کیا صورتِ حال ہوگی؟ وہ منظر پیش کیا جا رہا ہے تا کہ یہ انسان کے ذہن میں راسخ ہو جائے۔

زلزلہ کا لفظ اردو زبان میں بھی استعمال ہوتا ہے اور اس کے معانی ہلانے کے ہیں۔ عربی زبان میں اس وزن کے جتنے بھی فعل آتے ہیں، ان میں کسی کام کو بار بار کرنے کا مطلب پایا جاتا ہے۔ اسی وزن پر یہ لفظ آتا ہے۔ دل کے اندر جو خیال بار بار پیدا ہو، اس کے لیے وسوسہ کا لفظ آتا ہے۔ اسی کے وزن پر دَمْدَمَ آتا ہے، یعنی کسی چیز کو بار بار تباہ و برباد کرنا۔ اردو میں دھما چوکڑی کا لفظ بھی بار بار شور مچانے کے معنوں میں آتا ہے۔ لہٰذا زلزلے سے مراد صرف ایک دفعہ ہل جانے کے نہیں ہیں بلکہ کسی چیز میں مسلسل حرکت اور اضطراب کا پایا جانا ہے، یعنی کسی چیز کو پکڑ کر بار بار ہلایا جائے۔

قیامت کے جو احوال و واقعات قرآن مجید میں بیان ہوئے ہیں اس میں ایک پہلو یہ ہے کہ یہ ایک ایسی گھڑی ہوگی، جس کے خوف و دہشت، ہیبت و اضطراب اور بے چینی کی کیفیت سے سب دوچار ہوں گے، زمین و آسمان، سورج، چاند، چرند پرند، ہر چیز کو اس کیفیت کا سامنا ہوگا۔ کہیں سب چیزوں کا ذکر ہے اور کہیں صرف ایک چیز کا۔ کہیں سب شریک ہوں گے اور کہیں کہا گیا کہ جب سورج ڈھانپ دیا جائے گا، پہاڑ چلا دیے جائیں گے، سمندر اُبل پڑیں گے اور جانور بھاگے پھر رہے ہوں گے اور کوئی ان کو پوچھنے والا نہیں ہوگا۔ گویا ایک عجیب افراتفری کا عالم ہوگا۔

اس طرح مختلف مقامات پر مختلف انداز میں ان احوال و واقعات کو بیان کیا گیا ہے۔

اس سورہ میں زمین کو مرکز بنایا گیا ہے کہ جب زمین اپنی پوری شدت کے ساتھ ہلا ڈالی جائے گی تو اس وقت کیا کیفیت ہوگی۔ یہاں زمین اور انسان صرف دو کا ذکر ہے کہ ان پر کیا کیفیت طاری ہوگی۔ زمین کے ہلانے کا ذکر قرآن مجید میں اور بھی بہت سے مقامات پر موجود ہے۔ یہاں دو دفعہ ہلانے کا ذکر ہے۔ پہلی مرتبہ جب قیامت کی تباہی پوری کی پوری کائنات کو اپنی لپیٹ میں لے لے گی، اور دوسرا زلزلہ یا جھٹکا وہ ہے کہ جب مردے زمین سے نکل کھڑے ہوں گے۔ کچھ لوگوں نے اس کا مطلب پہلا زلزلہ لیا ہے لیکن اندازِ بیان سے جو اندازہ ہوتا ہے اس کے مطابق اس کے بعد زمین اپنے بوجھ نکال دے گی اور اعمال پیش کیے جائیں گے۔ اس سے یہ زیادہ صحیح محسوس ہوتا ہے کہ اس سے مراد وہ دوسرا زلزلہ ہے، جس کے اندر زمین اپنے سب مردے نکال باہر کرے گی۔ زمین کو مرکز اس لیے بنایا گیا ہے تاکہ انسان کے نفس اور دل پر یہ بات نقش ہو جائے کہ یہ زمین جس پر وہ چلتا پھرتا ہے، اپنا کاروبار کرتا ہے، مکان بناتا ہے، زندگی بسر کرتا ہے، اس کی تمام سرگرمیوں کا مرکز ہے اور جس کے بارے میں وہ خیال کرتا ہے کہ یہ بڑی پائیدار اور مستحکم چیز ہے، وہ اس روز ایسے بولنے لگے گی کہ آدمی تصور نہیں کر سکتا۔

زلزال کے معنی ہیں کسی چیز کا ہلنا لیکن قرآن نے چوں کہ زلزالھا کا لفظ استعمال کیا ہے، اس لیے اس کے معنی یہ ہیں کہ اس روز زمین اس بری طرح ہلائی جائے گی کہ آج اس کا تصور بھی انسان کے لیے مشکل ہے۔ عام طور پر اگر زمین کے صرف ایک حصے پر زلزلہ آ جائے تو زبردست تباہی مچ جاتی ہے۔ یہاں پر کسی ایک حصے میں زلزلے کا ذکر نہیں ہے بلکہ منظر یوں کھینچا جا رہا ہے کہ پوری کی پوری زمین بری طرح ہل رہی اور ڈول رہی ہے اور پورا نظام درہم برہم ہو رہا ہے۔ یہ دراصل اس تاثر کو بھی دل کے اندر پیدا کرتا ہے کہ یہ سارا نظام جو بظاہر بڑا مستحکم نظر آتا ہے، انتہائی غیر مستحکم ہے اور اس کا سہارا لینا کوئی دانش مندی نہیں ہے۔

جب آدمی ڈوبنے لگتا ہے تو سہارے کے لیے کسی چیز کو پکڑتا ہے۔ انسان موت سے ڈرتا ہے اور اس سے بچنے کے لیے مختلف سہارے تلاش کرتا ہے۔ جہاز پر سوار ہونے لگتا ہے تو ڈرتا ہے کہ کہیں موت کا شکار نہ ہو جاؤں اور فضا میں تو کوئی سہارا بھی میسر نہ آئے گا۔ زمین کے بارے میں یہ خیال کرتا ہے کہ یہ میرے سہارے کی جگہ اور میرا مستحکم و پائیدار ٹھکانہ ہے۔ یہی

کاروبارِ حیات ہے۔ حالاں کہ موت کو ہر حال میں آکر رہنا ہے۔ یہاں قرآن زمین کی بے ثباتی کا ذکر اس طرح کرتا ہے کہ ایک زوردار زلزلے کے نتیجے میں یہ زمین ہلا ماری جائے گی۔ اس طرح دنیا کی بے ثباتی اور اس کی بے وقعتی واضح اور صاف نظر آجاتی ہے۔ اس وقت انسان پر عجیب کیفیت طاری ہوگی جب کائنات کے اندر جتنے بھی اجرام سماوی ہیں، ان سب میں زمین پر خاص طور پر وحشت اور سراسیمگی کا ماحول طاری ہو جائے گا۔ اس لیے وہ پوری شدت کے ساتھ ہلنے اور ڈولنے لگے گی اور انسان کو اس کے اوپر ٹکنے کے لیے کوئی جگہ نہیں ملے گی۔

ایک اور بات جو قرآن مجید نے زمین و آسمان کی تباہی کے بارے میں کہی ہے وہ یہ ہے کہ زمین اور آسمان طبعی قوانین پر قائم ہیں۔ طبعی قوانین کا مطلب ہے کہ اس دنیا میں پہاڑ اور پتھر کا وزن ہے، سونے چاندی کو تولا جاسکتا ہے لیکن سچائی اور نیکی کا وزن کسی ترازو میں نہیں کیا جاسکتا۔ اس لیے جن قوانین پر زمین و آسمان کا نظام قائم ہے ان قوانین میں اخلاق کو اس طرح نہیں تولا جاسکتا، جس طرح سونے اور چاندی کو تولا جاسکتا ہے۔ ان کی قیمت اس طرح نہیں لگائی جاسکتی، جس طرح سونے اور چاندی کی قیمت لگائی جاسکتی ہے۔ اس لیے قیامت کے روز طبعی قوانین پر مبنی یہ نظام فنا کر دیا جائے گا اور ایک دوسرا نظام بنایا جائے گا۔ اس بات کی طرف یوں اشارہ کیا گیا ہے:

يَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَيْرَ الْاَرْضِ وَالسَّمٰوٰتُ وَ بَرَزُوْا لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ ۝ (ابراهیم:۴۸)

”ڈراؤ انھیں اس دن سے کہ جب زمین اور آسمان بدل کر کچھ سے کچھ کر دیے جائیں گے اور سب کے سب اللہ واحد قہار کے سامنے بے نقاب حاضر ہو جائیں گے۔“

اس طرح پوری کائنات میں ایک نیا نظام قائم ہوگا جہاں پر سارے خزانے بے وزن ہو جائیں گے، سونے چاندی کی کوئی قیمت نہیں رہے گی، صرف قیمت ہوگی تو اعمال کی قیمت ہوگی، اور ایسی میزان قائم کر دی جائے گی، جس میں اعمال تل سکیں گے۔ اس ترازو میں دنیاوی اشیا نہیں تلیں گی بلکہ نیکی، سچائی اور ظلم، یعنی اچھے برے اعمال تل سکیں گے۔ چوں کہ یہ موجودہ طبعی قوانین کے تحت ممکن نہیں، اس لیے اس نظام کا تباہ ہونا ضروری ہے جو کہ طبعی قوانین پر قائم ہے اور ایسے نظام کا قائم ہونا ناگزیر ہے جو کہ اخلاقی قوانین پر قائم ہو۔

ہر انسان کو عمل کے لیے ایک مخصوص وقت اور مدت دی گئی ہے۔ جس طرح ہر چیز کا ایک وقت متعین ہوا ہے، اسی طرح انسان کے لیے بھی وقت مقرر ہے، اور وہ اس کی طبعی عمر ہے۔ جب انسانی عمر کو ایک روز لازماً ختم ہونا ہے اور اسے مرنا ہے اسی طرح اس کے اعمال کا سلسلہ بھی ایک روز ختم ہونا چاہیے تاکہ اس کا حساب لیا جائے کہ ۱۰، ۲۰ یا ۵۰، ۶۰ سال میں اس نے کیا کیا ہے۔ لیکن انسانی اعمال کے اثرات اور نتائج انسان کی زندگی کے بعد بھی جاری رہتے ہیں۔ کسی نے کوئی اچھا کام کیا تو وہ اس کی موت کے بعد بھی جاری رہے گا۔ اگر کسی کو بھلائی کی راہ دکھائی ہے تو وہ جو نیکیاں کرے گا اس کا ثواب اسے بھی ملتا رہے گا۔ اگر کوئی نہر کھدوادی ہے تو لوگ پانی پیتے رہیں گے۔ نیکی کی نیت سے کوئی کارخانہ بنادیا تو لوگ ملازمت کرتے رہیں گے۔ اسی طرح بہت سارے اچھے برے کام ہو سکتے ہیں جن کے اثرات انسان کی موت کے بعد بھی چلتے رہتے ہیں۔ چناں چہ مکمل حساب کتاب کے لیے بھی ضروری ہے کہ کائنات کا موجودہ نظام ختم کیا جائے۔ قرآن مجید نے بہت سی جگہوں پر کہیں کھول کر پوری وضاحت کے ساتھ اور کہیں مبہم طریقے سے، اور کہیں اشاروں کنایوں میں ان سب چیزوں کو واضح کر کے بیان کر دیا ہے۔

یہاں پر زمین کا پوری شدت کے ساتھ ہلائے جانے کا یہ منظر اس لیے کھینچا گیا ہے کہ آدمی کے زمین سے وابستہ سارے کے سارے تاثرات کہ زمین اس کا مسکن ہے، یہاں سے اس کو غذا اور روزی ملتی ہے، فصلیں پیدا ہوتی ہیں، بلند و بالا پہاڑ جن کی کانوں سے آدمی دولت نکالتا ہے، ان کا کیا حشر ہونے والا ہے۔ لہٰذا آدمی اس بات کو اچھی طرح سمجھ لے کہ وہ گھڑی ایسی ہول ناک گھڑی ہوگی کہ اس میں وسیع و عریض کائنات کے مقابلے میں ننھا منا انسان کیا، پوری کی پوری زمین بھی اپنی جگہ پر برقرار نہیں رہ سکے گی۔ اس میں حرکت بھی ہوگی اور اضطراب اور بے چینی بھی اور یہ بڑی شدت کے ساتھ ہوگی۔ زلزالھا لفظ کے اندر یہ بات پوشیدہ ہے کہ یہ صورت حال اس طرح ہوگی کہ آج آدمی اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ اس لیے کہ اس نے آج تک کبھی کوئی ایسا عظیم حادثہ یا واقعہ دیکھا ہی نہیں۔ انسان نے بڑے بڑے زلزلے دیکھے ہیں، آتش فشاں پہاڑ پھٹتے دیکھے ہیں، بڑے بڑے طوفان اور سیلاب آتے دیکھے ہیں لیکن اچانک پوری کی پوری زمین ہلنے لگے، یہ اس نے کبھی نہیں دیکھا اور یہ مسلسل ہلتی رہے گی۔ زلزالھا کے اندر شدت اور تسلسل دونوں کا مفہوم موجود ہے۔

وَ اَخۡرَجَتِ الۡاَرۡضُ اَثۡقَالَهَا ۙ۝ (الزلزال:۲)

''اور زمین اپنے اندر کے سارے بوجھ نکال کر باہر ڈال دے گی۔''

یہاں بوجھ سے مراد ایک تو وہ انسان اور مردے ہیں، جو زمین کے اندر دفن ہو چکے ہیں۔ آدمی کہیں بھی مرے، مگر اس کا جسم موجود ہے، خواہ وہ زمین کے اندر دب کر مٹی بن چکا ہو یا آگ میں جل کر اس کی خاک ہوا میں اُڑ چکی ہو۔ اس موقعے پر زمین کے اندر جتنے بھی انسان دفن ہوں گے وہ انھیں نکال باہر کرے گی اور انسان نکل کر تیزی سے بھاگے جا رہے ہوں گے۔

یَوۡمَ تَشَقَّقُ الۡاَرۡضُ عَنۡهُمۡ سِرَاعًا ؕ ذٰلِکَ حَشۡرٌ عَلَیۡنَا یَسِیۡرٌ ۝

(قٓ:۴۴)

''زمین پھٹے گی اور لوگ اس کے اندر سے نکل کر تیز تیز بھاگے جا رہے ہوں گے۔ یہ حشر ہمارے لیے بہت آسان ہے۔''

اس روز زمین اپنے اندر ازل سے ابد تک جتنے انسانوں کو محفوظ کیا ہوا ہو گا وہ ان کے جسدِ خاکی نکال باہر کرے گی۔ احادیث سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ زمین اپنے اندر پوشیدہ خزانوں کو بھی نکال باہر کرے گی۔ یہ حقیقت ہے کہ زمین کے اندر بے شمار خزانے ہیں۔ انسان نے جتنی بھی ترقی کی ہے اور بے شمار چیزیں دریافت کی ہیں لیکن اس سب کے باوجود ہم جانتے ہیں کہ زمین کا ایک بڑا حصہ ایسا ہے جس کے بارے میں انسان کچھ نہیں جانتا کہ اس کے اندر کیا کیا خزانے پوشیدہ ہیں۔ یہ تو اتفاق ہے کہ آج سے ۶۰، ۷۰ سال پہلے تیل دریافت ہو گیا تو لوگوں کو معلوم ہو گیا کہ زمین کے اندر بڑے بڑے خزانے موجود ہیں اور بے شمار ایسے خزانے دفن ہیں، جن کو انسان نہیں جانتا۔ خود ہم اپنے ملک کے بارے میں نہیں جانتے ہیں کہ یہاں ۹۰ فی صد علاقہ ایسا ہے کہ جہاں زمین کے نیچے کیا ہے۔ غرض اس روز زمین انسانوں کے ساتھ ساتھ اپنے سارے خزانے بھی نکال باہر کرے گی۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس کا کیا مطلب ہو گا کہ زمین اپنے خزانے نکال باہر کرے گی۔ ایک حدیث میں اس طرف اشارہ ملتا ہے کہ ایک آدمی آئے گا اور ان خزانوں کو دیکھے گا کہ یہ ان کی حقیقت کیا ہے! اس وقت ایک قاتل کہے گا کہ اچھا میں نے ان چیزوں کی خاطر قتل کیا اور چور کہے گا کہ میرا ہاتھ ان کی خاطر کاٹا گیا تھا۔ اس طرح انسان کو اندازہ ہو گا کہ دنیا کے جن خزانوں کی

خاطر اس نے گناہ کیے تھے وہ کتنے بے حقیقت ہیں کہ آج ان کا کوئی وزن نہیں۔ اس روز یہ خزانے ہر طرف بکھرے پڑے ہوں گے لیکن کسی کو نگاہ اٹھا کر انھیں دیکھنے کی فرصت نہیں ہوگی۔ دنیا کے اندر جن چیزوں میں دل اٹکا رہا ہے آج وہ سب موجود ہیں، زمین نے اپنے سارے خزانے نکال کر باہر رکھ دیے ہیں لیکن کوئی نہیں جو ان کو لینے کا روادار ہو۔ صرف اپنے اعمال کی فکر ہے جو ہر ایک کو دامن گیر ہے۔ ہر ایک اسی فکر میں ہے کہ وہ کیا اعمال لے کر آیا ہے۔ اس وقت ان سارے خزانوں کی حقیقت انسان پر واضح ہو جائے گی۔ معلوم ہوگا کہ ان کا کوئی وزن نہیں رہا ہے جو کچھ وزن ہے وہ اعمال کا ہے۔ پس انسان پر اس حقیقت کو واضح کرنے کے لیے اور جنھوں نے دنیا کے خزانوں کی خاطر برے اعمال کیے انھیں رسوا کرنے اور ندامت میں مبتلا کرنے کے لیے زمین اللہ کے حکم سے اپنے سارے خزانے نکال باہر کرے گی۔

بوجھ کا ایک مطلب یہ بھی ہے کہ جرائم کے جو ثبوت زمین کے اندر موجود ہیں، وہ بھی نکال باہر کیے جائیں گے۔ دنیا کے اندر جتنے بھی جرائم ہوئے ہیں، جن کے سارے شواہد، زمین کے اندر موجود ہیں وہ سب سامنے آجائیں گے۔

یہ ایک پورا نقشہ اور ترتیب ہے جو سامنے آتی ہے۔ ایک طرف یہ منظر ہے کہ پوری زمین ڈول رہی ہے اور بری طرح ہل رہی ہے، آدمی کو قرار نہیں مل رہا ہے، اور دوسری طرف زمین نے اپنے سارے بوجھ اور اپنے اندر پوشیدہ سارے خزانے بھی نکال کر باہر رکھ دیے ہیں کہ یہ تھا میرے پیٹ میں جن کی خاطر تم نے خون کیا، ظلم ڈھائے، فساد مچایا اور دنیا کو کمایا، سینتا اور جمع کیا۔ یہ سب یہاں پڑا ہے اور آج کسی کام نہیں آسکتا۔ پوری روئے زمین کی دولت بھی اگر آج کسی کے پاس ہوگی تو وہ کسی عمل کا معاوضہ نہیں ہو سکتی، کسی ظلم کے بدلے میں نہیں دی جاسکتی، بلکہ انسان کو صرف اپنے اعمال ہی سے سارا حساب چکانا پڑے گا۔ اس کیفیت میں کہ زمین مضطرب اور بے چین ہے، پوری شدت سے ہل رہی ہے، اور سارے خزانے پڑے ہوئے ہیں مگر کوئی انھیں دیکھنے والا نہیں ہے اور انسان پر ایک بدحواسی طاری ہوگئی ہے، ایسے میں انسان یہ پکار اٹھے گا کہ:

وَ قَالَ الْاِنْسَانُ مَالَهَاۚ (الزلزال:۳)

"اور انسان کہے گا یہ اس کو کیا ہو رہا ہے؟"

یہ کیفیت انسان کی بدحواسی کی کیفیت ہے۔ جس طرح جب کبھی کوئی بہت بڑا حادثہ

پیش آ جائے تو آدمی یہ کہتا ہے کہ ارے یہ کیا ہو رہا ہے؟ اس میں خوف بھی ہے اور دہشت بھی، اضطراب بھی ہے اور بے چینی بھی، اور ذہن کے ساتھ انسان کا اپنا نفس بھی اس کے اندر شریک ہے، اور پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ یہ کیا ہے؟ جو پہلے کبھی دیکھنے میں نہیں آیا۔ میں نے تو کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ یہ گھڑی آ جائے گی۔ یہاں قرآن نے اس وقت کا جو پورا منظر ہے وہ کھینچ کر رکھ دیا ہے۔ زمین اور زمین میں جو کچھ پیش آ رہا ہے، اور انسان پر جو خوف، دہشت، بے چینی اور بدحواسی طاری ہے اس سارے منظر اور کیفیت کو ایک جملے میں بیان کر دیا ہے: وَ قَالَ الْاِنْسَانُ مَالَهَاۚ ”اور انسان کہے گا کہ یہ اس کو کیا ہو رہا ہے؟“

یہ قرآن مجید کا انداز ہے کہ لمبا چوڑا بیان نہیں کیا کہ انسان مضطرب ہے، بے چین ہے، پریشان اور بدحواس ہے، دیکھو! اسے کیا ہو رہا ہے بلکہ صرف تین الفاظ کے اندر اس نے پوری تصویر Focus کر دی ہے، کہ انسان کے اوپر اس وقت کیا بیت رہی ہوگی۔ پھر اس بات کو واضح کرنے سے پہلے کہ زمین پر یہ سب جو ہو رہا ہے، کس لیے ہو رہا ہے، زمین کے بارے میں ایک اور بات کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ فرمایا:

يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ اَخْبَارَهَاۙ بِاَنَّ رَبَّكَ اَوْحٰى لَهَاؕ (الزلزال: ۴،۵)

”اس روز وہ اپنے (اوپر گزرے ہوئے) حالات بیان کرے گی کیوں کہ تیرے رب نے اسے (ایسا کرنے کا) حکم دیا ہوگا۔“

دراصل اللہ تعالیٰ نے یہ سارا منظر کھینچ کر انسان کو اس طرف متوجہ کیا ہے کہ وہ اس دن کی فکر کرے، اس لیے کہ یہ وہ دن ہے کہ جب اعمال کی جزا اور سزا ہوگی۔ اسی لیے زمین کی پیٹھ پر جو کچھ ہوا ہے وہ بیان کر دے گی۔ چناں چہ احادیث میں آتا ہے کہ تم جانتے ہو کیا ہے؟ یہ دراصل زمین کی شہادت ہے۔ زمین سب کچھ کہہ دے گی کہ میری پیٹھ پر کس وقت کس آدمی نے کیا کچھ کیا ہے، جو برے اعمال کیے ہوں گے وہ بھی بیان کر دے گی اور رات کی تاریکی اور تنہائی میں، جب آدمی اکیلا تھا اس وقت اس نے جو گناہ کیے ہوں گے وہ بھی بیان کر دے گی، اور جن گناہوں کا ارتکاب اس نے کھلے عام مجمعوں میں کیا ہوگا وہ بھی بیان کر دے گی۔ کوئی بات ایسی نہیں باقی نہ رہے گی کہ جو وہ بیان نہ کرے گی، اس طرح وہ اپنے اعمال پر گرفت سے نہ بچ سکے گا۔ اللہ تعالیٰ کو تو ہر چیز کا علم ہے کہ انسان نے کیا کیا ہے، کوئی چیز بھی اس کے علم سے باہر نہیں ہے، اور اگر وہ

اپنے علم کی بنیاد ہی پر ہی جزا سزا دینا چاہے، تو وہ حق بجانب ہوگا۔

اس روز حساب کے تقاضوں کی خلاف ورزی نہیں ہوگی، لیکن انصاف کے تقاضے پورے کرنے کے لیے انسان جن جن اصولوں سے آشنا ہے، اُن میں سے ہر اصول اس کے لیے برتا جائے گا، اور اس کا اہتمام کیا جائے گا۔ اس کے لیے گواہیاں پیش کی جائیں گی، پورا اعمال نامہ فردِ جرم کے طور پر اس کے ہاتھ میں تھمایا جائے گا، چارج شیٹ کرنے کے بعد گواہ لائے جائیں گے اور یہ گواہ ہر قسم کے ہوں گے، انسان کے ہاتھ پاؤں بولنا شروع کر دیں گے، اس کی کھال اور جلد بولنا شروع کر دے گی کہ اس نے کیا کیا ہے؟ اس وقت کے منظر کی قرآن نے تصویر کشی کچھ ان الفاظ میں کی ہے:

وَ يَوْمَ يُحْشَرُ اَعْدَآءُ اللّٰهِ اِلَى النَّارِ فَهُمْ يُوْزَعُوْنَ○ حَتّٰۤى اِذَا مَا جَآءُوْهَا شَهِدَ عَلَيْهِمْ سَمْعُهُمْ وَ اَبْصَارُهُمْ وَ جُلُوْدُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ○ وَ قَالُوْا لِجُلُوْدِهِمْ لِمَ شَهِدْتُّمْ عَلَيْنَا ؕ قَالُوْۤا اَنْطَقَنَا اللّٰهُ الَّذِيْۤ اَنْطَقَ كُلَّ شَيْءٍ (حٰمٓ السجدۃ، ۱۹-۲۱)

''اور ذرا اس وقت کا خیال کرو جب اللہ کے یہ دشمن دوزخ کی طرف جانے کے لیے گھیر لائے جائیں گے۔ ان کے اگلوں کو پچھلوں کے آنے تک روک رکھا جائے گا، پھر جب سب وہاں پہنچ جائیں گے تو ان کے کان اور ان کی آنکھیں اور ان کے جسم کی کھالیں ان پر گواہی دیں گی کہ وہ دنیا میں کیا کچھ کرتے رہے ہیں۔ وہ اپنے جسم کی کھالوں سے کہیں گے: تم نے ہمارے خلاف کیوں گواہی دی؟ وہ جواب دیں گی: ہمیں اس خدا نے گویائی دی ہے، جس نے ہر چیز کو گویا کر دیا ہے۔''

ذرا تصور کیجیے کہ وہ کیا منظر ہوگا، جب ہاتھ بول اٹھیں گے، پاؤں بول اٹھیں گے، پورا جسم گواہی دے گا، فرشتے الگ اعمال نامے لے کر کھڑے ہوں گے، گواہی دینے کے لیے زمین بھی پکار پکار کر اپنا ریکارڈ بیان کرنا شروع کر دے گی۔ یہ سب جہاں گواہی کے اور عدل کے تقاضے پورے کرنے کے لیے وہاں جو لوگ بدکار ہیں، ان کی رسوائی کے لیے بھی ہے۔ یہ بات بھی غور طلب ہے کہ ہم میں سے کوئی شخص خواہ کتنا بھی اچھا اور نیک ہو، اگر اس کے سارے اعمال نامے کو مجمع عام میں سب کی نگاہوں کے سامنے بیان کرنا شروع کر دیا جائے تو بتایئے کہ کون ہے

جواس کا خطرہ مول لے سکتا ہو۔ کون کہہ سکتا ہے کہ میرے دل میں جو خیال گزرا، جو کام میں نے رات کی تنہائیوں میں تنہا کیا، کسی کا حق مارا یا جو بھی گناہ کیا، وہ سب کا سب ریڈیو پر سب کے سامنے نشر ہونا شروع ہو جائے تو کون ہے، جو اس کا خطرہ مول لے سکتا ہے۔ کوئی بھی اس رسوائی اور جگ ہنسائی کو برداشت نہیں کر سکتا۔ لیکن قرآن کے مطابق یہ ایک حقیقت ہے: وَ اِذَا الصُّحُفُ نُشِرَتْ (التکویر:۱۰) ''جب اعمال نامے کھولے جائیں گے۔'' نشر کا ترجمہ یہ کیا جاتا ہے کہ پھیلا دیا جائے گا لیکن نشر کے معنی براڈکاسٹ کے بھی ہوتے ہیں۔ لہٰذا اس کے معنی یہ بھی ہوں گے کہ سارے صحائف براڈکاسٹ کر دیے جائیں گے۔ لوگ ان کو اپنے کانوں سے سن لیں گے کہ اس آدمی نے کیا کیا ہے؟ اس لیے آتا ہے کہ حضرت عمرؓ جب اس آیت پر پہنچتے تھے کہ جب اعمال نامے کھولے جائیں گے، تو چیخ مار کر بے ہوش ہو جاتے تھے۔ اس سے بڑی رسوائی اور ذلت کیا ہو سکتی ہے کہ آدمی کے جو کام بھی اس نے کیے ہوں من وعن اسی طریقے سے انسانوں کے سامنے بیان کر دیے جائیں، زمین بھی بیان کر دے، اعضا بھی گواہی دیں اور جو ثبوت ہوں وہ پیش کر دیے جائیں۔

زمین کے گواہی دینے میں تعجب اس لیے نہیں ہو سکتا کہ ہم جانتے ہیں کہ کمپیوٹر کے اندر ایک چھوٹی سی چپ (Chip) میں جس کو مشکل سے انسانی آنکھ دیکھ سکتی ہے، لاکھوں صفحات کو محفوظ کر کے رکھا جا سکتا ہے۔ کسی بھی روز، کسی بھی لمحے انھیں اسکرین پر لا کر پیش کیا جا سکتا ہے تو زمین کی کس چیز میں اس نے ریکارڈ کرنے کی کیا صلاحیت رکھی ہے، کون جانتا ہے، جب اس نے چھوٹی سی ایک چپ میں یہ صلاحیت رکھ دی ہے کہ وہ لاکھوں صفحات کو محفوظ کر کے اسکرین پر کسی بھی لمحے لے آئے تو زمین اور آسمان میں اعضا اور کھال میں ریکارڈ کرنے کی کیا کیا صلاحیتیں اس نے ودیعت کر رکھی ہیں، یہ کوئی نہیں جانتا۔ اس میں کوئی تعجب کی بات نہ ہوگی کہ اگر ہم کہیں کہ ہو سکتا ہے کہ اس نے زمین میں سب ریکارڈ ایک آڈیو ویڈیو کیسٹ کی طرح یا کمپیوٹر چپ کی طرح محفوظ کر رکھا ہو۔ اس لیے فرمایا کہ یَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ اَخْبَارَهَا ۝ بِاَنَّ رَبَّكَ اَوْحٰى لَهَا ۝ (الزلزال:۴،۵) ''اس روز وہ اپنے (اوپر گزرے ہوئے) حالات بیان کرے گی کیوں کہ تیرے رب نے اسے (ایسا کرنے کا) حکم دیا ہوگا۔'' یہ سب اس لیے ہوگا کہ جس کا امتحان لینا مقصود تھا، اس کے سامنے تمام حقائق کھول کر رکھ دیے جائیں اور عدل و انصاف کے تمام تقاضے پورے کیے جا سکیں۔ یہ اس

سورہ کا ایک حصہ ہے، جس میں اس منظر کی تصویر کشی کی گئی ہے کہ جب انسان خدا کے سامنے اپنے اعمال کی جواب دہی کے لیے کھڑا ہوگا۔ دوسرے حصے میں اس بات کی وضاحت کی گئی ہے کہ یہ سب کس مقصد کے لیے ہوگا؟

يَوْمَئِذٍ يَّصْدُرُ النَّاسُ اَشْتَاتًا ۙ لِّيُرَوْا اَعْمَالَهُمْ ۝ (الزلزال:٦)

''اس روز لوگ متفرق حالت میں پلٹیں گے کہ ان کے اعمال ان کو دکھائے جائیں۔''

سورۂ لیل میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا: اِنَّ سَعْيَكُمْ لَشَتّٰى ۝ (الیل:۴) ''درحقیقت تم لوگوں کی کوششیں مختلف قسم کی ہیں۔'' یعنی سب کی کوششیں الگ الگ ہیں اور سب کے اعمال علیحدہ علیحدہ نوعیت کے ہیں۔ اس لیے اعمال کے لحاظ سے سب لوگ الگ الگ ہو جائیں گے۔ اَشْتَاتًا کے معنی بھی تنہا تنہا اور الگ الگ کے ہیں۔ اس لیے اس کے ایک معانی یہ ہیں کہ لوگ اعمال کی مختلف نوعیت کی بنا پر اللہ کے پاس الگ الگ آئیں گے۔ یہ معانی قرآن مجید میں بہت واضح طور پر دوسری جگہ بھی بیان ہوئے ہیں، کہ ہر شخص اللہ کے سامنے اکیلا حاضر ہوگا۔ اکیلا آنے کے اندر دو مطلب پوشیدہ ہیں۔ ایک یہ کہ ہر آدمی سے اللہ براہِ راست پوچھے گا کہ تم کیا کر کے آئے ہو؟ ہم نے تمھیں آزمایش کے لیے جو مہلت عمل دی تھی اور تمھیں امتحان میں اتارا تھا، اس میں تم کیا کارنامے سرانجام دے کر آئے ہو؟ دوسرے معنی یہ ہیں کہ آدمی تنہا ان معنوں میں ہوگا کہ اس کا کوئی مددگار نہ ہوگا۔ رشتہ دار، دوست احباب، لشکر، ایوان حکومت میں جو بہت سارے مددگار ہوتے ہیں، مال و دولت کے جتنے بھی سہارے دنیا کے اندر ہیں، ان میں سے کوئی سہارا بھی اس وقت ساتھ نہیں ہوگا بلکہ آدمی صرف اپنے اعمال کے ساتھ اکیلا اللہ کے روبرو حاضر ہوگا۔

لِّيُرَوْا اَعْمَالَهُمْ ۝ (الزلزال:٦)

''تاکہ ان کے اعمال ان کو دکھائے جائیں۔''

حدیث میں آتا ہے کہ جب مردہ قبر کی طرف جاتا ہے تو اس کا مال بھی ساتھ جاتا ہے اور اس کے احباب اور رشتے دار بھی۔ مال احباب اور رشتے دار واپس آجاتے ہیں، صرف اعمال ساتھ جاتے ہیں۔ گویا آخری وقت صرف اعمال ساتھ رہ جاتے ہیں کوئی اور چیز ساتھ نہیں رہتی، جو ساتھ دے، سفارش کرے اور کام آسکے۔ سوائے اعمال کے کوئی اور چیز ایسی نہ ہوگی جو کسی ظلم یا زیادتی

کے بدل کے طور پر پیش کی جا سکے۔ اس کے علاوہ کوئی اور ذریعہ نہ ہوگا اور نہ کوئی مددگار ہی ہوگا۔ اس لیے اللہ کے سامنے لوگ تنہا تنہا اور الگ الگ کھڑے کیے جائیں گے، تاکہ ان کو ان کے اعمال دکھائے جائیں۔ اس کا مقصد یہی ہے کہ اعمال کو سامنے لایا جائے، اور حساب مکمل کیا جائے۔

اعمال کی جزا و سزا کا سامنا کرنا یقیناً ایک مشکل مرحلہ ہوگا لیکن اپنے اعمال کا سامنا کرنا بھی آدمی کے لیے کوئی آسان کام نہیں ہوتا۔ بعض حالات میں یہ بڑی سزا بن جاتی ہے جب لوگوں کے سامنے اعمال کا سامنا کرنا پڑ جائے اور اگر اعمال کا برا نتیجہ سامنے آ جائے تو پھر شرمندگی اور جگ ہنسائی بہت بڑھ جاتی ہے۔ بہر حال اس دن جب زمین کو پوری شدت کے ساتھ ہلا دیا جائے گا، اور وہ اپنے بوجھ نکال باہر کرے گی اور زمین اپنے اوپر گزرنے والے حالات بیان کرے گی، لوگ تنہا اور منتشر اپنے اپنے اعمال کے ساتھ کھڑے ہوں گے۔ اس سب کا مقصد یہ ہے کہ اعمال سامنے آئیں اور لوگوں کا حساب کیا جائے اور جزا و سزا دی جا سکے۔

فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ۝ وَ مَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ۝ (الزلزال: ۷، ۸)

”پھر جس نے ذرہ برابر نیکی کی ہوگی وہ اس کو دیکھ لے گا، اور جس نے ذرہ برابر بدی کی ہوگی وہ اس کو دیکھ لے گا۔“

یہ آیت دراصل اس سورہ کا خلاصہ ہے، بلکہ ایک مفسر کے الفاظ میں یہ پورے قرآن کا خلاصہ ہے۔ یہ اتنی جامع آیت ہے کہ اس پر دین کا مدار ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ آدمی زندگی اس طرح گزارے کہ وہ یہ سمجھے کہ وہ جو بھی اچھا یا برا عمل کرے گا، سامنے آئے گا، اور اس کی جزا و سزا اسے مل کر رہے گی۔ یہی دراصل پورے دین کا خلاصہ اور بنیاد ہے۔ یہ جان لینا کہ کون سے اعمال اچھے ہیں، جنھیں کرنا چاہیے، یہ تو بہت آسان کام ہے۔ اصل کام تو دل کے اندر یہ احساس راسخ ہونا ہے اور یہ کیفیت طاری ہونا ہے کہ آدمی جو عمل بھی کرے گا اس کا بدلہ اسے ضرور مل کر رہے گا، خواہ وہ ذرّہ برابر نیکی ہو یا ذرّہ برابر بدی۔

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے جو اگرچہ بہت اہم سوال نہیں ہے کہ بہت ساری نیکیاں ایسی ہیں، جو کافر بھی کرتے ہیں اور بہت سارے برے اعمال ایسے ہیں، جو مسلمان بھی کرتے ہیں، ان کا کیا ہوگا؟ ایک رائے یہ ہے کہ اللہ کا جو قانون بھی ان نیکیوں اور برائیوں کے ساتھ

معاملہ کرنے کا ہے، اس قانون سے گزرنے کے بعد جو نیکیاں، نیکی کی صورت میں باقی رہیں گی اور جو برائیاں برائی کی صورت میں باقی رہیں گی، وہی آدمی کی نگاہوں کے سامنے آئیں گی۔ اگر توبہ کرنے سے گناہ مٹ جاتا ہے تو وہ آدمی کے سامنے نہیں آئے گا۔ اس حوالے سے ایک دوسری رائے یہ ہے کہ انسان کا گناہ اس کے سامنے آئے گا اور پھر اس کو یہ دکھایا جائے گا کہ توبہ کرنے سے یہ گناہ مٹ گیا۔ یہ بات بھی سامنے آئے گی کہ کافر کے شرک اور کفر کی وجہ سے اس کی نیکی کی جزا نہیں پاس کی گئی، اس مقام پر نہیں پہنچ سکے گی جہاں پر کافر پہنچتا اگر وہ اللہ پر ایمان لاتا۔ البتہ یہ بات واضح ہے کہ آدمی کے سامنے ہر چیز آ جائے گی۔

ذرہ برابر نیکی اور ذرہ برابر بدی کی جزا ہی وہ میزان ہے، جو اللہ تعالیٰ قیامت کے روز لگائے گا۔

وَ نَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْئًا ؕ وَ اِنْ كَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ اَتَيْنَا بِهَا ؕ وَ كَفٰى بِنَا حٰسِبِيْنَ ۝

(الانبیاء:۴۷)

''قیامت کے روز ہم ٹھیک تولنے والے ترازو رکھ دیں گے، پھر کسی شخص پر ذرہ برابر ظلم نہ ہوگا، جس کا رائی کے دانے برابر بھی کچھ کیا دھرا ہوگا وہ ہم سامنے لے آئیں گے۔ اور حساب لگانے کے لیے ہم کافی ہیں۔''

اعمال تولنے کی ضرورت نہیں تھی اگر اللہ تعالیٰ چاہے تو تولے بغیر بھی جزا و سزا دے سکتا ہے اور اس میں انصاف کی کوئی خلاف ورزی نہیں ہوگی، لیکن میزان اس لیے آویزاں کی جائے گی کہ عدل کے تقاضے پورے کیے جاسکیں۔ یہ میزان کس طرح قائم کی جائے گی، یہ تو ہم نہیں جانتے، اس لیے کہ وہ عالم طبعی نہ ہوگا۔ وہ ایک دوسرا عالم ہوگا جہاں قدر و قیمت کے پیمانے دوسرے ہوں گے، وہاں سونے چاندی کو اٹھا کر پھینک دیا جائے گا کہ ان کا کوئی وزن نہ ہوگا۔ لیکن سچائی، نیکی، سخاوت کو قبول کیا جائے گا جنھیں اس دنیا میں سونے چاندی کے مقابلے میں کوئی وزن نہیں دیا جاتا۔ وہ ترازو کیسی ہوگی یہ ہم نہیں جانتے البتہ وہ ترازو اعمال کو تولنے کے لیے ہوگا۔ ہم چیزوں کو تولنے اور ان کے وزن کرنے سے ان کی قدر و قیمت کا تعین کرتے ہیں، یہ بات ہمارے روزمرہ مشاہدے میں ہے۔ اللہ تعالیٰ اس لیے اس ترازو کو پیش کر رہا ہے کہ نیکی اور بدی

کی قدر ہمارے دل میں اتر جائے اور یہ بات ہمارے ذہن میں نقش ہو جائے کہ کل یہ کچھ پیش آنے والا ہے، اور ہم نیکی کی قدر کرنے والے اور بدی سے بچنے والے بن جائیں۔

یہ ترازو جو ذرہ برابر نیکی سے ادھر سے ادھر ہو جائے گا اس کا تجربہ اور مشاہدہ عام بازاروں میں تو نہیں ہوتا کہ ایک دانہ گیہوں کا ڈالنے سے ترازو ادھر سے ادھر ہو جائے۔ البتہ جو لوگ سائنسی لیبارٹریوں میں کام کرتے ہیں، وہ جانتے ہیں کہ ایسے ترازو بھی سائنسی دنیا کے اندر پائے جاتے ہیں کہ اگر پیمائش میں بالکل معمولی سا ذرّہ برابر بھی فرق پڑ جائے تو وہ فوراً چھلک جاتے ہیں۔ اگر آج دنیا کے اندر اس طرح کے ترازو پائے جاتے ہیں جو طبعی طور پر ذرہ برابر فرق کی پیمائش کر سکتے ہیں تو یقیناً کل اللہ کے ہاں بھی ایسا ترازو ہو سکتا ہے۔ اگر ذرّہ برابر بھی نیکی آئے گی تو فرق محسوس ہو جائے گا، اور ذرّہ برابر برائی آئے گی تو بھی ترازو کے اندر فرق پڑ جائے گا۔

سید قطب شہید رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ ترازو دنیا کے اندر نہیں پایا جاتا لیکن ایک جگہ ضرور پایا جاتا ہے اور وہ جگہ ہے مومن کا دل۔ مومن کے دل میں یہ ترازو لٹکا ہوتا ہے۔ ادھر اللہ کو ناراض کرنے والی ذرا سی کوئی بات ہوئی، اُدھر ترازو میں ارتعاش پیدا ہو جاتا ہے فوراً پتا چل جاتا ہے کہ کوئی غلط کام سرزد ہو گیا ہے۔ اسی طرح اگر کوئی ایسا کام ہو جائے جو اللہ کو خوش کرنے والا ہوتا ہے، تو دل کے ترازو میں ایک خوش گوار احساس نمودار ہو جاتا ہے۔ اسی لیے دل کے اندر یہ ترازو آویزاں کرنے کی اس سورہ کے اندر تعلیم دی گئی ہے تاکہ ذرّہ برابر نیکی اور ذرّہ برابر بدی کا احساس ہوتا رہے۔

اس کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ آدمی چھوٹی چھوٹی چیزوں کی تو پروا کرے، اور بڑی بڑی چیزوں کو نظر انداز کر دے۔ بسا اوقات انسان کے اندر یہ ضعف پیدا ہو جاتا ہے۔ ایک بزرگ کے الفاظ میں انسان مچھر تو چھانتا ہے اور اونٹ نگل جاتا ہے۔ بڑے بڑے گناہ کر جاتا ہے اور چھوٹے گناہوں کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑا رہتا ہے۔ چھوٹی بڑی نیکیاں اور چھوٹے بڑے گناہ یقیناً برابر نہیں۔ لہٰذا اس بات کا اہتمام ضروری ہے کہ آدمی بڑی نیکیاں کرے اور بڑے گناہوں سے بچے اور چھوٹے چھوٹے گناہوں سے بھی چوکنا رہے۔ انسان کا یہ مزاج بن جائے کہ نیکی کوئی بھی ہو کرنے کے لیے ہے، اور برائی کوئی بھی ہو بچنے کے لیے ہے۔

کسی برائی کو چھوٹا سمجھ کر بے پروائی برتنا، یا اللہ سے لاپروا ہو جانا، یہ بڑا گناہ اور

جسارت ہے۔ چھوٹی نیکی کو یہ سمجھ کر نظرانداز کرنا کہ اس سے کیا ہوتا ہے یا کوئی اہمیت نہ دینا بھی بڑا گناہ ہے۔ نیکی چھوٹی ہو یا بڑی اپنی جگہ اہم ہے۔ اس لیے کہ کسی آدمی کو تو اللہ نے اس لیے جنت میں داخل کر دیا کہ اس نے راستے سے کانٹا ہٹا دیا تھا کہ مسافروں کو تکلیف نہ ہو، اور ایک آدمی کو اس لیے جنت میں داخل کر دیا کہ اس نے ایک پیاسے کتے کی پیاس بجھا دی تھی۔ درحقیقت کوئی نیکی چھوٹی نہیں ہوتی ہے۔

حدیث میں ہے کہ کسی نیکی کو چھوٹا نہ سمجھو، یہاں تک کہ اپنے بھائی کے ڈول میں پانی ڈال دینے کو بھی معمولی نیکی نہ سمجھو۔ اگر تم اپنے بھائی سے مسکرا کر خندہ پیشانی کے ساتھ پیش آتے ہو تو یہ بھی اللہ کی نظر میں بہت بڑی نیکی ہے۔ اسی طرح اگر تمھارے پاس بکری کا جلا ہوا پایا ہو اور وہ ہدیے میں دینا پڑے تو دے دو، یہ بھی اللہ کو محبوب ہے۔ جہنم کی آگ سے بچو۔ اگر ایک چھوہارے کا ٹکڑا بھی تمھارے پاس ہو اور اس کو دے کر جہنم کی آگ سے بچ سکو تو بچو۔ آپؐ نے معمولی سے معمولی نیکی کرنے کی بھی تلقین فرمائی ہے۔ اگر کسی کے پاس دینے کے لیے چھوہارے کا ٹکڑا بھی نہ ہو تو وہ صرف بھلی بات کہہ کر ہی اپنے آپ کو جہنم کی آگ سے بچائے۔ ہر نیکی کرنا چاہیے اور ہر برائی سے بچنا چاہیے، یہ ایک مزاج ہے اور یہی مطلوب ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ اپنے اعمال کی فکر کی جائے اور اللہ کی رحمت طلب کی جائے، اسی سے اللہ کی خشیت پیدا ہوتی ہے۔ وہ رحمٰن جب روزِ محشر عدل کی میزان قائم کرے گا، اعمال کی جزا وسزا ہوگی اور اس کی رحمت بے پایاں کا دریا بہہ رہا ہوگا، وہاں بھی اپنے اعمال کی وجہ سے اس کی رحمت حصہ میں نہ آئی تو اس سے بڑی بدبختی اور کیا ہوگی؟

اعمال کی قدر و قیمت کا احساس کہ اللہ کی نگاہ میں اہمیت اعمال کی ہے اور کسی چیز کی نہیں، ہر وقت مستحضر رہنا چاہیے۔ آدمی چاہے کتنی ہی دولت جمع کر لے، کتنے ہی مکان بنا لے، اور اس کے خواہ کتنے ہی دوست، احباب اور رشتے دار ہوں، اُن میں سے کوئی چیز بھی کام آنے والی نہیں ہے، اگر کوئی کام آئے گا تو صرف نیک اعمال ہی کام آئیں گے۔

قیامت کے روز اعمال الگ الگ کر کے انسان کو اس طرح دکھا دیے جائیں گے کہ کوئی چیز بھی پوشیدہ نہ رہے گی۔ اس کے ایک معنی یہ بھی ہیں اور یہ ہمیشہ ذہن میں رہنا چاہیے کہ اعمال نامے سے کوئی چیز چھوٹی ہو یا بڑی غائب نہیں ہوسکتی۔ اس بات کو قرآن مجید نے واضح طور پر

بیان فرمایا ہے کہ جب آدمی کے ہاتھ میں اعمال نامہ دیا جائے گا تو پکار اٹھے گا: یٰوَیْلَتَنَا مَالِ هٰذَا الْكِتٰبِ لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً (الکهف:۴۹) ''ہائے ہماری کم بختی، یہ کیسی کتاب ہے کہ ہماری کوئی چھوٹی بڑی حرکت ایسی نہیں رہی جو اس میں درج نہ ہوگئی ہو۔'' وَ كَفٰى بِاللّٰهِ حَسِيْبًا (النساء:٦) ''اور حساب لینے کے لیے اللہ کافی ہے۔'' انسان خود بھی اپنا حساب لینے کے لیے کافی ہے: اِقْرَاْ كِتٰبَكَ ؕ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا ؕ (بنی اسرآئیل:۱۴) ''پڑھ اپنا نامۂ اعمال آج اپنا حساب لگانے کے لیے تو خود ہی کافی ہے۔'' اس روز کسی حساب لینے والے کی ضرورت ہی نہیں ہوگی۔ اس لیے کہ ہر چیز سامنے ہوگی، چھوٹی سی چھوٹی نیکی بھی سامنے ہوگی اور چھوٹی سے چھوٹی برائی بھی ـــــ اے اللہ! تو ہم سے آسان حساب لینا۔

اگر اس گھڑی کا منظر نگاہوں کے سامنے رہے، دل میں احساس ہو اور اس کے لیے انسان تیاری کرے اور آگے وہ سرمایہ بھیجے جو کہ آخرت میں کام آنے والا ہے، پیسہ اور قوتیں ان کاموں میں صرف کرے، جو اللہ کو محبوب اور پسند ہوں، برتاؤ اور سلوک وہ رکھے اور گفتگو و بات چیت ویسی کرے، جس کا اللہ نے حکم دیا ہے، اور اس سے بچے، جس سے اس نے روکا ہے ـــــ یہ وہ راستہ ہے، جس سے اللہ کے سامنے پیش ہونے کا مرحلہ خطرات، اندیشوں اور خوف سے پاک ہو جاتا ہے، اور اس سے وہ خشیت پیدا ہوتی ہے جس کے بارے میں اللہ نے فرمایا:

رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَ رَضُوْا عَنْهُ ؕ (البینة:۸)

''اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے۔''

وہ سلسلۂ کلام جو ابتدا سے چل رہا ہے اور ہر چیز اس کی مناسبت سے آرہی ہے، اس سورہ میں بھی آگے بڑھا ہے۔ آگے تین سورتیں اور آنے والی ہیں جو آخرت ہی کے بیان پر ہیں۔ یہ اس لیے ہے کہ وہ خشیت اور استعداد جس سے آدمی اللہ کے دین کو خالص کر کے یکسو ہو کر اس کی بندگی کر سکے، نماز قائم کر سکے، زکوٰۃ ادا کر سکے، جسم و جان اور مال و دولت میں اس کے عاید کردہ حقوق ادا کر سکے، وہ استعداد و صلاحیت اور قوت ایمان صرف آخرت میں جواب دہی کے یقین ہی سے پیدا ہو سکتی ہے۔

ﷲﷲ

سورۃ العادیات

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

وَالْعٰدِيٰتِ ضَبْحًا ۙ﴿۱﴾ فَالْمُوْرِيٰتِ قَدْحًا ۙ﴿۲﴾ فَالْمُغِيْرٰتِ صُبْحًا ۙ﴿۳﴾ فَاَثَرْنَ بِهٖ نَقْعًا ۙ﴿۴﴾ فَوَسَطْنَ بِهٖ جَمْعًا ۙ﴿۵﴾ اِنَّ الْاِنْسَانَ لِرَبِّهٖ لَكَنُوْدٌ ۚ﴿۶﴾ وَاِنَّهٗ عَلٰى ذٰلِكَ لَشَهِيْدٌ ۚ﴿۷﴾ وَاِنَّهٗ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيْدٌ ۭ﴿۸﴾ اَفَلَا يَعْلَمُ اِذَا بُعْثِرَ مَا فِي الْقُبُوْرِ ۙ﴿۹﴾ وَحُصِّلَ مَا فِي الصُّدُوْرِ ۙ﴿۱۰﴾ اِنَّ رَبَّهُمْ بِهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّخَبِيْرٌ ۧ﴿۱۱﴾

ع ۱۱ ۲۵

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔

قسم ہے ان (گھوڑوں) کی جو پھنکارے مارتے ہوئے دوڑتے ہیں، پھر (اپنی ٹاپوں سے) چنگاریاں جھاڑتے ہیں، پھر صبح سویرے چھاپہ مارتے ہیں، پھر اس موقعے پر گرد وغبار اڑاتے ہیں، پھر اسی حالت میں کسی مجمع کے اندر جا گھستے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان اپنے رب کا بڑا ناشکرا ہے، اور وہ خود اس پر گواہ ہے، اور وہ مال و دولت کی محبت میں بری طرح مبتلا ہے۔ تو کیا وہ اس وقت کو نہیں جانتا جب قبروں میں جو کچھ (مدفون ہے) اسے نکال لیا جائے گا، اور سینوں میں جو کچھ (مخفی) ہے اسے برآمد کر کے اس کی جانچ پڑتال کی جائے گی؟ یقیناً ان کا رب اس روز ان سے خوب باخبر ہوگا۔

تشریح: وَالْعٰدِيٰتِ ضَبْحًا ۙ فَالْمُوْرِيٰتِ قَدْحًا ۙ فَالْمُغِيْرٰتِ صُبْحًا ۙ فَاَثَرْنَ بِهٖ نَقْعًا ۙ فَوَسَطْنَ بِهٖ جَمْعًا ۙ (العٰدیٰت: ۱-۵)

''قسم ہے ان (گھوڑوں) کی جو پھنکارے مارتے ہوئے دوڑتے ہیں، پھر (اپنی ٹاپوں سے) چنگاریاں جھاڑتے ہیں، پھر صبح سویرے چھاپہ مارتے ہیں، پھر اس موقعے پر گردوغبار اڑاتے ہیں، پھر اسی حالت میں کسی مجمع کے اندر جا گھستے ہیں۔''

اس سورہ کی پہلی پانچ آیات میں دوڑنے والے گھوڑوں کی قسم کھائی گئی ہے۔ کسی چیز کی قسم، جیسا کہ بار بار یہ بات سامنے آچکی ہے، اس لیے نہیں کھائی جاتی کہ وہ مقدس ہے۔ بلکہ اس کے لیے کھائی جاتی ہے کہ جو مضمون بیان کیا جارہا ہے، اس کے اوپر گواہی، شہادت، دلیل اور ثبوت سامنے آسکے۔ بعض سورتوں میں جس مضمون پر قسم سے گواہی اور دلیل دی جاتی ہے وہ فوراً ہی بیان کر دیا جاتا ہے، اور بعض جگہ کچھ فاصلے پر ذکر ہوتا ہے، اور بعض جگہ پوری سورہ کا مضمون اسی قسم پر مبنی ہوتا ہے۔ یہاں پر قسم تیزی کے ساتھ دوڑنے والوں پر اٹھائی گئی ہے۔ اس کا کیا مطلب ہے؟

بعض لوگوں نے اس سے مراد اونٹ لیے ہیں اور بعض کے نزدیک اس سے مراد گھوڑے ہیں۔ البتہ قرآن مجید نے نہ اونٹ کا ذکر کیا ہے نہ گھوڑوں کا۔ بہت سی قسموں میں قرآن مجید کا یہی انداز ہے، کہ وہ صاف بیان نہیں کرتا کہ کیا چیز ہے، جس کی صفات بیان ہو رہی ہیں۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ اگر یہاں گھوڑے یا اونٹ کا مفہوم نہ لیا جائے تو کسی بھی زمانے میں، کسی بھی جگہ یہ قسمیں کسی بھی چیز پر منطبق ہوسکتی ہیں۔ چوں کہ قرآن مجید ہر زمانے اور ہر قوم کے لیے ہے، اس لیے انسانی ذہن اپنے علم اور تجربے کے مطابق جس چیز پر بھی اس کا انطباق کرسکتا ہو، اس پر انطباق کیا جاسکتا ہے۔

یہاں تین چیزیں فوراً ہی ذکر کردی گئی ہیں۔ ایک یہ کہ انسان اپنے رب کا ناشکرا ہے۔ دوسری یہ کہ وہ مال و دولت کی محبت میں بری طرح مبتلا ہے۔ تیسری یہ کہ وہ اس وقت کو نہیں جانتا جب قبروں میں جو کچھ مدفون ہے اسے نکال لیا جائے گا، اور سینوں میں جو کچھ مخفی ہے اسے برآمد کر کے اس کی جانچ پڑتال کی جائے گی۔

اِنَّ الْاِنْسَانَ لِرَبِّهٖ لَكَنُوْدٌ ۝ (العٰدیٰت:۶)

''حقیقت یہ ہے کہ انسان اپنے رب کا بڑا ناشکرا ہے۔''

قسم اٹھانے کے بعد ناشکرا تو اردو ترجمہ ہے، عربی کا لفظ کَنُوْدٌ ہے۔ جب تک کَنُوْدٌ کے معنی نہ سمجھے جائیں اس وقت تک پوری سورہ اور مضمون کا مطلب واضح نہ ہوگا۔

عربی زبان میں جس زمین سے کوئی چیز پیدا نہ ہو، اس کو کَنُودٌ کہا جاتا ہے۔ ایک حدیث کے مطابق کَنُودٌ وہ ہے جو تنہا خور ہو، اکیلا ہی کھاتا ہو، جو کچھ اللہ تعالیٰ نے اس کو نعمتیں دی ہیں ان میں وہ کسی کو شریک نہ کرتا ہو، بلکہ اکیلا ہی ان سے فائدہ اٹھاتا ہو۔ کَنُودٌ سے مراد وہ شخص ہے جو بھلائی کو اپنے تک محدود رکھتا ہو تاکہ کسی کو اس سے نفع نہ پہنچے۔ اس کا ایک مفہوم وہ شخص بھی ہے جو اپنے ماتحت یا زیردست کے اوپر زیادتی کرے اور اسے مارے پیٹے۔ جو بھلا ہونے پر تو اللہ تعالیٰ کا شکر ادا نہ کرے لیکن اگر اسے کوئی تکلیف پہنچے تو اس پر شکوہ کرے۔ کَنُودٌ کے یہ معنی بھی ہیں کہ جس کی ذات سے کسی کو نفع نہ پہنچے بلکہ الٹا دوسروں کا حق مارے اور دوسروں پر جبر و تشدد اور زیادتی کرے اور جو کچھ بھی اللہ نے اس کو بخشا ہے، اسے اکیلا ہی ہضم کرنا چاہے۔ لازماً وہ شخص کنجوس بھی ہوگا اور بخیل بھی۔ چناں چہ بخیل اور کنجوس کے معنوں میں بھی عربی زبان میں یہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔

یہاں کسی مخصوص فرد کی نشان دہی نہیں کی گئی بلکہ انسانی فطرت کے ایک پہلو کو اجاگر کیا گیا ہے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر یہاں تیزی سے دوڑنے والوں سے مراد گھوڑے لیے جائیں تو پھر اس قسم کا سورہ کے مضمون سے کیا تعلق ہے؟

پہلی پانچ آیات کو سامنے رکھا جائے تو ان میں گھوڑوں کی مختلف صفات بیان ہوئی ہیں۔ اگر ان صفات پر غور کیا جائے تو یہ ایسے گھوڑوں کا ذکر ہے، جو تیزی کے ساتھ بھاگتے ہوئے اپنی ٹاپوں سے جن پر لوہے کے نعل لگے ہوتے ہیں اور جب وہ پتھروں سے ٹکراتے ہیں تو ان سے چنگاریاں جھاڑتے ہیں، اور گرد و غبار اڑاتے ہوئے علی الصبح دشمن کی فوج میں جا گھستے ہیں اور ان پر دھاوا بول دیتے ہیں۔ عرب کے اندر یہ بہت عام تھا۔ قبائل کے درمیان لڑائی اور دشمنی صرف جھگڑوں پر نہیں ہوتی تھی بلکہ لوٹ مار کے لیے اور لونڈی، غلام حاصل کرنے کے لیے بھی، قبائل ایک دوسرے پر حملہ آور ہوتے تھے۔ یہ اس وجہ سے تھا کہ انسان اللہ تعالیٰ کی ناشکری کرتا تھا اور جو وسائل و ذرائع اللہ تعالیٰ نے اسے بخشے تھے وہ ان کو انسان کی خدمت اور ان کا حق ادا کرنے کی بجائے لوٹ مار اور ظلم و زیادتی کی نذر کر دیتا تھا۔

وہ سرکشی جس میں آدمی بندوں سے ان کا حق روک لے، یہی اللہ تعالیٰ کی ناشکری ہے۔ اللہ تعالیٰ کو جو شکر مطلوب ہے، وہ اس خوشامد پسند بادشاہ کی طرح نہیں ہے کہ آدمی صبح و شام

کھڑے ہوکر اس کی تعریف کرتا رہے، بلکہ شکر کی تعریف ہی یہ ہے کہ اللہ نے جو کچھ بھی انسان کو بخشا ہے وہ اس کا حق ادا کرے، اور ان وسائل و ذرائع اور صلاحیتوں کی جو اللہ نے اس کو ودیعت کی ہیں، اللہ کی مرضی کے مطابق اللہ کے بندوں کو نفع پہنچانے اور ان کی خدمت کے لیے استعمال کرے۔ چوں کہ کَنُوْدٌ کی تعریف صرف یہ نہیں ہے کہ ناشکری کرے، بلکہ یہ بھی ہے جو کسی کے کام نہ آئے، کسی کو نفع نہ پہنچائے، نفع کو روک لے، جو کچھ بھی اللہ نے دیا ہے صرف اکیلا کھانا چاہے، سب کچھ صرف اپنی ذات کے لیے کرے، خود غرض ہو اور دوسروں کے کام نہ آئے۔ لہٰذا اس آیت کا ایک مفہوم یہ بھی لیا جاسکتا ہے۔

یہاں گھوڑوں کی قسم اس لیے بھی کھائی گئی ہے کہ اس زمانے میں گھوڑا عرب معاشرت کی ناگزیر ضرورت تھی۔ ایک عظیم نعمت خداوندی تھی لیکن عربوں نے اس نعمت پر شکر گزاری کے بجائے ناشکری اور خودغرضی کی روش کو اپنایا جو کہ کَنُوْدٌ کی تعریف میں آتی ہے۔

یہ کہا جاسکتا ہے کہ آج کل تو گھوڑوں کے ذریعے یہ کام نہیں ہوسکتا، لیکن گھوڑے ہوں یا ٹینک، ہوائی جہاز ہوں یا کروز میزائل، یہ سب انھی صفات کے حامل ہیں، یعنی تیزی کے ساتھ دوڑنا اور پھر آگ برسانا اور صبح صبح دھاوا بول دینا اور آگ اور دھوئیں کے طوفان اٹھانا، اور پھر اسی دھوئیں میں اپنے دشمن کو تباہ کر دینا۔ اب بھی حملے خواہ ہوائی جہازوں سے ہوں یا کروز میزائلوں سے، عموماً علی الصبح ہی کیے جاتے ہیں۔ یہ نظارے اس صدی میں دنیا ایک دفع نہیں بلکہ کئی دفعہ دیکھ چکی ہے۔ پہلی جنگ عظیم ہو یا دوسری جنگ عظیم، یا کئی دوسری بے شمار جنگیں، کوئی بڑی طاقت ہو یا بہت چھوٹے پیمانے پر کوئی زبردستی کسی چھوٹے سے گاؤں یا کسی چھوٹی سی بستی میں جاگھسے، یا ظالم حکومتیں یا ان کی پولیس اور فوج ہو، سب اسی قسم کی کارروائیاں کرتے ہیں، اسی طریقے سے دھاوا بولتے ہیں اور بستیوں میں جاگھستے ہیں، ظلم و جبر وحشت و درندگی کی انتہا کردیتے ہیں، عورتوں کو پکڑ کر ہوس کا نشانہ بناتے اور ننگا نچا کر ان کی تذلیل کرتے ہیں۔

یہ ساری چیزیں دراصل اس بات کی نشان دہی کرتی ہیں کہ آدمی اپنے رب کو بھول جاتا ہے اور اس بات کو فراموش کر دیتا ہے کہ اس کے پاس جو قوت، طاقت اور وسائل ہیں وہ رب کے دیے ہوئے ہیں، اور دنیا کی محبت میں وہ یہ ساری زیادتیاں کرتا ہے۔ دراصل یہ اللہ کی ناشکری ہے۔ اللہ کا شکر یہ نہیں ہے کہ آدمی زبان سے کہتا رہے کہ اے اللہ! تیرا شکر، اور حمد کے ترانے گاتا

رہے۔اللہ تعالیٰ کو کسی خوشامد پسند بادشاہ کی طرح اس کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ جو کچھ اللہ نے اس کو بخشا ہے، اس کو وہ اللہ کی مرضی کے مطابق استعمال کرے اور اس میں سے بندوں کا حق ادا کرے، یہ حقیقی شکر گزاری ہے۔

اگر اس تصویر کو وسیع تناظر میں دیکھا جائے جو قرآن مجید نے عرب قبائل کی ایک دوسرے کے خلاف زیادتی، غارت گری، لوٹ مار اور مار دھاڑ کی شکل میں کھینچی ہے، خود انسان کے پورے نفس کی یہی کیفیت ہے۔ جب وہ اپنے رب کے ساتھ تعلق اور مقصد زندگی کے تصور سے عاری ہوتا ہے، اور اس احساس سے بے گانہ ہوتا ہے کہ اس کے پاس جو کچھ بھی ہے وہ خدا کا دیا ہوا ہے اور اس کو اس کی مرضی کے مطابق استعمال ہونا چاہیے، تو پھر وہ ان چیزوں کی طرف دوڑتا ہے، جو چیزیں دنیا کی محبت اور دنیا کے مفاد کا تقاضا ہوتی ہیں۔ قومیں، قوموں پر چڑھ دوڑتی ہیں، جاگیردار مزارعوں پر ظلم ڈھاتے ہیں، سرمایہ دار مزدوروں کے حقوق غصب کرتے ہیں، جس کا جہاں تک بس چلتا ہے اپنے مفاد کی خاطر سب کچھ کر گزرتا ہے۔ دراصل آدمی جب اپنے نفس کو بے لگام کر دیتا ہے اور خواہشات نفس کے پیچھے تیزی کے ساتھ دوڑتا ہے تو پھر وہ جگہ جگہ فساد کی آگ بھڑکاتا ہے، اور جو اس کا اپنا مال اور حق نہیں ہوتا اس پر دھاوا بولتا ہے، بے لگام جانور کی طرح جو ہاتھ آتا ہے، اس پر قبضہ جمالیتا ہے۔ یہ ہر اس شخص کی کیفیت ہوتی ہے جو اپنے نفس کے مطالبات اندھا دھند پورا کرنے میں لگ جاتا ہے، اپنے رب سے غافل ہو جاتا ہے اور ایمان سے خالی ہو جاتا ہے، اور رب کی ناشکری کی راہ اختیار کرتا ہے۔

ایک اور حوالے سے دیکھا جائے تو اس میں ہدایت کا ایک اور پہلو بھی موجود ہے اور یہ بالکل اس کا ایک دوسرا رخ ہے۔ گھوڑے انسان کے تابع ہوتے ہیں، جب کہ انسان نے ان کو پیدا بھی نہیں کیا، اور جو چارہ وہ ان کو دیتا ہے وہ بھی اس کا اپنا پیدا کیا ہوا نہیں ہے، مگر وہ اپنے مالک کی اطاعت میں اس کے اشارے پر دوڑ پڑتے ہیں اور اپنا سب کچھ اس کے حکم کی تعمیل میں اس طرح لگا دیتے ہیں کہ ہانپنے لگتے ہیں۔ جب آدمی بہت تیز دوڑے تو اس کا سانس پھولنے لگتا ہے اور تیز آواز نکلتی ہے۔ گھوڑے بھی جب تیز دوڑتے ہیں تو ان کی بھی ہانپنے کی آواز نکلتی ہے اس کو ضَبۡحًا کے لفظ سے پکارا گیا ہے۔ پاؤں کے نیچے اگر آگ کے شعلے دہک رہے ہوں، خود اپنے ہی پاؤں مارنے سے چٹانوں پر شعلے نکلتے ہوں، تو اپنے مالک کی رضا کی خاطر وہ ان آگ کے شعلوں

پر بھی چلتے ہیں، اور جدھر مالک لے جاتا ہے ادھر علی الصبح جا کر حملہ آور ہوتے ہیں۔ کتنی ہی دھند اور غبار ہو، وہ اس کی قطعی پروا نہیں کرتے اور جہاں بھی مالک لے جائے اس کے بیچ گھس پڑتے ہیں۔ اس میں ایک لحاظ سے انسان کے لیے بھی سبق ہے۔

انسان کو تو اس کے رب نے پیدا کیا ہے، جو کچھ بھی اس کے پاس ہے اس کے رب کا دیا ہوا ہے، جسم و جان کی ساری قوتیں اسی کی بخشی ہوئی ہیں، لیکن جن گھوڑوں کو وہ استعمال کر رہا ہے اور اگر وسیع تر تناظر میں دیکھا جائے، جو وسائل و ذرائع بھی اللہ تعالیٰ نے اس کو دیے اور عطا کیے ہیں جن سے وہ بڑی ایجادات کر رہا ہے، بڑے بڑے کام دنیا کے اندر کر رہا ہے، اگر یہ سب کائنات کی قوتیں اس کے لیے مسخر کی گئی ہیں اور اس کی تابع ہیں، تو اس کو بھی چاہیے کہ وہ اپنے رب کا تابع ہو، اور اس کی مکمل اطاعت کرے۔ اُسی کی خاطر اسے بھاگ دوڑ کرنا چاہیے، اور اس راہ میں خواہ کتنی ہی کٹھن مشکلات و مصائب کا سامنا ہو، اس کو بے جگری اور استقامت کے ساتھ اس کی اطاعت میں لگے رہنا چاہیے۔

یہ ان گھوڑوں کی پانچ صفات ہیں، جن کا ابتدا میں ذکر ہوا ہے، ان کی قسم کھائی گئی ہے اور گواہی کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ انسان جو اللہ کی افضل ترین مخلوق ہے، اس کا یہ حال کہ ان سے سبق نہیں سیکھتا بلکہ اُلٹا ناشکری کرتا ہے، اور جو کچھ اللہ نے دیا ہے اس کو تنہا کھانا چاہتا ہے، اور جو کمزور اور زیردست ہیں اور جن پر اس کا بس چلتا ہے، ان پر وہ ظلم ڈھاتا ہے۔

وَ اِنَّهٗ عَلٰی ذٰلِکَ لَشَهِیْدٌ ۝ (العٰدیٰت:۷)

''اور وہ مال و دولت کی محبت میں بری طرح مبتلا ہے۔''

دراصل جو قسمیں کھائی گئی ہیں یہ ان کا جواب بھی ہے، اور ترتیب سے آیات پر غور کیا جائے تو دراصل یہ جڑ ہے ساری خرابی کی۔ آدمی جزا اور سزا کو بھول کر اس کا ارتکاب کرتا ہے۔ وہ یہ بھول جاتا ہے کہ ایک روز بردست زلزلہ آنے والا ہے: اِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ شَیْءٌ عَظِیْمٌ ۝ (الحج:۱) ''حقیقت یہ ہے کہ قیامت کا زلزلہ بڑی (ہولناک) چیز ہے۔'' وہ اس بڑے زلزلے کو بھی فراموش کر دیتا ہے، اور اللہ کی خشیت سے بھی خالی ہو جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ مال کی محبت میں بری طرح مبتلا ہے۔ یہاں مال کے لیے 'خَیْرٌ' کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ قرآن مجید میں ایک جگہ نہیں بلکہ کئی جگہ خیر کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ خیر کے معنی نیکی اور بھلائی کے ہیں۔ یہ لفظ

کیوں استعمال ہوا ہے، اس کی بظاہر دو بڑی وجوہات ہیں۔

ایک وجہ تو یہ ہے کہ آدمی سب سے بڑھ کر اپنی ذات سے محبت کرتا ہے۔ ذات سے محبت کے یہ معنی ہیں کہ اپنی ذات کی بھلائی کو محبوب رکھتا ہے اور اپنی ذات کے لیے خیر کو محبوب رکھتا ہے۔ جب آدمی یہ سمجھتا ہے کہ اس کی ساری بھلائی اور خیر دنیا کے مال و متاع میں ہے، تو پھر وہ مال کی محبت میں مبتلا ہو جاتا ہے، جو اس کو گمراہی کی راہ پر لے جاتی ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ دنیا کا مال و متاع اور سامان اس پر حاوی ہو جائے اور وہ اس کی شدید محبت میں مبتلا ہو کر ہر جائز و ناجائز ذرائع سے اسے سمیٹنے میں لگ جائے۔ مال سے مراد صرف روپے پیسے نہیں بلکہ دنیا کا سارا ساز و سامان، مکان ہو یا جائداد، فیکٹری، کارخانہ ہو یا روزمرہ استعمال کی اشیاء، جیسے لباس اور کھانے پینے کی اشیاء وغیرہ، سب شامل ہیں۔

یہاں یہ بات بھی سمجھ لینی چاہیے کہ مال انسان کی تباہی و بربادی کا ذریعہ نہیں ہے۔ یہ کوئی بری چیز نہیں ہے۔ یہ کوئی ایسی لعنت زدہ شے بھی نہیں ہے جو انسان پر مسلط ہو گئی ہو، اور جس سے اس کو ہر حال میں بچنا چاہیے، بلکہ مال اور دنیا کی یہ ساری متاع و دولت اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسانی بھلائی کا ذریعہ ہے، بشرطے کہ انسان اس کو اپنا محبوب اور مطلوب و مقصود نہ بنا لے، اور اس کی محبت کو دل میں داخل نہ ہونے دے، بلکہ اس کو اپنا خادم بنا کر رکھے۔

مولانا روم کے ایک شعر کا مفہوم ہے کہ اگر پانی کشتی کے نیچے ہو، تو وہ کشتی کی پشت پناہی کرتا ہے اور کشتی اس پر تیر سکتی ہے، اور اگر وہی پانی کشتی کے اندر داخل ہو جائے تو کشتی پانی کے اندر ڈوب جاتی ہے۔ ایسا ہی معاملہ مال و دولت کا بھی ہے۔ اگر آدمی مال کو اپنے ماتحت رکھے اور اپنی مرضی کے مطابق اس کو استعمال کرے تو یہی مال اُس کے لیے خیر کا ذریعہ ہے، اس کو جنت میں لے جا سکتا ہے اور ایک کے سات سو مل سکتے ہیں۔ ہر چیز اس کو واپس مل سکتی ہے، سب کچھ اس کے لیے ذخیرہ ہو سکتا ہے، اور دنیا کا یہ مال و متاع ان انعامات میں تبدیل ہو سکتا ہے جو کبھی ختم ہونے والا نہیں۔ لیکن یہی مال اگر دل کے اندر گھس کر دل پر حکمرانی کرنے لگے تو پھر یہ آدمی کو لے بیٹھتا ہے اور اس کو برباد کر کے رکھ دیتا ہے۔

آدمی کے اندر مال کی محبت ایک حد تک فطری ہے۔ یہ اس کی آزمائش کے لیے ہے۔ قرآن نے خود اس بات کو واضح کیا ہے:

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَ الْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَ الْحَرْثِ ۭ ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ (آل عمران: ۱۴)

''لوگوں کے لیے مرغوبات نفس: عورتیں، اولاد، سونے چاندی کے ڈھیر، چیدہ گھوڑے، مویشی اور زرعی زمینیں بڑی خوش آیند بنادی گئی ہیں، مگر یہ سب دنیا کی چند روزہ زندگی کے سامان ہیں۔''

ان سب چیزوں پر فریفتگی انسان میں فطری طور پر رکھی گئی ہے۔ لیکن اس سے فائدہ اٹھانا، صرف دنیاوی زندگی کی حد تک ہے۔ بقول شخصے اگر مال میں کوئی اور خرابی نہ بھی ہوتی تو یہی خرابی کافی تھی کہ دنیا کے بعد اس سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا جاسکتا اور بالآخر سب کچھ چھوڑنا پڑتا ہے۔

دراصل مال و دولت آزمایش کے لیے ہے۔ مال کی محبت جس چیز کو کہا گیا ہے وہ یہ ہے کہ جب آدمی مال کی محبت میں گرفتار ہوتا ہے تو ہر قیمت پر اس کو حاصل کرنا چاہتا ہے۔ ہر آدمی کا حق مارتا ہے، ہر ایک کے مال پر دست درازی کرتا ہے، اور ہر جائز و ناجائز طریقے سے مال جمع کرتا چلا جاتا ہے۔ مال کو زیادہ سے زیادہ حاصل کرنا، اس کو جمع کرنا، اس کو گن گن کر اور سینت سینت کر رکھنا، اِن ساری خرابیوں کا تذکرہ اگلی سورتوں میں بھی آئے گا۔ یہاں دراصل اس بات کو واضح کیا جارہا ہے کہ انسان جزاوسزا کو بھول کر اور خیر کی راہ کو چھوڑ کر شر کی راہ پر اگر نکل پڑتا ہے تو اس کی کیا وجہ ہے، اور اس کا نقشہ بھی کھینچا گیا ہے، اور غور کیا جائے تو ایک لحاظ سے اس مرض کا علاج بھی تجویز کیا گیا ہے۔

حُبِّ دولت کا علاج یہ ہے کہ آدمی اس گھڑی کو یاد کرے، جب وہ قبر سے نکال کر اللہ کے سامنے کھڑا کر دیا جائے گا، اور اپنے ایک ایک عمل کے لیے جواب دہ ہوگا۔ اس سے پہلی سورہ میں جو بات کہی گئی تھی وہ یہ تھی کہ اس دن اگر اس نے ذرہ برابر نیکی کی ہوگی تو وہ بھی سامنے آجائے گی اور ذرہ برابر برائی کی ہوگی تو وہ بھی سامنے آجائے گی۔ عمل تو عمل ہے، جو ظاہر میں ہوتا ہے لیکن دلوں میں چھپے ہوئے محرکات، اغراض اور نیتیں پوشیدہ ہوتی ہیں۔ اب بات کو مزید آگے بڑھایا جا رہا ہے کہ محرکات، اغراض اور نیتیں تک سامنے آجائیں گی، وہ چھپی نہیں رہ سکیں گی۔

اَفَلَا يَعْلَمُ اِذَا بُعْثِرَ مَا فِي الْقُبُوْرِ ۝ وَحُصِّلَ مَا فِي الصُّدُوْرِ ۝

(العٰدیٰت: ۹، ۱۰)

"تو کیا وہ اس وقت کو نہیں جانتا جب قبروں میں جو کچھ (مدفون ہے) اسے نکال لیا جائے گا اور سینوں میں جو کچھ (مخفی) ہے اسے برآمد کر کے اس کی جانچ پڑتال کی جائے گی۔"

جس طرح جائزے کے لیے چیزوں کو کرید کرید کر نکال کر سامنے لایا جاتا ہے، اسی طرح جو کچھ بھی قبروں میں ہے، قبروں کو ادھیڑ ادھیڑ کر نکال کے سامنے لایا جائے گا، اور جو کچھ سینوں میں چھپا ہوگا وہ بھی سامنے رکھ دیا جائے گا۔ ان دونوں کو بھی ایک دوسرے کے پہلو بہ پہلو اس لیے رکھا گیا ہے کہ قبر کا مطلب وہ قبر نہیں ہے کہ جہاں آدمی کو دفن کیا جاتا ہے بلکہ وہ مٹی ہے، جس میں آدمی کا جسم مٹی میں مل کر مٹی بن جاتا ہے۔ جسم گل سڑ کر مٹی بن جائے گا مگر اللہ تعالیٰ اس کو دوبارہ زندہ کر کے کھڑا کر دے گا، اسی طرح جس طرح مٹی میں چھپ کر دوبارہ جسم ظاہر ہو جاتا ہے۔ ایک طرف قبور ہیں اور دوسری طرف صدور، اور کہا جا رہا ہے کہ اس روز سینوں کے اندر جو نیتیں چھپی ہوئی تھیں وہ بھی سامنے لا کر رکھ دی جائیں گی۔ لہٰذا اگر آدمی نہیں جانتا تو وہ یہ جان لے اور اس پر یقین رکھے کہ ایک روز اس حقیقت کو ظہور پذیر ہو کر رہنا ہے۔ مال کی محبت اور ناشکری کا یہی علاج ہے، جو اس کے اندر بیان کر دیا گیا ہے کہ آخرت کی گھڑی کو یاد رکھا جائے۔ پھر مال کی محبت اس پر حاوی نہیں ہو سکے گی، اور اگر وہ رجوع کرے گا تو خدا ہی کی طرف کرے گا۔

سورہ کی ابتدا میں پھنکارے مارتے اور چنگاریاں جھاڑتے ان دوڑنے والوں کا ذکر ہے جو اتنا تیز دوڑتے ہیں کہ ہانپنے لگتے ہیں اور اپنے مالک کے حکم کی تعمیل میں اپنی قوت کا آخری قطرہ تک نچوڑ دیتے ہیں، اور ہر قسم کی محنت و مشقت برداشت کرتے ہیں۔ یہاں انسان کو بھی سبقت لے جانے کی دعوت دی گئی ہے، مگر کس طرف:

فَفِرُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ (الذّٰریٰت:۵۰)

"پس دوڑو اللہ کی طرف۔"

وَ سَارِعُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ (آل عمران:۱۳۳)

"دوڑ کر چلو اس راہ پر، جو تمھارے رب کی بخشش اور اس جنت کی طرف جاتی ہے، جس کی وسعت زمین اور آسمانوں جیسی ہے۔"

دراصل یہ وہ راستہ ہے، جو آدمی بھی اسے اختیار کرتا ہے، وہ اپنا سب کچھ اس راہ میں لگا

دیتا ہے۔ جس طرح گھوڑے اپنے مالک کی اطاعت میں بھاگتے ہیں، دوڑتے ہیں، انگاروں میں سے گزرتے ہیں، دھاوا بولتے ہیں، گردوغبار کے طوفان کے باوجود ہر جگہ گھس جاتے ہیں اور فتح حاصل کرتے ہیں، اسی طرح انسان بھی اللہ کی طرف دوڑتا ہے، جنت کے لیے سعی کرتا ہے، اور اپنے مالک کی رضا و خوش نودی کی خاطر ہر قسم کی محنت و مشقت برداشت کرنے کے لیے تیار رہتا ہے۔ ہر وہ دشمن جو اس کو اس کے رب کی راہ سے ہٹائے، اس کے خلاف بھی حملہ آور ہوتا ہے لیکن یہ اس یقین کے ساتھ حاصل ہوتا ہے کہ قبر سے اٹھنا ہے اور اللہ کے سامنے کھڑا ہونا ہے، اور اس دن پھر صرف اعمال ہی سامنے نہیں آئیں گے، بلکہ دلوں میں چھپی ہوئی نیتیں بھی سامنے آجائیں گی۔

دلوں کے اندر جو کچھ چھپا ہوتا ہے وہ تو صرف وہی جان سکتا ہے کہ جو عَلِیْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ہو۔ کوئی انسان نہیں جانتا کہ کسی کے دل میں کیا نیت ہے، کیا ارادے ہیں اور کیا اغراض و مقاصد ہیں، جن کے پیش نظر وہ مختلف اعمال انجام دیتا ہے۔ اعمال کی ظاہری شکل و صورت لوگوں کے سامنے ہوتی ہے، اور فرشتے بھی اعمال ہی درج کرتے ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ عَلِیْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ اور عَالِمُ الْغَیْبِ وَالشَّھَادَۃِ ہے۔ وہ دلوں کا حال اور نیتوں تک کو جانتا ہے۔ لہٰذا اصل چیز تو نیت اور ارادہ ہے۔

اگر سورۂ زلزال میں یہ تعلیم دی گئی تھی کہ جس نے ذرّہ برابر بدی کی ہوگی وہ اس کو دیکھ لے گا، تو یہاں یہ تعلیم دی جارہی ہے کہ سینوں میں جو کچھ چھپا ہوا ہے اسے برآمد کر کے اس کی جانچ پڑتال کی جائے گی۔ اس لیے عمل کی میزان آدمی کے دل کے اندر لگی رہنی چاہیے کہ کوئی برا کام ہوگیا تو آدمی کا ضمیر مضطرب اور بے چین ہوجائے، اور کوئی نیکی کا کام ہو تو دل خوش ہوجائے۔ نیکی اور بدی کی یہ تعریف حدیث میں بھی بیان کی گئی ہے کہ جس بات سے دل کھٹکے وہ برائی ہے، اور جس سے دل مطمئن ہو وہ نیکی ہے۔ یہ وہی دل ہوسکتا ہے کہ جس کے اندر یہ میزان آویزاں ہو کہ ذرّہ برابر برائی بھی اللہ کے سامنے آئے گی اور ذرہ برابر نیکی بھی اللہ کے سامنے آجائے گی۔ اسی دل میں برائی سے کھٹک پیدا ہوتی ہے اور نیکی سے خوشی و اطمینان۔ لیکن عمل سے آگے بڑھ کر نیتوں پر بھی آدمی کا اپنا ضبط اور قابو ہونا چاہیے اور نیت اور جو کچھ دلوں میں ہو صرف اللہ کے لیے ہو۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ صرف عمل اللہ کے لیے ہو، یہ تو سب سے بنیادی چیز ہے، بلکہ یہ بھی پیش نظر رہے کہ روزِ محشر آدمی دوسرے کے بارے میں، جو بری نیت رکھتا ہے یا

اپنے دل میں اگر کوئی برا ارادہ چھپائے رہتا ہے، وہ بھی کھل کر سامنے آجائے گا، اور جس نیت سے وہ کام کرتا ہے وہ بھی سامنے آجائے گی۔

یہاں تین باتیں سامنے آئی ہیں۔ ایک یہ کہ ایک طرف تیز دوڑتے ہوئے گھوڑے ہیں اور ان کی تصویر کھینچی گئی ہے، تاہم گھوڑوں کا نام قرآن نے نہیں لیا۔ اسی لیے لوگوں نے اس سے اونٹ سے مراد لیا ہے، اور اس سے کسی زمانے کی کوئی چیز بھی مراد لی جاسکتی ہے۔ اگر جنگ و جدل، بدامنی، لوٹ مار، قتل و غارت گری کا اور زبردستوں کی طرف سے کمزور لوگوں پر زیادتی کا یہ پورا منظر ہو تو اس میں گھوڑے بھی استعمال ہو سکتے ہیں، ہجیرو بھی ہو سکتی ہے، ہوائی جہاز، ٹینک اور میزائل بھی استعمال ہو سکتے ہیں اور دنیا کے اندر سب استعمال ہو رہے ہیں۔ دوسری طرف انسان کی طبیعت، فطرت اور اس کی کمزوریاں ہیں۔ جب وہ آخرت اور اللہ کے حضور جواب دہی کے احساس سے عاری ہو جاتا ہے، تو پھر وہ خود غرض بن جاتا ہے اور مال کی محبت میں بری طرح مبتلا ہو جاتا ہے۔ اسی کی خاطر ظلم و ستم ڈھاتا ہے، سرکشی پر آمادہ ہوتا ہے اور دینے کی بجائے سب کچھ جمع کر لینے اور جو کچھ مل رہا ہے، اس کو جائز ذرائع سے حاصل کر کے اس پر قانع رہنے کے بجائے زیادہ سے زیادہ حاصل کرنے کی فکر میں، اللہ کی نافرمانی اور ناشکری کا مرتکب ہوتا ہے۔ تیسری بات یہ ہے کہ اس کا علاج آخرت کی جواب دہی اور اس کی فکر میں ہے، جہاں نہ صرف ذرّہ برابر نیکی اور بدی دیکھی جائے گی بلکہ دلوں کا حال اور نیتیں تک کھول کر رکھ دی جائیں گی۔

یہ سارا معاملہ بالآخر رب کے حضور حاضری پر جا کر ختم ہوگا، اور وہ ایسی ہستی ہے، جو اِن سے اور اس دن سے پوری طرح باخبر ہے۔ اسی لیے فرمایا:

اِنَّ رَبَّهُمْ بِهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّخَبِيْرٌ ۝ (العٰدیٰت:۱۱)

”یقیناً ان کا رب اس روز ان سے خوب باخبر ہوگا۔“

کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ آج باخبر نہیں ہے؟ ظاہر ہے کہ یہ مطلب نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ تو ہر وقت باخبر ہے۔ اس کے لیے آج اور کل کوئی معنی نہیں رکھتے۔ یہ آج اور کل تو ہمارے زمانے کا تجربہ ہے کہ رات اور دن ہے، کل ماضی ہے، آج حال گزر رہا ہے اور آنے والا کل مستقبل ہوگا۔ اللہ کے لیے تو اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ وہ اس سے بے نیاز ہے:

هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ ۚ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝
(الحدید:۳)

”وہی اول بھی ہے اور آخر بھی اور ظاہر بھی ہے اور مخفی بھی اور وہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔“

مطلب یہ ہے کہ اس دن سے اُس کے باخبر ہونے کا یہ عالم ہے کہ اس نے ہر چیز کا ریکارڈ بھی رکھا ہے اور وہ ہر چیز سے باخبر بھی ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ یہ بات ایک کھلی حقیقت کی طرح آشکار ہو کر سامنے آ جائے، اس سے پہلے کہ اللہ خود سامنے آئے۔ آج ہی آدمی یقین رکھے کہ میں جو کچھ کر رہا ہوں اس سے اللہ تعالیٰ باخبر ہے اور جو کچھ بھی دل کے اندر ہے اسے معلوم ہے۔ جس نیت اور ارادے سے میں کام کر رہا ہوں، جو اغراض دل کے اندر چھپی ہوئی ہیں، ان سب سے بھی وہ باخبر ہے۔ اگر میں مٹی میں بھی مل جاؤں گا تو وہ میرے ذرّے ذرّے کو جمع کر کے کھڑا کر دے گا اور دلوں کے اندر جو چیزیں چھپی ہوئی ہوں گی وہ بھی ظاہر ہو کر رہیں گی۔ یہی وہ احساس ہے، جس سے آدمی اللہ کا شکر ادا کرنے کے قابل بن سکتا ہے، اور اس کے اندر یہ اہلیت، قوت اور استعداد پیدا ہو سکتی ہے کہ وہ اللہ کے دیے ہوئے وسائل، قوتوں، صلاحیتوں اور مال و دولت کو اس کی مرضی کے مطابق استعمال کرے۔

یہاں یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ پچھلا بیان مربوط طریقے سے چل رہا ہے۔ میں بار بار اس لیے اس کی طرف اشارہ کر رہا ہوں کہ آپ یہ نہ سمجھیں کہ یہ سورہ اچانک بیچ میں آ گئی بلکہ سورۂ زلزال سے بات آگے بڑھی ہے۔ وہاں اعمال کا ذکر تھا، یہاں دلوں میں چھپی ہوئی باتوں کا ذکر ہے۔ وہاں برائی اور بھلائی کا ذکر تھا، جس سے اللہ کی خشیت پیدا ہوتی ہے اور اس خشیت پر اس نے اپنی رضا اور جنت کا حصول رکھا ہے، اور یہاں بدعملی اور گمراہی کی جڑ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، یعنی اللہ کی ناشکری اور مال کی ایسی اندھی محبت، جو دل کے اندر گھر کر جائے، اور آدمی اسی کا ہو کر رہ جائے اور اس میں بری طرح پھنس کر رہ جائے۔

اب ان سارے اعمال کو جمع کر کے، جس میں اعمال بھی ہیں اور نیتیں بھی، آدمی کی قسمت کا فیصلہ کس طرح ہو سکتا ہے؟ یہ وہ سوال ہے، جس کا جواب آنے والی سورہ، سورۂ قارعہ میں دیا جا رہا ہے کہ کس طرح اعمال تولے جائیں گے اور ان اعمال کے نتیجے میں کس کا کیا ٹھکانہ ہوگا، اس کا فیصلہ کیا جائے گا۔

٭٭٭

سورۃ القارعۃ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝
اَلْقَارِعَةُ ۝۱ مَا الْقَارِعَةُ ۝۲ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْقَارِعَةُ ۝۳
يَوْمَ يَكُوْنُ النَّاسُ كَالْفَرَاشِ الْمَبْثُوْثِ ۝۴ وَتَكُوْنُ الْجِبَالُ
كَالْعِهْنِ الْمَنْفُوْشِ ۝۵ فَاَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ ۝۶ فَهُوَ
فِيْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ ۝۷ وَاَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ ۝۸ فَاُمُّهٗ
هَاوِيَةٌ ۝۹ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا هِيَهْ ۝۱۰ نَارٌ حَامِيَةٌ ۝۱۱

اللہ کے نام سے، جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔

عظیم حادثہ! کیا ہے وہ عظیم حادثہ؟ تم کیا جانو کہ وہ عظیم حادثہ کیا ہے؟ وہ دن جب لوگ بکھرے ہوئے پروانوں کی طرح اور پہاڑ رنگ برنگ کے دھنکے ہوئے اُون کی طرح ہوں گے، پھر جس کے پلڑے بھاری ہوں گے وہ دل پسند عیش میں ہوگا، اور جس کے پلڑے ہلکے ہوں گے اس کی جائے قرار گہری کھائی ہوگی۔ اور تمھیں کیا خبر کہ وہ کیا چیز ہے؟ بھڑکتی ہوئی آگ۔

تشریح: سورہ قارعہ ۱۱ آیات پر مبنی ہے۔ یہ بھی آخرت کے احوال اور حقیقت کے بارے میں ہے۔ سورۂ زلزال سے آخرت کا تذکرہ چل رہا ہے۔ یہ سورہ بھی اسی کا تسلسل ہے۔

اَلْقَارِعَةُ ۝ مَا الْقَارِعَةُ ۝ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْقَارِعَةُ ۝ (القارعۃ: ۱-۳)

''عظیم حادثہ! کیا ہے وہ عظیم حادثہ؟ تم کیا جانو کہ وہ عظیم حادثہ کیا ہے؟''

لفظ اَلْقَارِعَةُ سے سورہ کا آغاز ہو رہا ہے۔ عربی زبان میں لفظ قرع کے معنی کسی چیز کو کسی

چیز پر زور سے مارنے کے ہیں، جس سے سخت آواز نکلے۔ اسے کھڑکھڑاہٹ کے معنوں میں بھی بولتے ہیں، جیسے اگر دروازے کو زور سے دھکا دیں یا اس کو کھٹ کھٹائیں۔ پھر یہ لفظ ان معنوں میں بولا جانے لگا کہ جیسے کوئی عظیم حادثہ پیش آ گیا ہو، یا کوئی بہت بڑی آفت ہو، جو لوگوں کو کھڑکھڑا ڈالے۔ وہی لفظ یہاں پر اللہ تعالیٰ نے قیامت کے لیے استعمال فرمایا ہے۔

اس لفظ کے اندر قیامت کی حقیقت اور اس کا بیان بڑی حد تک آ گیا ہے، اور آغاز صرف ایک لفظ سے ہوتا ہے: القارعة کھڑکھڑانے والی، کھٹ کھٹانے والی، ایک عظیم حادثہ یا ایک ہولناک آفت۔ بس اتنا کہہ کر بات ختم ہو جاتی ہے، اور ایک لفظ پر آیت بھی ختم ہو جاتی ہے۔ گویا قیامت کے بارے میں ایک لفظ بول کے اور ہول ناک آفت کا ذکر کر کے خاموشی اختیار کر لی گئی ہے اور سننے والے کے اندر ایک تجسس، اضطراب اور بے چینی پیدا ہو جاتی ہے کہ نامعلوم کیا ہونے والا ہے۔ یہ ایسے ہی جیسے اچانک کوئی زوردار الارم بجنے لگے اور آدمی ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھے کہ اچانک یہ آواز کہاں سے آنے لگی ہے اور کیوں آ رہی ہے؟ یا جیسے کوئی اچانک بم پھینک دے، جس سے ایک زوردار دھماکا ہو، آگ لگ جائے اور بڑے پیمانے پر تباہی ہو۔ اس طرح بغیر کوئی سوال کیے یا بغیر کوئی تمہید باندھے ایک دم لفظ بول دیا گیا: القارعة کھڑکھڑانے والی اور کھٹ کھٹانے والی چیز یا کوئی عظیم حادثہ ہے۔ اور پھر سوال ہوتا ہے: مَا الْقَارِعَةُ یعنی وہ کھڑکھڑانے والی یا کھٹ کھٹانے والی، وہ عظیم حادثہ اور ہولناک آفت کیا ہے؟ یہ سوال دراصل متوجہ کرنے کے لیے ہے۔ یہ قرآن مجید کی جامعیت کی بھی ایک مثال ہے کہ اتنا عظیم لفظ بولا گیا ہے جس کے اندر خوف بھی ہے اور ہیبت بھی، ہولناک آواز بھی ہے اور دہشت بھی، اور ایک المناک حادثے کی اطلاع بھی ہے۔ گویا ایک ہی لفظ میں پورے منظر کی تصویر کشی کر کے رکھ دی گئی ہے۔

اس طرح سوال کی صورت میں سننے والی کی توجہ اسی بات پر مرکوز کر دی جاتی ہے کہ یہ الْقَارِعَةُ یعنی کھڑکھڑانے والی چیز کیا ہے؟ پھر اس سوال کا جواب دینے کی بجائے ایک اور سوال کر دیا جاتا ہے وَمَا اَدْرٰکَ مَا الْقَارِعَةُ (القارعۃ: ۳) ”تم کیا جانو کہ وہ عظیم حادثہ کیا ہے؟“ اور یہ اندازِ بیان بھی اس لیے ہے کہ سننے والے کی پوری توجہ اسی واقعے کے اوپر مرکوز ہو جائے، جس کا اس سورہ میں تذکرہ کیا گیا ہے تاکہ اس واقعہ کی عظمت اور ہیبت پوری طرح اجاگر ہو جائے۔

یہ اندازِ بیان پہلے بھی کئی سورتوں میں آچکا ہے۔ اس کا لفظی ترجمہ تو یہ ہوگا کہ کیا چیز ہے؟ جو آپ کو یہ سمجھائے کہ قارعة کیا ہے؟ لیکن وَمَآ اَدۡرٰکَ کے معانی اردو میں یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ تم کچھ جانتے بھی ہو یا تمھیں کچھ خبر بھی ہے کہ اَلۡقَارِعَۃُ کیا چیز ہے؟

یہ ایسا ہی انداز ہے، جس طرح دروازے پر زور سے دستک ہو یا کوئی دروازے کو زور سے کھٹ کھٹائے تو آدمی کی توجہ فوراً دروازے کی طرف ہو جاتی ہے۔ یا گھر میں گھنٹی بجتی ہے تو آدمی فوراً دروازے کی طرف لپکتا ہے کہ کون آیا ہے۔ گھنٹی اچانک بجتی ہے، یہ نہیں ہوتا کہ کوئی متوقع ہو اِلاّ یہ کہ آدمی نے کسی کو وقت دیا ہو۔ اچانک گھنٹی بجنے پر آدمی خود یا ملازم گھبراہٹ کے عالم میں دوڑ کر دروازے پر جاتا ہے تو اس دوران بہت سے خیالات اور وسوسے ذہن میں آتے ہیں کہ نہ جانے کون دروازے پر آ گیا ہو، معلوم نہیں کیا مسئلہ ہے، خدا کرے خیر ہو، کوئی آفت یا مصیبت نہ ہو، کوئی دوست ہے یا کوئی ڈاکا ڈالنے آیا ہے۔ آدمی نہیں جانتا کہ اس کے اندر کیا حقیقت ہے؟

دراصل ان تین آیتوں میں ایک ایک کر کے الفاظ بڑھائے جا رہے ہیں، اندازِ بیان بدلا جا رہا ہے اور ایک سماں باندھا جا رہا ہے تاکہ لوگ پوری طرح یکسو ہو جائیں اور یہ جاننے کی کوشش کریں کہ نہ جانے کیا پیش آنے والا ہے! پہلے صرف ایک لفظ بولا گیا، اَلۡقَارِعَة پھر سوال کیا گیا کہ القارعة کیا چیز ہے، جس کے لیے یہ لفظ بولا گیا ہے، جس میں کھڑکھڑاہٹ بھی ہے، دل دہلا دینے والا خوف بھی اور اچانک آنے کا ذکر بھی۔ یہ ایک ایسی چیز ہے جو اچانک آئے گی نا جانے کب آدھمکے اور دروازہ کھڑکھڑانا شروع کر دے، اور کہے کہ چلو، اب چلنے کا وقت ہو گیا ہے۔ نکلو، اب نکلنے کا وقت ہو گیا ہے۔ عربی زبان میں اَلۡقَارِعَة کسی آفت اور حادثے کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ یہ صرف آواز ہی نہیں ہے بلکہ ہل چل مچا دینے والی آواز ہے اور اس عظیم حادثے کے بعد جیسی ہل چل مچے گی، اس کی تفصیل آیندہ آیتوں میں آ رہی ہے اور پہلے بھی آ چکی ہے۔ قرآن مجید میں جگہ جگہ اس کی تصویر کھینچی گئی ہے۔

القارعة کے لفظ کے اندر جہاں یہ بات آئی ہے کہ کتنا بڑا اور ہولناک حادثہ ہے جو رونما ہونے والا ہے، وہاں اس میں ایک سبق بھی پوشیدہ ہے کہ ہر وقت اس کا کھٹکا لگا رہنا چاہیے۔ اگر کوئی مصیبت آ کر دروازہ کھٹ کھٹانے والی ہو تو آدمی کی نیند اڑ جائے گی۔ اگر کسی کو یہ معلوم

ہو جائے کہ ڈاکا ڈالنے کے لیے باہر کوئی پستول لیے کھڑا ہے تو پسینے چھوٹ جائیں گے اور دل لرزنے لگے گا، اور اگر وہ گھر کے اندر داخل ہو جائے تو پھر تو کچھ اور ہی کیفیت ہو گی۔ لہٰذا اتنی بڑی مصیبت کے لیے اور اس ہولناک آواز کے لیے جو انسان اور ساری کائنات کو کھڑکھڑا ڈالے گی اور بری طرح ہلا مارے گی اس کے لیے تو ہر وقت دل میں کھٹکا لگا رہنا چاہیے، ہر وقت تیار رہنا چاہیے اور اس سے بے پروا ہو کر غفلت کے اندر مبتلا نہ ہونا چاہیے۔

وَمَآ اَدْرٰکَ مَا الْقَارِعَۃُ میں جہاں ایک طرف نبی کریمؐ سے خطاب ہے وہاں شاید آپ ﷺ کو یہ بتانا بھی مقصود ہے کہ یہ واقعہ اتنا بڑا واقعہ ہے کہ آپ ﷺ کے لیے اس کی حقیقت کو چھپانا مشکل ہے۔ جیسا کہ بعض مفسرین نے اس طرف اشارہ بھی کیا ہے۔ یہاں دراصل انتظار کرنے والوں کی لاپروائی اور اس کی تیاری کی طرف سے غفلت برتنے کی طرف بھی اشارہ ہے۔

آگے چل کر القارعۃ کی حقیقت تو بیان نہیں کی گئی بلکہ القارعۃ کے جو اثرات کائنات اور انسان پر پڑنے والے ہیں، ان کا بیان ہے اور اُن اثرات سے ہی انسان سمجھ سکتا ہے کہ فی الواقع وہ کتنا ہیبت ناک اور ہول ناک واقعہ ہو گا کہ جس کو قرآن مجید نے اَلْقَارِعَۃُ کے لفظ سے پکارا ہے۔ یہ ایک ایسا واقعہ ہو گا کہ جس میں انسان اور ساری کائنات بری طرح متاثر ہو گی، جیسا کہ ہم سورۂ زلزال سے دیکھ رہے ہیں کہ انسان بھی پریشان ہے اور کائنات بھی لرز رہی ہے۔ دیگر مقامات پر بھی یہ منظر بیان کیا گیا ہے کہ آسمان پھٹ رہے ہیں، ستارے جھڑ رہے ہیں اور سورج بھی بے نور ہو رہا ہے، اس پر اندھیرا چھا رہا ہے اور ہر چیز اپنی جگہ پر ہلچل اور تباہی کے اندر مبتلا ہے۔ یہاں پر بھی دو چیزوں کے بارے میں اشارہ کیا گیا ہے۔ سورۂ زلزال میں زمین کے ہلائے جانے، زلزلے کے آنے اور بار بار ہلائے جانے کی طرف اشارہ تھا، اور یہ ہولناک زلزلہ زمین کے کسی ایک حصے میں نہیں بلکہ پوری زمین پر برپا ہو گا اور پوری کی پوری زمین اس وجہ سے بری طرح جھنجھوڑ کر رکھ دی جائے گی اور لرز کر رہ جائے گی۔ یہ اتنا زبردست زلزلہ ہو گا کہ پوری کی پوری زمین دہل کر رہ جائے گی۔ قرآن نے اس کی طرف ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے:

یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّکُمْ ۚ اِنَّ زَلْزَلَۃَ السَّاعَۃِ شَیْءٌ عَظِیْمٌ ○ (الحج ۲۲:۱)

''لوگو، اپنے رب کے غضب سے بچو، حقیقت یہ ہے کہ قیامت کا زلزلہ بڑی (ہولناک) چیز ہے۔''

اور انسان کو بھی اس کا سامنا ہوگا۔ یہاں فرمایا:

يَوْمَ يَكُوْنُ النَّاسُ كَالْفَرَاشِ الْمَبْثُوْثِ○ وَ تَكُوْنُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ الْمَنْفُوْشِ○ (القارعة:۴،۵)

''وہ دن جب لوگ بکھرے ہوئے پروانوں کی طرح اور پہاڑ رنگ برنگ کے دھنکے ہوئے اون کی طرح ہوں گے۔''

فَرَاشٌ سے مراد وہ پتنگے ہیں جو پروانوں کی طرح چراغ کے گرد جمع ہو جاتے ہیں۔ برسات میں نکل آتے ہیں اور اڑنا شروع کر دیتے ہیں۔ پروانوں کا ہجوم ہوتا ہے، بکھرے ہوئے الگ الگ، ہر ایک اپنی فکر میں مست ہوتا ہے۔ قرآن نے یہاں پر كَالْفَرَاشِ الْمَبْثُوْثِ (بکھرے ہوئے پتنگے) کہا اور ایک جگہ اس کو جَرَادٌ مُّنْتَشِرٌ (القمر:۷) (بکھری ہوئی ٹڈیاں) کہا ہے۔ اس میں کئی چیزوں کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے۔

اس کا ایک پہلو کثرت سے متعلق ہے۔ جب وہ عظیم حادثہ پیش آ جائے گا تو جس طرح پتنگوں اور پروانوں کا شمع کے گرد ہجوم ہوتا ہے۔ اسی طرح پوری زمین بکثرت انسانوں کے ساتھ اٹی پڑی ہوگی۔ اول و آخر سارے انسان جمع ہو جائیں گے، ان میں سے ایک بھی پیچھے نہ رہ پائے گا، سب کے سب نکل آئیں گے اور اللہ کے سامنے کھڑے ہوں گے۔ اسی طرح الگ الگ ہوں گے جس طرح سورۂ زلزال میں کہا گیا ہے کہ لوگ منتشر ہوں گے اور الگ الگ آئیں گے۔ کسی کو کسی دوسرے کی فکر یا پروانہ ہوگی۔ قرآن مجید نے یوم آخرت کا یہ پہلو ہر جگہ واضح فرمایا ہے اور بڑے اہتمام اور تاکید کے ساتھ واضح فرمایا ہے اور یہاں بھی اسی طرف اشارا ہے۔

جس طرح پروانے ایک دوسرے سے لاتعلق، بے نیاز اور بے پروا ہوتے ہیں اور دیوانہ وار شمع کی طرف لپکتے ہیں، بالکل اسی طرح قیامت کے روز انسانوں کا معاملہ ہوگا۔ کسی کو کسی کی کوئی پروانہ ہوگی، خوف و ہراس کے عالم میں ہر ایک کو صرف اپنی ہی نجات کی فکر ہوگی۔ اس روز کوئی اپنے جگری دوست تک کو نہ پوچھے گا حالاں کہ وہ ایک دوسرے کو دکھائے جائیں گے۔ مجرم چاہے گا کہ اس دن کے عذاب سے بچنے کے لیے اپنی اولاد، اپنی بیوی، اپنے بھائی بند، اپنے قریب ترین رشتے دار کو جو اسے پناہ دینے والا تھا، اور روئے زمین کے سب لوگوں کو فدیے میں دے دے اور یہ تدبیر اسے نجات دلا دے۔ (المعارج:۱۰-۱۴) گویا وہ جو بڑے گہرے دوست ہوا

کرتے تھے، صحبتوں میں بیٹھتے تھے، مجلسیں جماتے تھے، وہ بھی ایک دوسرے کے دشمن بن جائیں گے، اور آدمی اس روز یہ چاہے گا کہ اس کے بدلے اس کے باپ کو آگ میں ڈال دیا جائے، اس کی ماں اور بیوی کو آگ میں جھونک دیا جائے۔ اس کی اولاد کو پکڑ لیا جائے، بس کسی طرح اس کی جان بچ جائے:

اَلْاَخِلَّآءُ یَوْمَئِذٍۭ بَعْضُھُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ اِلَّا الْمُتَّقِیْنَ ۝ (الزخرف: ٦٧)

''وہ دن جب آئے گا تو متقین کو چھوڑ کر باقی سب دوست ایک دوسرے کے دشمن ہو جائیں گے۔''

اس دن سوائے عمل کے کوئی چیز کام نہیں آئے گی۔ جو چیزیں انسان کی نجات کے لیے ضروری ہوں گی جیسا کہ اللہ کی رحمت ناگزیر ہے، اس کی مغفرت ضروری ہے، اللہ کی اجازت سے نیک بندوں کی شفاعت اس کو نصیب ہو سکتی ہے، یہ سب بھی اس کے اعمال کی وجہ سے ممکن ہوگا۔ اعمال کی وجہ ہی سے وہ اس بات کا مستحق ٹھیرے گا کہ اس کے اوپر رحمت کی جائے، اس کے گناہوں کو بخش دیا جائے اور نیک بندوں سے سفارش کروا کے اور ان کا اعزاز بڑھا کے اس کو معاف کر دیا جائے۔

بکھرے ہوئے پروانوں اور پتنگوں سے یہ تصویر بھی نگاہوں کے سامنے آ جاتی ہے کہ جس طرح پتنگے بکھرے بکھرے اور تنہا تنہا اڑتے پھرتے ہیں، اسی طرح انسان بھی اس روز تنہا تنہا، الگ الگ پھر رہے ہوں گے۔ جس دن انسان کے لیے اس کے سب سہارے ختم ہو جائیں گے اور کوئی چیز اس کے کام آنے والی نہیں ہوگی اور وہ اکیلا اپنے اعمال کے ساتھ اپنے اللہ کے سامنے کھڑا ہوگا۔ پھر انسان کی ضعف، بے بسی اور ذلت کا پہلو بھی سامنے آئے گا۔

قرآن مجید نے اس طرف بار بار اشارہ فرمایا ہے کہ یہ کائنات طبعی قوانین پر قائم ہے۔ زمین و آسمان، سورج، چاند اور اربوں کی تعداد میں ستارے، سب اسی قانون پر قائم ہیں۔ انسان اگر زمین پر باوقار طریقے سے چلتا پھرتا ہے تو یہ اس لیے ممکن ہے کہ اس کی عقل سلامت ہے اور زمین میں کشش ثقل کی قوت موجود ہے۔ اگر آدمی کی عقل سلامت نہ رہے تو پھر وہ لڑکھڑاتا ہوا چلتا ہے، جیسے کوئی نشئی ہو۔ کبھی وہ ادھر گرتا ہے اور کبھی ادھر، کبھی اس کے پاؤں الٹے پڑتے ہیں اور کبھی سیدھے۔ جب خوف و دہشت کا عالم ہو تو کیا کیفیت ہوتی ہے؟ اگر کہیں کسی مجمع کے اندر

خوف و ہراس پھیل جائے تو کیسی بھگدڑ مچ جاتی ہے؟ لوگ کیسے ادھر ادھر بھاگتے پھرتے ہیں۔ کسی کو کچھ پتا نہیں ہوتا کہ کدھر جارہا ہے۔ اسی طرح اگر گولی چل جائے، آگ لگ جائے یا کوئی اور آفت آجائے تو کس طرح مجمع کے اندر بھگدڑ مچ جاتی ہے۔ جب آدمی پر خوف طاری ہوجائے تو اس کے حواس جواب دے جاتے ہیں اور اس کا اپنے اوپر بالکل کنٹرول نہیں رہتا۔ یہی پروانوں کی مثال ہے۔ جب وہ بدحواس ہوتے ہیں تو اسی آگ کے اندر گرنے لگتے ہیں جو کہ ان کو جلانے والی ہے، جس کے بارے میں وہ جانتے ہیں کہ اگر گریں گے تو جل جائیں گے لیکن اس بدحواسی کے عالم میں اسی آگ کے اندر گرتے چلے جاتے ہیں۔ وہ مدہوش ہوتے ہیں، بے قابو ہوتے ہیں، ان کے سفر کی کوئی سمت نہیں ہوتی، نہیں جانتے کہ کدھر جانا ہے، جس نے جدھر منہ اٹھایا اُدھر چل دیا۔ اس روز یہی حال انسانوں کا ہوگا کہ جب سارے کے سارے انسان ایک آواز پر گروہ در گروہ نکل کھڑے ہوں گے:

يَوْمَ تَشَقَّقُ الْاَرْضُ عَنْهُمْ سِرَاعًا ط (قٓ:۴۴)

''جب زمین پھٹے گی اور لوگ اس کے اندر سے نکل کر تیز تیز بھاگے جارہے ہوں گے۔''

وَ تَرَى النَّاسَ سُكٰرٰى وَ مَا هُمْ بِسُكٰرٰى (الحج:۲)

''اور لوگ تم کو مدہوش نظر آئیں گے، حالاں کہ وہ نشے میں نہ ہوں گے۔''

جس طرح مدہوشی اور نشے کے عالم میں کسی کو کچھ خبر نہیں ہوتی اور انسان لڑکھڑاتے ہوئے چلتا ہے، اس وقت بھی کچھ ایسا ہی منظر ہوگا۔ لوگ ایسے نظر آئیں گے جیسے نشے کے عالم میں ہوں حالاں کہ وہ نشے کے عالم میں نہیں ہوں گے بلکہ اللہ کا عذاب اتنا شدید ہوگا کہ اس کے ڈر اور خوف سے ان کی یہ حالت ہوجائے گی۔

یہ عظیم حادثہ پیش آجانے پر عالم یہ ہوگا جیسے ہر شخص پر نفسا نفسی کی کیفیت طاری ہو۔ کوئی کسی کا پرسانِ حال نہیں ہوگا اور کوئی کسی کا سہارا نہیں ہوگا۔ یہ حادثہ صرف انسان کو ہی درپیش نہ ہوگا بلکہ زمین و آسمان اور ستارے سب اس سے دوچار ہوں گے۔ اس وقت پہاڑوں کی کیا صورت حال ہوگی، اس کی تصویر یوں کھینچی گئی ہے:

وَ تَكُوْنُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ الْمَنْفُوْشِ ۝ؕ (القارعة:۵)

''اور پہاڑ رنگ برنگ کے دھنکے ہوئے اون کی طرح ہوں گے۔''

مَنفُوش کہتے ہیں دھنکی ہوئی اون یا روئی کو۔ دھنکی ہوئی روئی میں ہر ریشہ الگ الگ ہو جاتا ہے۔ بالکل اسی طرح پہاڑ بھی ریزہ ریزہ ہو کر جدا جدا ہو جائیں گے اور ان کا کوئی وجود باقی نہ رہے گا۔

کَالْعِھْنِ کے معنی بعض لوگوں نے اون کے لیے ہیں اور بعض نے رنگین اون کے بھی لیے ہیں۔ یہ لفظ عربی زبان میں دونوں معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ اگر رنگین اون معنی لیے جائیں تو اس کا مفہوم یہ ہوسکتا ہے کہ کالے، سفید، سلیٹی، پیلے، سنگ مرمر، سنگ سرخ، مختلف رنگوں کے پہاڑ جب ریزہ ریزہ ہوں گے تو ان کی کیفیت رنگین اون کی مانند ہو جائے گی۔ اصل بات جو کہی جارہی ہے، جس کو ذہن میں رکھنا بہت ضروری ہے وہ یہ ہے کہ اس دن کی ہولناکی کا یہ عالم ہوگا کہ انسانوں کی نگاہوں کے سامنے جو چیزیں جمی ہوئی اور بڑی دیو ہیکل ہیں، ان میں پہاڑ نمایاں ہیں اور جس کی طرف قرآن مجید نے بار بار اشارہ کیا ہے کہ ہم نے پہاڑوں کو زمین پر کیلوں کی طرح ٹھونک دیا اور انھی پہاڑوں کی وجہ سے زمین کو قرار نصیب ہوا ہے، اس عظیم حادثے کے نتیجے میں وہ بھی ریزہ ریزہ ہو جائیں گے۔

قرآن کا یہ کہنا کہ اللہ نے پہاڑوں کو زمین پر کیلوں کی طرح ٹھونک دیا ہے، جس سے زمین کو قرار نصیب ہوا اور ان کے بوجھ سے وہ ساکن ہوگئی، یقیناً ایک عام بدو کے لیے بھی قابلِ فہم تھا لیکن آج سائنس نے اس بات کو ایک سائنسی حقیقت کے طور پر ثابت کردیا ہے۔ جدید تحقیق کے مطابق ایک زمانہ ایسا تھا کہ زمین زلزلوں کی وجہ سے لرزتی رہتی تھی۔ پھر ایک عظیم الشان زلزلہ آیا، اس کے بعد دنیا کے جتنے پہاڑی سلسلے ہیں، ہمالیہ، جودی پہاڑ وغیرہ سب اسی کے نتیجے میں وجود میں آئے۔ پہلے یہاں پر سب سمندر تھے۔ اب بھی کوہ ہمالیہ کی چوٹیوں پر ان کے نشانات ملتے ہیں، جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ سمندر کی تہہ سے اٹھا کر یہ پہاڑ بنائے گئے، اور اس کے بعد پھر زمین کو سکون نصیب ہوا اور اس کو قرار آیا۔ اب بھی جو زلزلے آتے ہیں، انھی پہاڑوں کے جو شگاف رہ گئے ہیں، ان کے ہلنے کی وجہ سے آتے ہیں۔

یہاں اس سوال کا بھی جواب دیا گیا ہے کہ حضورؐ جب قیامت کی خبر دیتے تھے تو لوگوں کو یقین نہ آتا تھا اور وہ حیرت سے پوچھتے تھے کہ کیا پہاڑوں جیسی مضبوط اور دیو ہیکل چیزیں جو آسمانوں سے باتیں کرتی ہیں وہ بھی تباہ ہوسکتی ہیں اور ان کا کیا بنے گا؟ اس کے جواب میں یہ کہا

گیا کہ اے نبیؐ، آپ کہیے کہ ان کو میرا رب ریزہ ریزہ کر کے دھواں بنا کے اڑا دے گا۔ ایک اور جگہ فرمایا ہے کہ تم سمجھتے ہو کہ یہ اپنی جگہ پر ساکن ہیں لیکن ایک وقت ایسا آئے گا جس طرح بادل چلتے ہیں اس طرح یہ پہاڑ بھی چلنا شروع کر دیں گے۔ گویا اس عظیم حادثے کے نتیجے میں انسان ہی بکھرے ہوئے پتنگوں کی طرح نہ ہوں گے بلکہ دیو ہیکل پہاڑوں کا بھی یہ حال ہوگا کہ وہ دھنکی ہوئی اون کی طرح، جس کے ریشے الگ الگ ہو جاتے ہیں، ریزہ ریزہ ہو کر بکھر جائیں گے۔

اس روز طبعی قوانین بھی ایک ایک کر کے جواب دے دیں گے۔ انسان کے طبعی قانون کا تقاضا تو یہ ہے کہ وہ اپنی عقل کے مطابق صحیح سمت میں قدم اٹھائے، سیدھے راستے پر چلے لیکن اس روز اس کے حواس بھی جواب دے جائیں گے۔ اور وہ مدہوش پتنگوں کی طرح اِدھر اُدھر کرتا پھرے گا، جدھر منہ اٹھائے گا چل پڑے گا۔ اس کے حواس ٹھکانے نہیں رہیں گے۔ یوں معلوم ہوگا کہ جیسے وہ نشے کے عالم میں ہو لیکن وہ نشے میں نہیں ہوگا بلکہ ہولناک حادثے نے اس کی یہ حالت کر دی ہوگی۔ پوری کائنات، آسمان، زمین، سورج، چاند، تارے، پہاڑ سب طبعی قانون اور ایک ضابطے کے پابند ہیں اور کچھ قوتوں نے انھیں ان کے مداروں پر کس رکھا ہے۔ لیکن اس روز یہ ضابطے اور طبعی قوانین ٹوٹ جائیں گے، بندشیں ڈھیلی پڑ جائیں گی، آسمان پھٹ پڑے گا، زمین لرز اٹھے گی، پہاڑ روئی کے گالوں کی طرح اڑتے پھریں گے، سورج، چاند، تارے سب ماند پڑ جائیں گے، بکھر جائیں گے۔ اس روز کسی چیز کا کوئی وزن نہ رہے گا۔ صرف انسان کے لیے اعمال کا وزن ہوگا۔ نیکی، بدی، چھوٹا بڑا، ہر عمل سامنے آ جائے گا۔ یہاں تک کہ دل میں چھپی ہوئی نیتیں بھی سامنے آ جائیں گی۔ اس سے پہلے کی دو سورتوں میں اس کی تفصیل بیان ہو چکی ہے۔

فَأَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِينُهُ ۝ فَهُوَ فِي عِيشَةٍ رَّاضِيَةٍ ۝ (القارعة: ٦،٧)

''پھر جس کے پلڑے بھاری ہوں گے وہ دل پسند عیش میں ہوگا۔''

مَوَازِيْنَ عربی گرامر کے لحاظ سے دو چیزوں کی جمع ہوتی ہے۔ یہ میزان کی جمع ہو سکتی ہے۔ میزان ترازو کو یا ترازو کے پلڑے کو کہتے ہیں۔ اس روز جس کے ترازو کے پلڑے بھاری ہوں گے، اسی کے لیے خوش خبری ہے، جس کا ذکر اس سورہ میں ہے۔ موازین، موزون کی جمع بھی ہو سکتی ہے، جس کے معنی وزن کی ہوئی چیز کے ہیں۔ اس سے مراد انسانی اعمال ہیں۔ جس کے اعمال بھاری ہوں گے، اس کا انعام وہی ہوگا، جس کا ذکر اس آیت کے بعد کیا جا رہا ہے۔

موازین کا مطلب خواہ ترازو ہو یا اس کے پلڑے یا اعمال، اصل بات یہ ہے کہ اس روز یہ دیکھا جائے گا کہ انسان دنیا سے کیا کما کر لایا ہے اور اس کی کیا کارگزاری ہے۔ کس کے اعمال اور پلڑے بھاری ہیں اور کس کے اعمال اور پلڑے ہلکے ہیں۔ یہ سوال کہ اعمال کیسے ہلکے اور بھاری ہوں گے؟ میزان میں اعمال کیسے تلیں گے؟ میزان کیسے قائم ہوگی؟ یہ سب غیر ضروری بحثیں ہیں جو بہت سے علما اور مفسرین نے اٹھائی ہیں کہ قیامت کے دن کے بارے میں اللہ ہم سے کیا مطالبہ کر رہا ہے، کیا پیغام دے رہا ہے اور اس کی دعوت کیا ہے، ان مباحث کے بغیر بھی بات واضح ہے۔

اللہ کے نزدیک اعمال کی کیا قدر و قیمت ہوگی؟ وہ دو چیزوں پر مبنی ہوگی۔ ایک تو یہ کہ عمل کے پیچھے نیت کیا ہے، اخلاص ہے یا نہیں، ایمان موجود ہے، یا نہیں اور اس کی ظاہری شکل و صورت کیسی ہے؟ اس بنیاد پر اللہ کے ہاں قیمت لگائی جائے گی۔ ظاہری شکل وصورت تو اعمال نامے کے اندر لکھی ہوگی اور ہر آدمی کی نگاہوں کے سامنے آجائے گی اور آدمی اس سے خوب واقف ہوگا۔

بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰی نَفْسِهٖ بَصِیْرَةٌ ۙ (القیٰمۃ:۱۴)

”بلکہ انسان خود ہی اپنے آپ کو خوب جانتا ہے۔“

اِنَّ اللّٰهَ عَلِیْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ○ (آل عمران:۱۱۹)

”اللہ دلوں میں چھپے ہوئے راز تک جانتا ہے۔“

وہ انھیں سینوں سے نکال کر اور نیتوں تک کو سامنے رکھ دے گا۔ ان کی بنیاد پر اعمال میں وزن پیدا ہوگا۔ اور جہاں کفر ہوگا، وہ تو ویسے ہی سارے اعمال کو ختم کر دے گا اور برباد کر کے رکھ دے گا۔ قرآن مجید نے اس کی طرف اشارہ کیا ہے:

وَالَّذِیْنَ كَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا وَلِقَآءِ الْاٰخِرَةِ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ ؕ (الاعراف۷:۱۴۷)

”ہماری نشانیوں کو جس کسی نے جھٹلایا اور آخرت کی پیشی کا انکار کیا، اس کے سارے اعمال ضائع ہو گئے۔“

ان کے لیے قیامت کے روز کوئی وزن نہیں ہوگا اور اس روز اگر کوئی وزن ہوگا عینِ حق ہوگا۔ باطل اور کفر کا کوئی وزن نہیں ہوگا۔ آج اگر دنیا میں اہل باطل اور کفار کو طاقت اور غلبہ حاصل ہے اور جس کے بل پر وہ ظلم و فساد برپا کرتے ہیں، کل اس کا کوئی وزن نہ ہوگا اور کوئی حیثیت نہ

ہوگی۔ اس روز اگر کسی کا کچھ وزن ہوگا تو وہ صرف حق ہوگا۔

وَ نَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْئًا ط

(الانبیاء: ۴۷)

''قیامت کے روز ہم ٹھیک تولنے والے ترازو رکھ دیں گے، پھر کسی شخص پر ذرہ برابر ظلم نہ ہوگا۔''

یہ اعمال کو سامنے لانا، شہادتیں قائم کرنا، گواہوں کو بلانا، ترازو لگانا اور اعمال تولنا، یہ سارا منظر دراصل یہ بتانے کے لیے ہے کہ اس روز سارا کام عدل و انصاف کے ساتھ ہوگا۔ رحمان و رحیم تو وہ ہے ہی اور جزا کے دن کا مالک ہونے کے ناطے جب قیامت برپا ہوگی اور عدل و انصاف ہوگا تو وہ ہر کسی کے ساتھ رحمت کا سلوک کرے گا، ہر کسی سے شفقت سے پیش آئے گا، اس کی طرف سے عطا اور بخشش ہوگی لیکن اس تمام برتاؤ میں عدل و انصاف کے خلاف ایک بھی چیز نہیں ہوگی۔

انسان کے ذہن میں بہت سے سوالات اس حوالے سے اٹھتے رہتے ہیں کہ نیک اعمال کا کیا ہوگا؟ کسی شخص نے فلاں کام کیا ہے، وہ جہنم میں جائے گا یا دوزخ میں؟ کافروں کے ساتھ اللہ کیا معاملہ کرے گا، دراصل فکر یہ نہیں ہے کہ آدمی کو یہ تشویش لاحق ہو کہ فلاں آدمی جہنم میں جائے گا، یا جنت میں، بلکہ اصل فکر اس بات کی ہونی چاہیے کہ میں کہاں جاؤں گا، میرا ٹھکانہ کہاں ہوگا، بجائے اس کے کہ آدمی دوسروں کی فکر کرتا پھرے کہ وہاں کس کے ساتھ کیا معاملہ ہوگا، یہ تو اللہ کے اوپر ہے۔ اور پھر اس کے اصول بالکل واضح ہیں۔ اس کا کوئی بھی کام عدل و انصاف کے تقاضوں کے منافی نہیں ہوگا اور ہر کام میں اس کی رحمت غالب ہوگی۔ اس نے صاف فرمایا ہے کہ میری رحمت میرے غضب کے اوپر غالب ہوگی، اس پر سبقت لے جائے گی۔ البتہ یہ بات بالکل واضح ہے کہ جس کے ساتھ جو معاملہ بھی کیا جائے گا عدل و انصاف کی بنیاد پر ہی ہوگا اور اس کے اندر اللہ کی رحمت غالب ہوگی اور اللہ تعالیٰ کسی سے بے جا انتقام نہیں لے گا۔

یہاں یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ اگر کفر اعمال کو غارت کرنے والا ہے لیکن ایک مسلمان کی جو برائیاں اور نیکیاں ہوں گی، ان کا کیا بنے گا؟ بعض علما نے اس کی تشریح یوں کی ہے کہ اعمال دو دفعہ تولے جائیں گے۔ ایک دفعہ ان کو کفر اور ایمان کی بنیاد پر الگ کر دیا جائے گا اور

دوسری دفعہ مومن جس کے پاس ایمان بھی ہوگا اور اچھے اور برے اعمال بھی ہوں گے، اس کے بارے میں اس کے اعمال کو تول کے فیصلہ کیا جائے گا کہ آیا نیکیاں غالب ہیں یا برائیاں۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے کہ آدمی اس بحث میں پڑے۔ ہم نہیں جانتے کہ اللہ تعالیٰ نے کہاں فرمایا ہے کہ وہ اعمال کو دو مرتبہ تولے گا۔ اصل بات یہ ہے کہ اگر ایمان موجود ہوگا تو پھر اعمال کے اندر وزن پیدا ہوگا اور جو اعمال وزنی ہوں گے وہ وزن رکھیں گے، اور جو اعمال اس وزن کی نفی کرنے والے ہوں گے وہ اپنی جگہ پر نفی کریں گے۔ اس طرح اعمال کا وزن ہوگا، برے اعمال نفی کریں گے اور اچھے اعمال وزن میں اضافہ کریں گے۔

ایک اور پہلو غور طلب ہے جو بڑا امید افزا ہے۔ وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ جو بھی فیصلہ کرے گا وہ انسان کے مجموعی کارنامۂ زندگی کی بنیاد پر کرے گا۔ وہ چھوٹی چھوٹی چیزوں پر پکڑ کے جہنم میں نہیں بھیج دے گا، بلکہ وہ اس بنیاد پر فیصلہ دے گا کہ مجموعی طور پر انسان کی زندگی کیسی ہے؟ جس نے اللہ کے ساتھ اپنا تعلق درست رکھا، اور اس کی کوشش کرتا رہا، اس کو اس دن کا دھڑکا لگا رہا اور اس کی تیاری کرتا رہا، اور دنیا کے اندر اللہ تعالیٰ نے جو ترغیبات رکھی ہیں جو کشش رکھی ہے، شیطان کی طرف سے وسوسوں کا جو جال پھیلایا گیا ہے اگر وہ اس میں گرفتار ہوتا ہے، اگر نگاہ بہک جاتی ہے، کبھی کوئی ناجائز مال ہاتھ لگ جاتا ہے، گناہ سرزد ہو جاتا ہے مگر پھر توبہ کر لیتا ہے، خدا کی طرف پلٹتا ہے اور نیکی کرتا ہے، ان سب کو مجموعی طور پر تولا جائے گا۔ کیوں کہ انسان دنیا کے اندر گناہ سے پاک نہیں ہو سکتا اور اس طرح سے انسان کی مجموعی زندگی کی بنیادی پر اس کی کامیابی یا ناکامی اور دوزخ یا جنت کا فیصلہ کیا جائے گا۔ اگر خدا ذرا ذرا سی باتوں پر پکڑنے لگتا تو پھر نجات کا معاملہ کتنا مشکل ہو جاتا۔ یقیناً یہ بھی خدا کی عظیم رحمت ہے۔

حضورؐ نے اس بات کو اس طرح سے فرمایا کہ اگر کوئی پانی پر چلے تو گیلا ہونے سے نہیں بچ سکتا۔ اسی طرح اگر کوئی آدمی دنیا میں رہے اور گناہوں سے بچ جائے، یہ ممکن نہیں ہے۔ اس بات کو ایک اور حدیث میں آپؐ نے یوں بیان فرمایا کہ اگر تم گناہ نہ کرتے تو اللہ تعالیٰ دوسری مخلوق پیدا کرتا جو گناہ کرتی اور پھر اس سے استغفار کرتی اور وہ اسے معاف فرماتا۔ گناہ کرنے کی یہ استعداد اس اختیار اور آزادی کی وجہ سے ہی ہے جو انسان کو بخشی گئی ہے، جس کے پاس اختیار یا آزادی نہیں ہے، اس کے اوپر گناہ کرنے پر کوئی سزا بھی نہیں ہے۔ نیکی یا گناہ بھی وہی کر سکتا ہے،

جس کے پاس اختیار ہو۔

اس لیے فرمایا گیا کہ مجموعی زندگی اور طرزِ عمل کی بنیاد پر فیصلہ ہوگا۔ اعمال کو تولا جائے گا، اگر نیکیاں غالب ہوں گی تو پھر اس کے لیے ایسی زندگی ہے، جو اس کی دل پسند زندگی ہوگی۔ اور معاملہ اس کے برعکس ہو تو جہنم کی دہکتی ہوئی آگ مقدر ہوگی۔

فَهُوَ فِیۡ عِیۡشَةٍ رَّاضِیَةٍ○ (القارعة:۷)

''وہ دل پسند عیش میں ہوگا۔''

رَاضِی کے اصل معنی ہیں، جو کسی چیز سے راضی ہو۔ صحیح معنوں میں رَاضِی تو وہ ہے، جس کو اللہ تعالیٰ نے یہ زندگی عطا فرمائی، اور مرضیة کے معنی ہیں جو آدمی کی پسند کی ہوئی چیز ہو۔ عربی زبان کے قاعدے کے لحاظ سے اگر مرضیة کا لفظ ہوتا تو وہ زیادہ صحیح لگتا، ایسی زندگی، جو انسان کو راضی کرنے والی ہو، لیکن یہ زندگی جو خود راضی ہونے والی ہو اس میں دراصل زندگی کی جو نعمتیں آدمی کو ملیں گی، اس کا کوئی اندازہ ہی نہیں ہو سکتا۔ اسی لیے فرمایا کہ وہ من پسند زندگی میں ہوگا۔ ہر چیز مانگنے سے مل جائے گی، بغیر مانگے بھی ملے گی، بلکہ اللہ کا کہنا ہے کہ اس کے علاوہ بھی ہمارے پاس اور بہت کچھ ہے، جو ہم عطا کریں گے۔ اس میں، جو بلاغت کا پہلو ہے وہ یہ ہے کہ وہ زندگی، جو خود راضی ہونے والی چیز ہے، اس کی یہاں کوئی تفصیل نہیں بیان کی گئی۔ وہ زندگی کیسی ہوگی؟ اس میں کیا کیا ملے گا؟ کیا میوے اور پھل ملیں گے؟ اور کس قسم کے رہنے کو ٹھکانے میسر ہوں گے؟ ان دو لفظوں کے اندر اللہ تعالیٰ نے سب کچھ بیان کر دیا ہے کہ وہ کیسی زندگی ہوگی، جو دل پسند ہوگی۔

دنیا کے اندر کوئی ایک دن بھی ایسا نہیں گزرتا کہ جس میں آدمی کہے کہ ہر چیز میری پسند کے مطابق ہوئی ہے۔ کوئی چیز بھی ایسی نہیں ملتی، جس کے بارے میں آدمی یہ کہہ سکے کہ یہ میری پسندیدہ چیز ہے۔ مگر آخرت میں، جو من پسند زندگی ہوگی، اس میں جو بھی دل چاہے گا، جو بھی مانگیں گے، مل جائے گا، جو طلب کریں گے عطا کر دیا جائے گا۔ کوئی خواہش ایسی نہیں ہوگی کہ جو پوری نہ کر دی جائے۔ یہ دل پسند زندگی، دراصل جنت کی بڑی مختصر اور جامع تعریف ہے کہ آدمی کی جو من بھاتی زندگی ہو یا دل پسند زندگی ہو، وہ اس کو عطا کر دی جائے گی۔

وَ اَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ ۙ فَاُمُّهٗ هَاوِيَةٌ ؕ (القارعة:۸،۹)

''اور جس کے پلڑے ہلکے ہوں گے، اس کی جائے قرار گہری کھائی ہوگی۔''

یہ روزِ محشر کا دوسرا منظر ہے کہ اعمال تولنے پر، جس کے پلڑے وزن میں ہلکے ہوئے تو پھر اس کا ٹھکانہ ھَاوِیَۃٌ ہوگا۔ ٹھکانے کے لیے 'اُم' کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ ام کے معنی ماں کے ہیں۔ اگر ہم لفظی ترجمہ کریں تو پھر اس کے معانی ہوں گے کہ اس کی ماں ایک گڑھا ہوگا۔ گڑھا پستی اور نیچے جانے کی طرف اشارہ کرتا ہے، جس میں آدمی گر جائے۔ اگر آپ غور کریں کہ دنیا کے اندر جو آدمی برے اعمال میں مبتلا ہوتا ہے، دراصل وہ بدی کے اندر گرتا ہے اور اپنے آپ کو پستی اور ذلت کی طرف لے جاتا ہے۔

ہر آدمی نیکی کو فطرتاً پسند کرتا ہے۔ اگر کسی برے آدمی سے بھی نیکی کے بارے میں پوچھا جائے تو وہ کہے گا کہ رحم کرنا، سچ بولنا، وعدے کی پابندی کرنا، دوسروں کا حق ادا کرنا، جیسی اقدار اچھی چیزیں ہیں۔ گویا آدمی ان کو فطرتاً پسند کرتا ہے اور عرفِ عام میں، جن باتوں کو برا سمجھا جاتا ہے، ہر آدمی ان کو برا سمجھتا ہے۔ تباہی کے گڑھے میں آدمی نیکی کے راستے کو چھوڑ کے برائیوں کے اندر مبتلا ہونے کی وجہ سے گرتا ہے اور پھر اتنے برے اعمال کا مرتکب ہوتا ہے کہ وہ اس کی اچھائیوں پر حاوی ہو جاتے ہیں۔

یہاں جائے قرار یا ٹھکانے کو ماں اس لیے کہا گیا ہے کہ ایک تو اس کے معنی یہ ہیں کہ جس طرح بچے کے پاس اس کے علاوہ کوئی ٹھکانہ نہیں ہوتا کہ وہ اپنی ماں کی گود میں جا کر پناہ لے اور اسی کی طرف جائے، اسی کی گود میں جا کر سر رکھ دے۔ اسی طرح اس دن اس بدکار آدمی کے لیے بھی کوئی ٹھکانہ نہیں ہوگا، سوائے اس کے کہ وہ اس گڑھے کے اندر جا گرے اور آگ میں جھونک دیا جائے۔ پھر اس کے اندر یہ معانی بھی ہیں کہ دنیا کے اندر جن چیزوں کو اس نے اپنا ٹھکانا بنایا، ملجا و ماویٰ بنایا اسے ان سب کا سامنا کرنا ہوگا۔ وہ اس کے ساتھ ہی ہوں گی۔ وہ اس کا مال ہوگا، جو آگ کے انگارے بنا کر اس کے اوپر ٹھنڈا کیا جائے گا۔ اس کے اعمال ہوں گے، جو انگارے بن کر اس کے پیٹ کو جلائیں گے، اور گرم پانی اور کانٹوں کی صورت میں اس کو کھانے اور پینے کو ملیں گے۔ یہ سب کچھ دراصل اس کے اعمال ہوں گے، جو اس کے لیے وبالِ جان بن جائیں گے، جن کو اس نے دنیا کی زندگی میں اپنا ٹھکانہ، پناہ گاہ اور ملجا و ماویٰ بنایا تھا۔

اس کے بعد عذاب کی ہولناکی دل پر بٹھانے کے لیے پھر سوال کیا جاتا ہے:

وَمَآ اَدْرٰکَ مَاهِيَهْ○ نَارٌ حَامِيَةٌ○ (القارعۃ:۱۰،۱۱)

''اور تمھیں کیا خبر وہ کیا چیز ہے؟ بھڑکتی ہوئی آگ۔''

دوزخ کی آگ کی شدت، ہولناکی اور اس کی صفات کو بیان کرنے کے لیے قرآن نے مختلف پیرائے استعمال کیے ہیں۔ کہیں دہکتی اور سلگتی ہوئی آگ کہا، اور کہیں چنگھاڑتی، چیختی اور لپکتی ہوئی آگ قرار دیا۔ بہت سی جگہ ایسی آگ کہا کہ جو جوش مار رہی ہے، پھنکار رہی ہے، آوازیں نکال رہی ہے، لپک رہی ہے اور لپک کر پھیلتی چلی جارہی ہے۔ اگر کہیں بڑی آگ لگی ہوئی ہو یا ہم تندور کے سامنے ہی کھڑے ہو جائیں تو قرآن نے یہ سب الفاظ جو استعمال کیے ہیں ان کا کسی حد تک اندازہ ہوسکتا ہے کہ کس طرح آگ دہکتی ہے، لپٹیں اٹھتی ہیں، ہولناک آواز پیدا ہوتی ہے، چنگھاڑ پیدا ہوتی ہے اور کتنی زیادہ حدت، تپش اور گرمی ہوتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ایک ایسی آگ ہوگی، دہکتی ہوئی آگ کہ جس کا تصور کر کے ہی انسان لرز کر رہ جاتا ہے۔ گناہ گاروں اور برے اعمال کا ارتکاب کرنے والوں کا ٹھکانہ یہی آگ ہوگی۔ اَللّٰھُمَّ اَجِرْنِیْ مِنَ النَّارِ۔ ''اے اللہ! مجھے جہنم کی آگ سے بچا۔''

وہ عظیم حادثہ جب پیش آجائے گا، کائنات لپیٹ کر رکھ دی جائے گی، انسان خوف و دہشت کے عالم میں، مدہوشی کی کیفیت میں اپنے رب کے روبرو کھڑا ہوگا اور اس کے اعمال اس کے سامنے لائے جائیں گے۔ ذرّہ برابر برائی بھی سامنے آئے گی اور ذرّہ برابر نیکی بھی سامنے آجائے گی، نیز دلوں کے بھید تک کھول کر سامنے رکھ دیے جائیں گے۔ ترازو کھڑی کردی جائے گی اور اعمال کو تولنے کے بعد جزا و سزا کا فیصلہ ہوگا۔ یہ وہ انجام ہے، جس پر بالآخر انسان کو پہنچنا ہے۔ اور اس انجام تک پہنچنے میں، جس چیز کو دخل ہے وہ دنیا کی محبت اور اللہ کی ناشکری ہے:

اِنَّ الْاِنْسَانَ لِرَبِّهٖ لَكَنُوْدٌ○ (العٰدیٰت:۶)

''حقیقت یہ ہے کہ انسان اپنے رب کا بڑا ناشکرا ہے۔''

درحقیقت ہر چیز اللہ ہی کی عطا کردہ ہے۔ یہ کان جن سے انسان سنتا ہے، یہ ہاتھ پاؤں جن سے کام لیتا ہے، یہ آنکھیں، جن سے دیکھتا ہے، مال جس سے اپنی ضروریات پوری کرتا ہے، گھر جس میں رہتا ہے، یہ آسمان جس نے سایہ کیا ہوا ہے، گیہوں کا ایک دانہ، جو نوالے

کی صورت میں اس کے منہ تک پہنچتا ہے، اس کے لیے بادل، ہوائیں، سمندر اور پانی، کھیت اور زمین، نہ معلوم کائنات کی کتنی قوتیں کام کرتی ہیں تب کہیں جا کر ایک دانہ نوالے کی شکل اختیار کرتا ہے اور آدمی اس کو منہ میں ڈالتا ہے۔ غرض کوئی بھی چیز اس کی اپنی بنائی ہوئی نہیں ہے، کسی کی بخشی ہوئی نہیں ہے، سب کچھ اللہ کا دیا ہوا ہے۔ لیکن انسان ناشکری کرتا ہے اور خدا کے عظیم احسانات کو فراموش کر دیتا ہے۔

وَ اِنَّهٗ لِحُبِّ الْخَیْرِ لَشَدِیْدٌ ۝ (العدیت:۸)

''اور وہ مال و دولت کی محبت میں بری طرح مبتلا ہے۔''

مال کی محبت اور اللہ کی ناشکری، یہ دو خرابیاں ہیں، جن میں انسان مبتلا ہو جاتا ہے۔ ان کا اس سورہ کے بعد کے حصے اور سورۂ تکاثر میں ذکر کیا گیا ہے۔ سورۂ زلزال، عادیات، القارعہ اور تکاثر، یہ وہ مختصر سورہ ہیں، جن میں آخرت کا بیان نہایت موثر انداز میں کیا گیا ہے۔ بعض آیات صرف ایک ایک یا دو دو لفظوں پر ہی مشتمل ہیں لیکن ان میں قیامت کے واقع ہونے سے لے کر انسان کے آخری انجام تک کی پوری تصویر کھینچ کر رکھ دی گئی ہے۔

قرآن مجید میں قیامت کے مناظر کی تفصیل مختلف جگہوں پر بیان کی گئی ہے۔ کہیں پہاڑوں کے بارے میں تفصیلی بیان ملے گا، کہیں قبروں سے انسان کس طرح نکلیں گے اور کس طرح اللہ کے سامنے حاضر ہوں گے کا تذکرہ ہے، کہیں کس طرح آوازیں پست ہو جائیں گی، گردنیں جھک جائیں گی، چہرے پیلے پڑ رہے ہوں گے، یہ سب بیانات تفصیل سے ملیں گے۔ لیکن سورۂ قارعہ کی گیارہ چھوٹی چھوٹی آیتوں کے اندر قیامت کے روز جب پہلا صور پھونکا جائے گا، جس سے زمین تباہ ہو جائے گی، پہاڑ ریزہ ریزہ ہو جائیں گے یا ان کو اٹھا کر پھینک دیا جائے گا، اس وقت سے لے کر جب آدمی اپنی دل پسند زندگی میں پہنچ جائیں گے اور کچھ آگ کے گڑھے میں جا گریں گے، یہ پورا منظر مکمل طور پر پیش کیا گیا ہے۔ یہ قرآن مجید کا انداز ہے کہ بظاہر موت کے وقت سے لے کر جب حساب کتاب مکمل ہو جائے گا اور آدمی جنت یا جہنم میں پہنچ جائے گا اور ہر مرحلہ نہ جانے کتنی مدت کا ہوگا، کبھی وہ لمبے سفر کو دو جملوں میں بیان کرتا ہے اور کبھی چھوٹے سے سفر کو کئی جملوں میں بیان کرتا ہے تاکہ انسان کے ذہن میں بات اچھی طرح بیٹھ جائے۔

کہیں معلوم ہوتا ہے کہ قیامت واقع ہو چکی ہے، اب اس کے بعد کا ذکر ہو رہا ہے۔

کہیں ایک دم ذکر کرتے ہوئے کہ وہ آئے گی اور گفتگو شروع ہو جاتی ہے کہ لوگ کھڑے ہیں اور اللہ تعالیٰ ان سے گفتگو کر رہا ہے۔ اس کو اگر کسی مثال سے سمجھنا چاہیں تو یوں سمجھا جا سکتا ہے کہ الفاظ کی صورت میں ایک ویڈیو فلم ہے، جو دکھائی جا رہی ہے، اور جس طرح فلم چلتی ہے، کبھی منظر بدل جاتا ہے اور کبھی کوئی منظر آ جاتا ہے، بالکل اسی طرح الفاظ کی فلم ہے، جو آدمی کی نگاہوں میں چل رہی ہے۔ جنھوں نے قرآن کو نازل ہوتے اپنی آنکھوں سے دیکھا اور اسے سمجھا، یہ تصویر ان کے اندر اس قدر راسخ ہو گئی تھی کہ وہ کہا کرتے تھے کہ جب ہم حضورؐ کی صحبت میں ہوتے ہیں تو ایسا محسوس کرتے ہیں کہ جیسے جنت بھی نگاہوں کے سامنے ہو اور جہنم بھی۔

یہ اسی بیان، اسلوب، تصویر کشی اور منظر نگاری کا نتیجہ تھا کہ جو لوگ اہل زبان تھے، قرآن کو براہِ راست سمجھ رہے تھے، ان کے دل و دماغ پر یہ مناظر تصویر کی طرح نقش ہو گئے تھے کہ واقعی اب پہاڑ پھٹ پڑیں گے، ریزہ ریزہ ہو جائیں گے، سورج بے نور ہو جائے گا، لوگ پتنگوں کی طرح ہوں گے، کوئی سہارا نہیں ہوگا، لہٰذا آؤ اس کی تیاری کریں، ہر وقت اسی بات کا دھڑکا لگا رہے، لگا رہنا چاہیے کہ کب کوئی دروازے پر آئے گا اور دستک دے گا کہ چلو وقت ہو گیا ہے!

یہ وہ تصور ہے، جس سے اگر آدمی آشنا ہو اور اس کو دل کے اندر بٹھا لے تو پھر اس کے اندر وہ قوت و استعداد پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرے، اس کی راہ پر چلے، دنیا سے بھاگے نہیں بلکہ اسے پوری طرح برتے اور جہاں یہ اسے اللہ سے مخالف راہ پر لے جانا چاہے، وہاں دامن جھٹک کر اٹھ جائے۔ یہ قوت اگر آ سکتی ہے، یہ خشیت اور تقویٰ اگر پیدا ہو سکتا ہے تو صرف خوفِ خدا سے پیدا ہو سکتا ہے، آخرت کی فکر سے پیدا ہو سکتا ہے۔ ذٰلِکَ لِمَنۡ خَشِیَ رَبَّہٗ (البینہ:۸) "یہ کچھ ہے اس شخص کے لیے، جس نے اپنے رب کا خوف کیا ہو۔" درحقیقت کامیابی تقویٰ رکھنے والے کے لیے ہے۔ متقین جنت کی نعمتوں سے لطف اندوز ہوں گے۔ یہ دراصل آخرت کی فکر، آخرت کے کھٹکے اور آخرت کی تیاری سے ہی ممکن ہوگا۔

جس طرح کسی کو یہ نہیں معلوم کہ کب موت آئے گی، اسی طرح قیامت کا بھی علم نہیں کہ کب آئے گی۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہزاروں برس سے لوگ مر رہے ہیں لیکن قیامت نہیں آئی۔ یہ کب آئے گی؟ اس کی مثال بالکل ایسے ہی ہے، جیسے آدمی رات کو سوتا ہے، آنکھ لگ جاتی ہے اور وہ دو گھنٹے بعد یا چار گھنٹے بعد اٹھ جاتا ہے، یا تین دن سوتا رہے یا بے ہوش رہے، جب بھی

اُٹھے گا تو یوں معلوم ہوگا کہ ابھی سویا تھا۔ اس لیے کہا گیا ہے کہ موت قیامت صغریٰ ہے۔ آدمی کی قیامت تو موت کے ساتھ ہی واقع ہو جاتی ہے۔ موت دروازے پر دستک دینے کے لیے کھڑی ہے۔ روز واقعات ہوتے رہتے ہیں کہ اچانک دل کی دھڑکن بند ہوگئی اور آدمی مر گیا۔ لیکن موت پر زندگی ختم نہیں ہوتی، بلکہ ایک عظیم حادثہ وقوع پذیر ہونے والا ہے۔ اس روز زمین پوری شدت سے ہلنے والی ہے، سب مردے قبروں سے نکل کھڑے ہوں گے اور پھر اعمال کے علاوہ کوئی سہارا نہیں ہوگا۔

یہ دنیا عمل کی دنیا ہے۔ عقل مند وہ ہے، جو آنے والے وقت کی تیاری کرے اور یہ دیکھے کہ اس نے کل کے لیے کیا سامان کیا ہے۔ اس سورہ میں دراصل یہی پیغام دیا گیا ہے۔

☙❧

سورة التکاثر

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ۝

اَلۡہٰکُمُ التَّکَاثُرُ ۙ﴿۱﴾ حَتّٰی زُرۡتُمُ الۡمَقَابِرَ ؕ﴿۲﴾ کَلَّا سَوۡفَ تَعۡلَمُوۡنَ ۙ﴿۳﴾ ثُمَّ کَلَّا سَوۡفَ تَعۡلَمُوۡنَ ؕ﴿۴﴾ کَلَّا لَوۡ تَعۡلَمُوۡنَ عِلۡمَ الۡیَقِیۡنِ ؕ﴿۵﴾ لَتَرَوُنَّ الۡجَحِیۡمَ ۙ﴿۶﴾ ثُمَّ لَتَرَوُنَّہَا عَیۡنَ الۡیَقِیۡنِ ۙ﴿۷﴾ ثُمَّ لَتُسۡـَٔلُنَّ یَوۡمَئِذٍ عَنِ النَّعِیۡمِ ﴿۸﴾

اللہ کے نام سے، جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔

تم لوگوں کو زیادہ سے زیادہ اور ایک دوسرے سے بڑھ کر دنیا حاصل کرنے کی دھن نے غفلت میں ڈال رکھا ہے۔ یہاں تک کہ (اسی فکر میں) تم لب گور تک پہنچ جاتے ہو۔ ہرگز نہیں، عن قریب تم کو معلوم ہو جائے گا۔ پھر (سن لو کہ) ہرگز نہیں، عن قریب تم کو معلوم ہو جائے گا۔ ہرگز نہیں، اگر تم یقینی علم کی حیثیت سے (اس روش کے انجام کو) جانتے ہوتے (تو تمھارا یہ طرزِ عمل نہ ہوتا)۔ تم دوزخ دیکھ کر رہو گے، پھر (سن لو کہ) تم بالکل یقین کے ساتھ اسے دیکھ لو گے۔ پھر ضرور اس روز تم سے ان نعمتوں کے بارے میں جواب طلبی کی جائے گی۔

تشریح: سورۂ تکاثر سے قبل، جو سلسلۂ کلام گزشتہ تین سورتوں سے چل رہا ہے، اس کے آخر میں، جو بات ہمارے سامنے رکھی جا رہی ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نیکی کرنے والوں کے لیے

جو زندگی آخرت میں تیار کر رکھی ہے، اس سے لوگ کیوں غافل ہو جاتے ہیں اور کس طرح یہ غفلت دور ہو سکتی ہے؟ اس بات کا بھی جواب دیا گیا ہے کہ جن نیکیوں اور اعمال کا وزن اللہ کے ہاں ہے اور جن کے لیے کوشش کرنے سے ہمیشہ کی زندگی اور من پسند زندگی، جو کہ مطلوب ہے، حاصل ہو سکتی ہے، اسے بھول کر آدمی کن چیزوں کے پیچھے پڑ جاتا ہے اور کیوں غفلت کا شکار ہو جاتا ہے؟ پھر جو بات سورۂ عادیات میں کہی گئی تھی: اِنَّ الْاِنْسَانَ لِرَبِّهٖ لَكَنُوْدٌ (العدیت:٦) ''حقیقت یہ ہے کہ انسان اپنے رب کا بڑا ناشکرا ہے۔'' اس کا تذکرہ بھی اس سورہ میں کیا گیا ہے۔ سورۂ عادیات میں انسانی فطرت کا جو پہلو بیان کیا گیا تھا: وَاِنَّهٗ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيْدٌ (العدیت:۸) ''اور وہ مال و دولت کی محبت میں بری طرح مبتلا ہے۔'' اس کے جو اثرات اعمال پر ہوتے ہیں، اس کا ذکر بھی اس سورہ میں کیا گیا ہے۔

> اَلْهٰىكُمُ التَّكَاثُرُ (التکاثر:۱)
> ''تم لوگوں کو زیادہ سے زیادہ اور ایک دوسرے سے بڑھ کر دنیا حاصل کرنے کی دھن نے غفلت میں ڈال رکھا ہے۔''

الھٰی کے معنی ہیں غافل کر دیا، یعنی کسی ایسی چیز سے غافل کر کے کسی ایسے شغل میں مشغول کر دیا، جو اس سے بہت کم تر درجے کا ہے۔ ان سورتوں میں اختصار سے کام لیتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے ان بہت سی چیزوں کو وضاحت سے بیان نہیں کیا، جنھیں بیان کیا جا سکتا تھا، جیسا کہ سورۂ لیل میں فرمایا: فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰى (الیل:۵) ''پس جس نے دیا۔'' یہاں دینے کا ذکر ہے لیکن کیا دیا؟ کتنا دیا؟ کس کو دیا؟ یہ بیان نہیں کیا گیا۔ اس لیے کہ تفصیلات تو ہر کوئی اپنی اپنی استطاعت کے مطابق طے کرے گا۔ اصل چیز ہے اپنے آپ کو قربان کرنا، اپنے آپ کو دوسروں کی خاطر لگانا، اپنا مال خرچ کرنا۔ یہ وہ چیزیں ہیں، جو انسان میں پیدا ہونی چاہییں۔

الھٰی یعنی غافل کرنے والی چیز سے کیا مراد ہے؟ وہ تکاثر ہے، یعنی زیادہ سے زیادہ حاصل کرنے کی حرص، لیکن کس چیز سے غافل کر رہی ہے، وہ بیان نہیں کی گئی۔ اگر گزشتہ سورتوں کے سیاق میں دیکھا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ جس دن ذرّہ برابر نیکی اور ذرہ برابر برائی سامنے آ جائے گی، اعمال کی بنیاد پر اس کا فیصلہ ہوگا کہ کون اپنی من پسند زندگی گزارے گا، کس کی خواہشات پوری ہوں گی، کون عیش و عشرت میں رہے گا، اور کون جہنم کے گڑھے میں گر کر آگ کا

ایندھن بنے گا، اس سے غفلت برتی جاتی ہے، یعنی آخرت سے آدمی غافل ہو جاتا ہے۔

تکاثر کے معنی ہیں کسی چیز کو زیادہ سے زیادہ حاصل کرنا، اس کی حرص اور لالچ کرنا، اور حاصل ہی نہ کرنا بلکہ دوسرے سے بڑھ کر حاصل کرنا، حاصل کرنے کی دوڑ میں دوسروں سے آگے نکلنا اور نہ صرف آگے نکلنا بلکہ اس پر فخر جتانا اور اس کو بڑائی اور مرتبے کا ذریعہ سمجھنا۔ تینوں چیزیں تکاثر کے معنوں میں آتی ہیں، یعنی زیادہ سے زیادہ حاصل کرنا، اس دوڑ میں دوسروں سے آگے بڑھنا اور دوسروں سے زیادہ حاصل کرنا، اور پھر اس کو فخر کا ذریعہ سمجھنا اور فخر جتانا۔

کس چیز کو آدمی زیادہ سے زیادہ حاصل کرنا چاہتا ہے، اور دوسروں سے بڑھ کر حاصل کرنا چاہتا ہے، اور پھر اس پر فخر بھی کرتا ہے؟ اس چیز کو قرآن مجید نے یہاں بیان نہیں کیا۔ اگر سلسلۂ کلام پر غور کیا جائے تو تکاثر سے مراد دراصل دنیا اور دنیا کے مال، دنیا کے اندر عزت، جاہ و اقتدار اور طاقت اور دنیا کے مختلف پہلو ہیں۔ ان میں سب سے بڑھ کر مال ہے۔ پہلے زمانے میں اولاد بھی ہوا کرتی تھی۔ اب تصورات بدل گئے ہیں۔ اب اگر اولاد زیادہ ہو تو آدمی شرما کر ذکر کرتا ہے۔ اولاد کو قابل فخر اس زمانے میں سمجھا جاتا تھا جب افرادی قوت کی اہمیت تھی۔ جنگوں میں، کمانے میں، کھیتوں میں کام کرنے کے لیے، اور مال و دولت کے حصول کے لیے، اس کی ضرورت سب سے اہم ہوتی تھی۔ اسی لیے اولاد پر فخر ہوتا تھا، اور آدمی اس کو زیادہ سے زیادہ چاہتا تھا۔ اسی لیے بہت سے ترجمہ کرنے والوں نے اس لفظ کے ترجمے میں مال کے ساتھ ساتھ اولاد کا اضافہ بھی کر دیا ہے، اور اس سے مراد زیادہ سے زیادہ مال اور زیادہ سے زیادہ اولاد لیا۔ لیکن اگر غور کریں تو یہ بات صرف مال اور اولاد تک محدود نہیں ہے بلکہ ہر وہ چیز، جو دنیا کے اندر آدمی کو حاصل ہوتی ہے، وہ اس کے مفہوم میں شامل ہے۔

دنیا حاصل کرنا اور دنیا طلب کرنا، اپنی جگہ پر یہ کوئی قابل مذمت چیز نہیں ہے۔ اسی لیے اس سے پہلی سورتوں میں مال کو خیر کہا گیا ہے۔ لہٰذا مال فی نفسہٖ نہ برا ہے نہ اچھا بلکہ مال کو آدمی زندگی میں کیا مقام دیتا ہے، کس طرح کماتا اور کس طرح خرچ کرتا ہے، اس سے یہ متعین ہوتا ہے کہ مال اس کے لیے اچھا ہے یا برا۔ یہاں مال کی مذمت اس لیے کی جا رہی ہے کہ انسان اس کی ہوس میں پڑا ہوا ہے، اور اسی کے پیچھے بھاگ رہا ہے، دوسروں کے مقابلے میں زیادہ سے زیادہ کمانا اور جمع کرنا چاہتا ہے اور سمجھتا ہے کہ مال و دولت، کارخانے، زمین و جائیداد ہی دنیا میں

مقام و مرتبہ حاصل کرنے کا ذریعہ ہیں اور انھی پر وہ فخر کرتا ہے۔

اس کے مقابلے میں دنیا میں بہت ساری چیزیں ایسی ہیں، جنھیں آدمی کو زیادہ سے زیادہ حاصل کرنا چاہیے۔ ان میں دین کا علم، اللہ کا قرب، نیک اعمال، بندوں کی خدمت اور ان کے ساتھ حسنِ سلوک اور راہِ خدا میں کرچ کرنا نمایاں ہیں۔ یہ اسلام کی تعلیمات کے اندر بڑی محمود اور محبوب چیزیں ہیں۔ مال کمانا، دولت حاصل کرنا، اس کو صحیح طور پر خرچ کرنا اور اللہ کی راہ میں بھی دینا اور اپنی ذات پر بھی خرچ کرنا، یہ چیزیں بھی مذموم نہیں ہیں۔ ان کی برائی یہاں پر نہیں کی جارہی ہے بلکہ جس چیز کی برائی کی جارہی ہے وہ تکاثر ہے، یعنی مال کمانے کی حرص و ہوس، اس کے حصول کے لیے دوڑ، اور معیارِ زندگی کو اونچا کرتے چلے جانا، اور ہر وقت اسی فکر میں گم رہنا۔ مکان اچھا بنانا، کپڑے اچھے پہننا، کھانے ایک سے زیادہ پکائے جائیں، یہ بھی معیارِ زندگی کی دوڑ میں شامل ہونا ہے کہ جس میں آدمی اپنے آپ کو اوپر اٹھاتا ہے۔ یہ عیش و عشرت، جسمانی لذتیں، اور قوت و طاقت کا حصول محض افراد کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ اقوام بھی اس کے اندر شریک ہوتی ہیں کہ ہماری مادی حالت بہتر ہو خواہ اس کے لیے کمزور لوگوں اور کمزور اقوام کو دبانا پڑے، اور اپنی برتری کی اور فوقیت جتانے کے لیے قیمتی وسائل کھپانے پڑیں اور انسانی جانوں کا ضیاع ہو، نیز اس دوڑ میں سب سے آگے نکلا جائے۔ یہ ساری چیزیں تکاثر کے اندر شامل ہیں۔

دراصل ان کی مذمت اس لیے کی گئی ہے کہ یہ وہ چیزیں ہیں، جو انسان کو ان چیزوں سے غافل کردیتی ہیں جو آخرت میں وزن پیدا کرنے والی ہیں۔ اصل چیز تو وہ اعمال ہیں جو اللہ کے نزدیک وزنی ہوں گے، جب یہ اس کے ترازو میں تُلیں گے تو وہ ان کو وزن عطا کرے گا۔ اس کے متعلق فرمایا: فَاَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ ۙ فَهُوَ فِيْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ ؕ (القارعۃ ۱۰۱: ۶، ۷) ''پھر جس کے پلڑے بھاری ہوں گے وہ دل پسند عیش میں ہوگا''۔ وہی اعمال دراصل انسان کے کام آنے والے ہیں۔ اس کے علاوہ دنیا کی ہر چیز خواہ پہاڑ ہوں یا زمین، ستارے ہوں یا خود انسان، سب بے وزن ہوجائیں گے۔ وہ قوتیں جو اس نظام کو باندھے ہوئے ہیں، ان کی بندش ختم ہوجائے گی اور سب کچھ ریزہ ریزہ ہوجائے گا۔ جن چیزوں کے پیچھے آدمی دوڑتا ہے، یہ بے وقعت ہوجائیں گے۔ مال و دولت، مکان و جائیداد، عزت و جاہ اور عہدہ و منصب، کسی چیز کا کوئی مقام نہیں رہے گا۔ چوں کہ یہ چیزیں آدمی کو اس کی اصل منزل سے غافل کردیتی ہیں، اس

لیے یہاں پر ان کی مذمت کی گئی ہے۔ تکاثر کی بیماری، یعنی زیادہ سے زیادہ ایک دوسرے سے بڑھ کر دنیا کمانے کی حرص، دراصل وہ بیماری ہے، جو انسان کو اپنے اصل مقصد زندگی سے، جس کے لیے اس کو کام کرنا چاہیے، یعنی نیکیوں کو جمع کرنا اور وہ اعمال کرنا، جو اللہ کی میزان میں وزن رکھتے ہوں، غافل کر دیتی ہے۔

اگر آدمی اپنے مقصد زندگی سے غافل ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ سے بھی غافل ہو جاتا ہے۔ اللہ کی ذات پر ان چیزوں کو ترجیح دیتا ہے، جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے۔ اللہ نے اس پر جو حقوق عائد کیے ہیں، یعنی حقوق اللہ یا وہ حقوق، جو اس پر اللہ کے بندوں کے عائد ہوتے ہیں، یعنی حقوق العباد ان میں لوگوں کے ساتھ اچھا سلوک کرنا، ان کے ساتھ رحمت اور نیکی کا برتاؤ کرنا، بھوکوں کو کھانا کھلانا، بیماروں کے علاج کی کوشش کرنا، اپنے رشتے دار اور اقربا ہوں یا یتامیٰ اور مساکین یا کمزور اور ضعیف، ان کے ساتھ رحمت و شفقت اور محبت کا سلوک کرنا... ان سے بھی آدمی غافل ہو جاتا ہے۔ اس کے لیے الھٰی کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ کس چیز سے غافل کر دیا؟ اس کی یہاں پر تشریح نہیں کی گئی۔ البتہ اس میں وہ سارے اعمال جن میں چھوٹی سے چھوٹی نیکی بھی اور بڑی سے بڑی نیکیاں بھی جو ایمان اور فرائض کی ادائیگی سے تعلق رکھتی ہیں، ان سب سے جو چیز غافل کرتی ہے وہ تکاثر کی بیماری ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان زیادہ سے زیادہ حاصل کرنے میں اس حد تک آگے بڑھ جاتا ہے کہ پھر وہ اس بات کی بھی پروا نہیں کرتا کہ کن حدود اور احکام کی خلاف ورزی ہوتی ہے، جو کہ قیامت کے روز وبال بننے والے ہیں، اور وہاں پر جا کر اچھے اعمال اور نیکیوں کا سارا وزن ختم کر دیں گے بلکہ الٹا دوزخ کے گڑھے میں گرانے والے ہوں گے۔ اس بات کی طرح یوں اشارہ کیا گیا ہے: فَاُمُّهٗ هَاوِيَةٌ (القارعہ:۹) ''پھر اس کا ٹھکانہ گڑھا ہوگا۔'' جس میں وہ جا گرے گا۔

حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ ۝ (التکاثر:۲)

''یہاں تک کہ (اسی فکر میں) تم لبِ گور تک پہنچ جاتے ہو۔''

اس کا لفظی ترجمہ تو بالکل یہی ہوگا، یعنی تم قبروں تک پہنچ جاؤ گے۔ اس کے ایک معنی یہ ہو سکتے ہیں کہ یہ تکاثر کی بیماری، یعنی زیادہ سے زیادہ کی حرص اور اس کے لیے بھاگ دوڑ تمھارے پیچھے اس طرح لگ جاتی ہے کہ موت تک تمھیں ہوش نہیں آتا۔ حتیٰ کہ جب موت

آ جاتی ہے، تو آدمی سوچتا ہے کہ اب میں کیا کروں۔ کاش! میں واپس لوٹا دیا جاؤں تاکہ پھر نیک اعمال کروں۔ اب میں وہ کام کروں گا کہ جن کو پہلے نظر انداز کرتا رہا ہوں:

حَتّٰٓی اِذَا جَآءَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ رَبِّ ارْجِعُوْنِ ۝ لَعَلِّیْٓ اَعْمَلُ صَالِحًا فِیْمَا تَرَكْتُ كَلَّا ؕ اِنَّهَا كَلِمَةٌ هُوَ قَآئِلُهَا ؕ (المؤمنون: ۹۹، ۱۰۰)

''یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی کو موت آجائے گی تو کہنا شروع کرے گا کہ'' اے ہمارے رب! مجھے اسی دنیا میں واپس بھیج دیجیے، جسے میں چھوڑ آیا ہوں۔ امید ہے کہ اب میں نیک اعمال کروں گا۔'' ہرگز نہیں، یہ تو بس ایک بات ہے جو وہ بک رہا ہے۔''

درحقیقت یہ تو بس ایک بات ہوگی، جو وہ موت کو دیکھ کر کہے گا۔ اگر اسے پھر دوبارہ لوٹا دیا جائے تو پھر وہ یہی کچھ کرے گا جو کچھ وہ پہلے کرتا آیا تھا۔

دراصل قبر کے جس گڑھے میں آدمی کو بالآخر جا کر لیٹنا ہے، جو ایک اٹل حقیقت ہے، اسے اس کی تیاری دنیا کمانے کی اس حرص و ہوس کا مقابلہ کر کے کرنی چاہیے، جس کی خاطر وہ ساری عمر تگ و دو، بھاگ دوڑ اور بھرپور کوشش کرتا ہے۔ اسے سوچنا چاہیے کہ ایک طرف عالی شان محل اور مکان ہیں، جاگیریں اور کارخانے ہیں، بنک بیلنس اور شان دار گاڑیاں ہیں اور ان کے حصول کے لیے عمر بھر کی جدوجہد اور جستجو ہے۔ اور دوسری طرف آدمی لبِ گور تک پہنچ جاتا ہے اور یہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر خالی ہاتھ چلا جاتا ہے۔ یہ ایک بڑا تضاد ہے، جس کی تصویر قبر کے تصور سے سامنے آتی ہے۔

قبر کا تصور ایک ایسا تصور ہے جو محض تصور ہی نہیں بلکہ ایک ایسی حقیقت ہے جو روز نگاہوں کے سامنے ہوتی ہے۔ روز لوگ مرتے ہیں، روز قبروں میں دفن ہوتے ہیں اور آدمی بار بار قبرستان میں دفن کرنے کے لیے جاتا ہے اور اس حقیقت کا مشاہدہ کرتا ہے۔ یہاں تَكَاثُرُ یعنی کمانے کی حرص کے مقابلے میں قبر کا ذکر اس لیے کیا گیا ہے کہ دنیا میں آدمی جو کچھ بھی سمیٹ رہا ہے، قبر اس بات کی علامت ہے کہ یہ سب کا سب بے وزن ہے، اس کی کوئی حقیقت نہیں، جتنا بھی ٹھاٹ باٹھ ہے، سب دھرا کا دھرا رہ جائے گا اور کوئی بھی چیز قبر میں ساتھ جانے والی نہیں۔ قبر دراصل اس بات کا سب سے پہلا ثبوت ہے کہ ان میں سے کسی چیز کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ جیسے ہی آدمی کا سانس بند ہوتا ہے، یہ سب کی سب چیزیں چھن جاتی ہیں اور ان میں سے کوئی بھی چیز

کام آنے والی نہیں۔

اسی بات کی اہمیت کے پیش نظر جب حضورؐ نے یہ سورہ تلاوت فرمائی تو اس کے ساتھ وہ مشہور حدیث بھی بیان فرمائی کہ بندہ کہتا ہے کہ میرا مال، میرا مال، حالاں کہ اس کا مال وہی ہے، جو اس نے کھایا اور اسے جسم پر لگا دیا، پہنا اور کپڑا پھٹ گیا، یا پھر اس نے اللہ کی راہ میں دے دیا اور وہ اس کے لیے محفوظ ہو گیا۔ درحقیقت یہ سارا مال تو اس کے وارثوں کا ہے۔ انسان تمام عمر کماتا ہے جائیداد بناتا ہے، کارخانے اور بنک بیلنس بناتا ہے، یہ سمجھ کر کہ یہ اس کا مال ہے، ہمیشہ اس کے پاس رہے گا، اس کے کام آئے گا، لیکن دم نکلتے ہی یہ حقیقت آشکارا ہوتی ہے کہ وہ یہ سب کچھ اپنے وارثوں کے لیے چھوڑ کر جا رہا ہے، ان میں سے کوئی چیز بھی اس کے ساتھ نہیں جاتی۔ اس کا مال تو وہی ہے، جو اس نے کھا لیا، پہن لیا اور جو اس کے کام آ گیا، یا جو اس نے راہِ خدا میں دے دیا اور اسے روزِ محشر واپس مل جائے گا۔ باقی سب کچھ اس کے وارثوں کا ہے، اس کے کسی کام کا نہیں۔ قبر اس بات کی سب سے بڑی نشانی ہے کہ ان میں سے کوئی چیز بھی اس کے ساتھ نہیں جا سکتی۔

یہی وجہ ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ میں نے قبروں پر جانے سے منع کر دیا تھا لیکن اب جایا کرو۔ قبروں پہ جانے سے دل نرم ہوتے ہیں، موت کی یاد آتی ہے اور آدمی کو اپنے صحیح مقام کا پتا چلتا ہے، جو موت کے بعد قبر کے اندر جا کر اس کو ملنے والا ہے، اس کی حقیقت کیا ہے؟ اور دیکھنے والوں کو بھی یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ کس طرح آدمی سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر چلا گیا۔ جو کچھ بھی اس نے کمایا، جس کے پیچھے وہ دوڑا بھاگا، جس چیز کی ہوس کی، اس کو جمع کرتا رہا، ان میں سے کوئی چیز بھی اس کے کسی کام نہ آئی۔

كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُونَ ۝ ثُمَّ كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُونَ ۝ (التکاثر: ۳، ۴)

''ہرگز نہیں، عن قریب تم کو معلوم ہو جائے گا۔ پھر (سن لو کہ) ہرگز نہیں، عن قریب تم کو معلوم ہو جائے گا۔''

دو دفعہ یہ بات کہی گئی ہے۔ اس کی کیا وجہ ہے؟ ایک وجہ تو اس کی یہ کہ اس میں تاکید کی گئی ہے کہ اس کی جو بھی حقیقت ہے جلد ہی تمھارے سامنے کھل کر آ جائے گی۔ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ پہلی آیت کا مطلب ہے، موت کا وقت یعنی جلد ہی اپنے موت کے وقت تم یہ جان لو گے کہ جس چیز کی تمھیں کثرت سے طلب تھی، جس کی تمھیں زیادہ سے زیادہ حرص تھی، جس کی تمھیں

ہوس تھی، وہ چیز کتنی بے وزن اور بے حقیقت ہے اور اس کا کوئی وزن اللہ کے ہاں نہیں ہے۔

دوسری دفعہ آیت کو اس لیے دہرایا گیا ہے کہ دراصل اس میں اس وقت کا ذکر ہے جب آدمی قبر سے اٹھ کر اللہ کے سامنے کھڑا ہوگا۔ اِذَا بُعْثِرَ مَا فِی الْقُبُوْرِ۝ وَ حُصِّلَ مَا فِی الصُّدُوْرِ۝ کا ذکر پہلے آچکا ہے کہ قبریں ادھیڑ کر لوگوں کو نکال لیا جائے گا اور سب اللہ کے سامنے کھڑے ہوں گے، اور سینوں میں پوشیدہ راز تک نکال کر سامنے رکھ دیے جائیں گے۔ اور وہ وقت بھی جلد ہی آنے والا ہے کوئی دور کی بات نہیں ہے۔ یہ بات ایسی ہی ہے، جیسے کوئی شخص گھنٹوں سونے کے بعد اٹھے اور کہے کہ میں تو ابھی سویا تھا۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کروڑوں اور اربوں سال کے بعد یہ واقعہ وقوع پذیر ہوگا، لیکن یہ تو اتنا ہی فاصلہ ہے، جتنا سو کر اٹھنے میں فاصلہ ہوتا ہے۔ آدمی دو گھنٹے سوئے یا آٹھ گھنٹے، ایک دن سوئے یا ایک سال، سونے والے کو یوں ہی محسوس ہوتا ہے کہ جیسے ابھی تو میری آنکھ لگی تھی، شاید ابھی ایک پہر گزرا ہے، شاید شام ہوئی ہے، یا میں صرف دو دن سویا ہوں۔ لاکھوں اور اربوں سال سونے کے بعد اُٹھنے والے کا تاثر بھی یہی ہوگا کہ ابھی سو کر اٹھا ہوں۔ اس لیے قرآن مجید نے یہ بات کہی ہے کہ آدمی جلد ہی جان لے گا کہ ان سب چیزوں کی حقیقت کیا ہے؟

كَلَّا لَوْ تَعْلَمُوْنَ عِلْمَ الْيَقِيْنِ۝ (التکاثر:۵)

”ہرگز نہیں، کاش! تم جانتے یقین کے علم کے ساتھ۔“

یہاں اس خواہش کا اظہار کیا جا رہا ہے کہ کاش ایسا ہوتا کہ جو بات تم موت کے وقت جانو گے، یا جو بات قبر میں جانے کے بعد معلوم ہوگی، یا جو بات حشر کے میدان میں کھڑے ہو کر تمھارے علم میں آئے گی، اس کو تم آج یقین کے علم سے یا یقینی علم سے جان لو۔ اس آیت کے بہت سارے معنی ہو سکتے ہیں، یقین کا علم بھی ہو سکتا ہے، یقینی علم بھی ہو سکتا ہے۔

علم یقین کے معنی ہیں وہ یقین کہ جو آدمی علم سے حاصل کرے۔ ایک یقین تو وہ ہے، جو آدمی آنکھوں سے دیکھ کر حاصل کرتا ہے۔ اگر سورج نکلا ہو، دن چڑھا ہو، یا کوئی شخص سامنے بیٹھا ہو تو یہ بات یقینی ہے اور آنکھوں دیکھی ہے۔ لیکن موت کے بعد جو کچھ پیش آنے والا ہے، جس طرح ہم اللہ کے سامنے کھڑے ہوں گے، میزان آویزاں کی جائے گی، اعمال سامنے پیش کیے جائیں گے، زمین گواہی دے گی، سینوں کے بھید کھل کر سامنے آجائیں گے، اس کا یقین ہمیں

صرف علم کے ذریعے ہی حاصل ہوسکتا ہے۔ یہ علم ہمیں کئی ذرائع سے حاصل ہوتا ہے۔

اس علم کے حصول کا ایک ذریعہ کائنات ہے۔ یہ علم پوری کائنات کے اندر پھیلا ہوا ہے۔ اللہ نے سورج اور چاند، دن اور رات ہمارے لیے بنائے ہیں۔ سب گواہی دے رہے ہیں، سب تعلیم دینے اور سکھانے کے ذریعے ہیں۔ اگر ان ہی پر آدمی غور کرلے تو وہ اس نتیجے پر پہنچ سکتا ہے کہ اسے اللہ کے پاس جا کر اپنی ساری چیزوں کی جواب دہی کرنا ہوگی۔ چوں کہ ہر مخلوق اللہ کے حکم کے تابع ہے، لہٰذا وہ مخلوق جس کو اس نے بااختیار بنایا ہے، اس سے بھی وہ اس کے اعمال کا حساب لے گا کہ کہاں تک اس نے اللہ کے حکم کی پابندی اور اطاعت کی۔

علم کا ایک ذریعہ وہ ہدایت بھی ہے، جو اللہ نے اپنے انبیا علیہم السلام کے ذریعے انسانوں کے لیے بھیجی۔ یہاں اس تمنا کا اظہار کیا گیا ہے کہ روزِ محشر انسان یہ سوچے گا کہ کاش! ایسا ہوتا کہ اس بات کو جو موت کے بعد آنکھوں کے سامنے آجائے گی، اس پر یقین کے ذریعے اور علم کے ذریعے، وہ یقین کرلیتا اور اس وقت جو حسرت، آرزو اور یاس اس کے حصے میں آئی ہے اس سے وہ بچ جاتا۔ وہ کون سا علم حاصل کرتا اور کس چیز پر یقین حاصل کرلیتا، اس کی تفصیل آگے بیان ہوئی ہے۔ البتہ اس سے یہ بات ظاہر ہوگئی ہے کہ ہر آدمی اللہ کے سامنے جواب دہ ہے اور پورا علم نہ سہی، لیکن علم کا کوئی نہ کوئی حصہ ہر آدمی کو حاصل ہوسکتا ہے، اور یقین بھی آدمی کو کسی نہ کسی درجے میں نصیب ہوسکتا ہے۔ یہ بات بھی واضح رہے کہ دنیا کے اندر وہ یقین اور علم آدمی کو نہیں مل سکتا، جو کسی چیز کو آنکھ سے دیکھ کر ہوسکتا ہے۔ یہ بات ایسی ہے، جو اچھی طرح سمجھنے کی ہے۔

جو لوگ اس بات کا دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ اور آخرت کے وجود کو یوں ثابت کرسکتے ہیں کہ جس طرح آنکھوں دیکھی حقیقت ہو تو یہ صحیح نہیں۔ اگر اللہ کے ہونے اور آخرت کے یقینی ہونے اور ہر شبہے سے بالاتر ہونے کا، کوئی ایسا ثبوت ہوتا، جس طرح آسمان پر چمکتا ہوا سورج تو پھر یہ ایمان کا معاملہ نہ رہتا، بلکہ اس روشن حقیقت کے بعد آدمی مجبور ہوتا کہ وہ لازماً اللہ کو مانے اور آخرت پر ایمان لائے۔ لیکن یہ بات کہ اللہ موجود ہے اور غیب میں رہتے ہوئے آدمی اس پر ایمان لائے، یہ دراصل آدمی کا امتحان ہے کہ اپنی عقل سے پہچانے، اپنے علم سے کام لے، اور انبیا علیہم السلام کے اوپر ایمان لائے۔ پس وہ چیزیں، جو نگاہوں کے سامنے نہیں ہیں ان کے

اندر انکار کی گنجایش موجود ہے، اور لوگ بڑے بڑے دلائل سے ان سب چیزوں کا انکار کرتے ہیں۔ لہٰذا انسان کو چاہیے کہ وہ اپنے علم کی بنیاد پر جو وحی کے ذریعے حاصل ہوتا ہے، اور کائنات کے مشاہدے و مطالعے پر مبنی ہے، سے یہ یقین پیدا کرے کہ اللہ ہے اور ایک روز وہ آخرت برپا کردے گا۔ یہ علم دنیا کے اندر حاصل ہوسکتا ہے، ہر انسان کو حاصل ہوسکتا ہے اور اس علم کی بنیاد پر یقین کی کیفیت کہ جیسے آنکھوں دیکھی حقیقت ہو، بھی حاصل ہوسکتی ہے۔ اس لیے یہاں فرمایا جا رہا ہے کہ کاش! ایسا ہوتا کہ آدمی اسی دنیا کے اندر اس یقین کو حاصل کرلیتا، جو علم کی بنیاد پر حاصل ہوسکتا ہے۔

یہاں علم سے مراد ان تین چیزوں کا علم ہے، جن کا یہاں بیان ہو رہا ہے، یعنی یہ کہ تم جہنم کو ضرور دیکھ لوگے، تم یقینی علم کے ساتھ اسے دیکھ لوگے، اور پھر تم سے اللہ کی نعمتوں کے بارے میں جواب طلبی کی جائے گی۔ گویا جب تم جہنم کو یقین کی آنکھ سے دیکھوگے تو پھر یہ دیکھنا اپنی آنکھوں سے ایک یقینی حقیقت کو دیکھنا ہوگا، اور اس کے بعد پھر اس سے واپسی کی اور دوبارہ علم کی کوئی مہلت نہیں ہوگی۔ پھر تمھیں اس دن ان ساری نعمتوں کا جواب دینا پڑے گا، جن سے اللہ نے تمھیں دنیا میں نوازا ہے۔ اس بات کو اگر آج انسان پوری طرح جان لے تو پھر جس دنیا کی کثرت کے پیچھے وہ دوڑ رہا ہے، اس سے بچ سکتا ہے۔

لَتَرَوُنَّ الْجَحِیْمَ۝ ثُمَّ لَتَرَوُنَّهَا عَیْنَ الْیَقِیْنِ۝ (التکاثر ۱۰۲: ۶-۷)

”تم دوزخ دیکھ کر رہو گے۔ پھر (سن لو کہ) تم بالکل یقین کے ساتھ اسے دیکھ لو گے۔“

لَتَرَوُنَّ کے اندر تاکید بھی ہے اور یقین بھی، جس میں کسی شک وشبہے کی گنجایش نہیں ہے۔ ”یہ تمھاری نگاہوں کے سامنے ہوگی۔“ یہ بات قرآن مجید میں بہت ساری جگہ پر بڑی تفصیل کے ساتھ بیان ہوئی ہے، یعنی جہنم کو سامنے لایا جائے گا، اس کو بالکل عیاں اور آشکار کردیا جائے گا۔ لوگ اس کے چاروں طرف کھڑے ہوں گے اور اس کو دیکھ رہے ہوں گے۔ اس بات میں مفسرین نے تھوڑا سا اختلاف کیا ہے کہ کیا جو لوگ مومن ہیں اور نجات پا جائیں گے، وہ بھی جہنم کو دیکھیں گے اور اس کے قریب جائیں گے یا نہیں؟ بعض لوگوں کی رائے یہ ہے کہ کیوں کہ قرآن مجید نے کہا ہے کہ وہ اس کی آہٹ بھی نہیں پائیں گے، اور وہ اس سے بہت دور رکھے جائیں گے، اس لیے وہ جہنم کو نہیں دیکھیں گے، جو ہولناکی اور وحشت کا مقام ہے اور اس کی تکلیف ان کے

حصے میں نہیں آئے گی۔

بعض لوگوں کی رائے یہ ہے کہ قرآن مجید کی مذکورہ آیت اور ایک حدیث کی بنیاد پر سب ہی کو اس پر سے گزرنا ہوگا، اور وہ جو نیک عمل کرنے والے ہوں گے وہ اس پر سے اپنے اپنے اعمال کی مناسبت سے گزر جائیں گے۔ جیسا کہ ایک حدیث میں ہے کہ وہ ہوا کی طرح گزر جائیں گے اور بعض آہستہ آہستہ گزریں گے۔ بہر حال اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ اس لیے کہ اصل بات یہ نہیں ہے کہ کوئی اس کو دیکھے گا یا نہیں دیکھے گا، بلکہ اصل بات یہ ہے کہ کون اس کے لیے تیاری کرتا ہے کہ اس سے بچ سکے۔ لہٰذا یہ کہا جا رہا ہے کہ آج ہی سے اس بات کو جان لو کہ جہنم کو تم ضرور اپنی آنکھوں سے دیکھ کر رہو گے، پھر اس کو اس طرح دیکھو گے، جس طرح آدمی کھلی آنکھوں سے ایک حقیقت کو دیکھتا ہے۔ پھر تمھیں یہ یقین حاصل ہوگا کہ یہ چیز تو واقعی ایک آنکھوں دیکھی حقیقت ہے۔

ثُمَّ لَتُسْـَٔلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيمِ ○ (التکاثر: ۸)

''پھر ضرور اس روز تم سے ان نعمتوں کے بارے میں جواب طلبی کی جائے گی۔''

جب انسان جہنم کو ایک حقیقت کے طور پر اپنی آنکھوں سے دیکھ لے گا، تو پھر اس سے ان نعمتوں کے بارے میں سوال ہوگا، جواب طلبی ہوگی جو اس کے رب نے اسے عطا کی ہیں۔ یہاں دراصل ناشکرے انسان کو یہ بتایا جا رہا ہے کہ اسے جو کچھ بھی عطا کیا گیا ہے یہ سب اللہ کی نعمتیں ہیں۔ نعیم کا لفظ ہر طرح کی نعمتوں پر حاوی ہے۔ انسان کو جو کچھ ملا ہے یہ اللہ کی نعمت ہے۔ دیکھنے، سننے اور بولنے کی صلاحیت اور ہاتھ پاؤں، جن سے آدمی کام کرتا ہے، یہ بھی اللہ کی نعمتیں ہیں۔ مال و دولت الغرض دنیا کی ہر چیز اس نعمت کے اندر شامل ہے۔ ان سب کے بارے میں اللہ تعالیٰ سوال کرے گا کہ تم نے ان کا کیا حق ادا کیا؟

نعمتِ خداوندی کا پہلا حق تو یہ ہے کہ آدمی اس کا اعتراف کرے کہ ہر چیز اللہ کی بخشی ہوئی ہے۔ نوالا بھی وہی منہ میں رکھتا ہے، پانی کا گھونٹ بھی وہی پلاتا ہے، بیمار ہونے پر شفا بھی وہی دیتا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے الفاظ ہیں: وہی مجھے کھلاتا اور پلاتا ہے اور جب بیمار ہوتا ہوں تو وہی مجھے شفا دیتا ہے۔

اَلَّذِیْ خَلَقَنِیْ فَهُوَ یَهْدِیْنِ٥ وَالَّذِیْ هُوَ یُطْعِمُنِیْ وَ یَسْقِیْنِ٥ وَ اِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ یَشْفِیْنِ٥ (الشعراء:۷۸-۸۰)

''جس نے مجھے پیدا کیا، پھر وہی میری رہنمائی فرماتا ہے۔ جو مجھے کھلاتا اور پلاتا ہے اور جب بیمار ہو جاتا ہوں تو وہی مجھے شفا دیتا ہے۔''

دراصل اللہ کی طرف سے ہی ہر چیز ملی ہے۔ کوئی اور ذات یا ہستی دینے والی یا عطا کرنے والی نہیں ہے۔ یہ کوئی اتفاقیہ حادثہ بھی نہیں ہے کہ حادثے کے طور پر ہر چیز مل گئی ہو۔ یہ تصور بھی صحیح نہیں ہے کہ یہ میرے اپنے زورِ بازو کی کمائی کا نتیجہ ہے۔ یہ بھی انسان کو زعم ہوتا ہے کہ میرے علم کی وجہ سے یا سائنس اور ٹکنالوجی کی وجہ سے اسے یہ ترقی یا نعمتیں میسر آئی ہیں۔ ان میں سے کوئی چیز بھی نہیں کہ جو انسان نے خود بنائی ہو، پیدا کی ہو یا خود اپنے طور پر اس کو حاصل کر لیا ہو، بلکہ ہر چیز اس کو بخشی گئی اور عطا کی گئی ہے۔ کچھ چیزیں آدمی کو بغیر کمائے مل گئی ہیں، مثلاً انسانی جسم، دل و دماغ، ذہنی و جسمانی صلاحیتیں، قوت و طاقت اور استعداد و قابلیت، یہ سب کچھ اس نے کما کر حاصل نہیں کیا ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کا عطا کردہ ہے۔ اس لیے ان سب کے بارے میں سوال ہوگا۔

ایک حدیث میں ہے کہ آدمی کے قدم اللہ کے سامنے سے ہٹنے نہ پائیں گے، جب تک کہ وہ پانچ باتوں کا جواب نہ دے لے۔ ایک یہ کہ عمر کیسے گزاری؟ درحقیقت انسان کی سب سے قیمتی چیز تو وقت ہے۔ یہی وقت یا زمانہ عمر ہے۔ اس کے بارے میں پوچھا جائے گا کہ وقت کو ہم نے کس طرح خرچ کیا؟ دوسرا سوال جوانی کے بارے میں ہوگا۔ حدیث کے الفاظ ہیں کہ جوانی کو کن کاموں میں لگایا یا جوانی کو کس طرح خرچ کیا؟ ایک سوال، مال کے بارے میں بھی ہوگا کہ کیسے کمایا اور کہاں خرچ کیا؟ جسم و جان اور صلاحیتیں تو اللہ کی عطا کردہ ہیں، لیکن مال انسان خود کماتا ہے۔ اس لیے اس کے بارے میں پوچھا جائے گا کہ کیسے کمایا اور کہاں خرچ کیا؟ جائز ذرائع سے کمایا یا ناجائز ذرائع سے کمایا؟ کہاں خرچ کیا اور کس طرح کیا؟ علم کے بارے میں پوچھا جائے گا کہ اس نے اپنے علم پر کہاں تک عمل کیا؟ یہ تو چند نعمتوں کا ذکر ہے، جب کہ فی الواقع ہر نعمت کے بارے میں سوال ہوگا۔

ایک اور حدیث میں آتا ہے کہ سایہ دار گھر کے بارے میں بھی سوال ہوگا، حتیٰ کہ

ٹھنڈے پانی کے بارے میں بھی سوال ہوگا کہ یہ بھی اللہ کی نعمتیں ہیں۔

احادیث کے اندر ایک واقعہ آتا ہے کہ ایک روز حضورؐ گھر سے نکلے۔ آپؐ بھوکے تھے۔ راستے میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ مل گئے وہ بھی بھوکے تھے۔ آگے چلے تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ مل گئے وہ بھی بھوکے تھے۔ یہ تینوں ایک انصاری صحابیؓ کے ہاں گئے اور انھوں نے ان کی خاطر تواضع کی۔ کھجوروں کے خوشے توڑے اور آپ ﷺ کے سامنے پیش کیے۔ ایک بکری کا بچہ ذبح کیا اور اس کا گوشت بھون کر سامنے رکھا اور پینے کے لیے ٹھنڈا پانی پیش کیا۔ یہ کھانے کے بعد آپ ﷺ نے فرمایا کہ ان نعمتوں کے بارے میں بھی قیامت کے روز اللہ تعالیٰ سوال کرے گا؟ اس کے بعد آپ ﷺ نے یہی آیت تلاوت فرمائی تھی: ثُمَّ لَتُسْئَلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيمِ ۝ (التکاثر:۸) ''پھر ضرور اس روز تم سے ان نعمتوں کے بارے میں جواب طلبی کی جائے گی۔''

دین کی اصل بنیاد تو نعمتوں پر شکر گزاری ہے۔ یہ انسان پر کوئی ظلم یا جبر نہیں کہ وہ اللہ کی نعمتوں پر شکر گزاری کرے بلکہ اسے ابتدا ہی سے یہ تعلیم دی گئی ہے کہ وہ اللہ کو اس کی نعمتوں کے ذریعے پہچانے، ان بے شمار نعمتوں سے، جو اس نے انسان کو عطا کی ہیں۔ اس لیے قرآن مجید کا آغاز بھی اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝ سے فرمایا کہ تعریف اللہ ہی کے لیے جو تمام کائنات کا رب ہے۔ نہایت مہربان اور بے انتہا رحم کرنے والا ہے۔ وہی اس پوری کائنات کا مالک ہے۔ وہی آقا ہے اور وہی سب کو پالنے والا ہے۔ لہٰذا سارا شکر اور تعریف اسی کے لیے ہے۔ دراصل شکر گزاری کا مطالبہ اس لیے نہیں ہے کہ اللہ حاکم بن کر بیٹھ گیا ہے، اور حکم چلا رہا ہے کہ اس کا شکر ادا کیا جائے، بلکہ یہ مطالبہ اس لیے ہے کہ انسان کے پاس، جو کچھ بھی ہے یا جن نعمتوں سے وہ لطف اندوز ہو رہا ہے، وہ سب خدا کی عطا کردہ ہیں۔ کوئی بھی چیز اس نے خود نہیں بنائی ہے۔ ہوا، پانی، زمین و آسمان، بیج، کھیتی، اور کھیتی کی پیداوار، لوہا، آگ، ان میں سے کوئی چیز بھی اس کی بنائی ہوئی نہیں ہے۔ یہ سب خدا کی کارسازی ہے۔ قرآن مجید میں یہ سوال بھی کیا گیا ہے کہ کھیتی کو تم اُگاتے ہو یا ہم اُگاتے ہیں؟ آسمان سے پانی تم برساتے ہو یا ہم برساتے ہیں؟ تم نے اپنے آپ کو خود پیدا کیا ہے یا ہم نے پیدا کیا ہے؟ یہ آسمان و زمین تم نے بنائے ہیں، یا ہم نے بنائے ہیں؟

ان میں سے کون سی چیز ہے، جس کے بارے میں ہم یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ یہ ہم نے خود بنائی ہے، یا ہمارے علم، سائنس اور ٹکنالوجی سے بنی ہے۔ انسان نے تو صرف اتنا کیا ہے کہ قدرت کے سربستہ رازوں کو معلوم کر کے، قدرت کی دی ہوئی چیزوں کو بہتر سے بہتر انداز میں اپنی خدمت میں لگالیا ہے۔ یہ سب نعمتیں انسان کو دی بھی اسی لیے گئی ہیں کہ وہ انھیں اپنے تصرف میں لائے لیکن ان میں سے ہر چیز کے بارے سوال ہوگا۔ لہٰذا پہلی چیز تو نعمت کا اعتراف ہے، اس چیز کا یقین اور شعور ہے کہ یہ سب کچھ خدا کا بخشا ہوا ہے۔ لہٰذا ساری حمد اور تعریف اسی کے لیے ہے، اور وہی اس بات کا مستحق اور حق دار ہے کہ اس کا شکر ادا کیا جائے۔

دوسری بات یہ ہے کہ ہر نعمت کا ایک حق ہے اور نعمت کا جو حق ہے وہ ادا ہونا چاہیے، اور وہ حق یہ ہے کہ جس نے وہ نعمت دی ہے، اس کی مرضی اور رضا کے مطابق اس کو استعمال کیا جائے۔ اسی کے احکام کے مطابق نعمت کو استعمال میں لایا جائے، اور اس کا حق ادا کیا جائے۔ جسم جو اللہ نے دیا ہے، وہی کام کرے جو اللہ کو پسند ہیں۔ ان کاموں سے رک جائے جو اللہ کو ناپسند ہیں۔ اس نے جو علم دیا ہے، اس کا بھی یہی حال ہے۔ اس نے دیکھنے کے لیے آنکھیں، سننے کے لیے کان اور بولنے کے لیے زبان یا جو بھی صلاحیتیں بخشی ہیں، ان میں سے ہر چیز اللہ کی مرضی کے تابع ہو۔ دراصل یہ وہ سوال ہے، جو قیامت کے روز کیا جائے گا۔ اسی کی جواب طلبی ہوگی اور اسی کی بنیاد پر ترازو کے اندر وزن ہوگا۔

فَاَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ ۙ فَهُوَ فِيْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ ؕ (القارعة:۶،۷)
"پھر جس کے پلڑے بھاری ہوں گے وہ دل پسند عیش میں ہوگا۔"

جس نے یہاں کی زندگی میں ان نعمتوں کو اللہ کی مرضی کے مطابق استعمال کیا، اس کو وہاں اپنی مرضی کے مطابق زندگی دی جائے گی، اور اس کی بنیاد پر اس کے اعمال اللہ کی ترازو میں وزن پائیں گے۔

یہ سورہ بھی اپنی تعلیمات کے لحاظ سے بالکل بنیادی تعلیمات پر مشتمل ہے۔ ایک حدیث میں آتا ہے کہ حضورؐ نے کہا کہ ہم میں سے کون یہ طاقت رکھتا ہے کہ ہزار آیتیں پوری ایک ہی نشست میں پڑھ لے۔ آپؐ نے فرمایا کہ اگر تم سورۂ تکاثر تلاوت کرو، تو یہ ایک ہزار آیات کے برابر ہیں۔ اس کی فضیلت اس لیے بھی ہے کہ اس کے اندر جو مضمون بیان ہوا ہے، وہ نہایت

اہمیت کا حامل ہے۔ یہ دراصل وہی سلسلۂ کلام ہے، جو سورۂ زلزال سے شروع ہوا تھا، بلکہ اگر مزید غور کیا جائے تو سورۂ شمس سے چل رہا ہے کہ ہر آدمی کو نیکی اور بدی کی تمیز دی گئی ہے۔ اب یہ اس کا اپنا اختیار ہے کہ وہ نیکی کرتا ہے یا بدی۔ یہی اس کا امتحان ہے۔

فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَ تَقْوٰهَا ۝ (الشمس:۸)

"اس کی بدی اور اس کی پرہیزگاری اس پر الہام کر دی۔"

اور اس کے بعد اسے، جو نعمتیں دی گئی ہیں ان کے بارے سوال ہوگا۔ لہٰذا انسان کی فلاح کا انحصار اسی پر ہے کہ نیکی کا راستہ اختیار کرے، اور تباہی اس میں مضمر ہے کہ برائی کا راستہ اختیار کرے۔

جب وہ وقت آ جائے گا، جب ایک عظیم حادثہ پیش آئے گا، جب ساری زمین کا نظام درہم برہم ہو جائے گا، زمین بری طرح ڈولنے لگے گی، پہاڑ ریزہ ریزہ ہو جائیں گے، زمین بھی بولے گی، اعضا بھی گواہی دیں گے، ہر چیز کھل کر سامنے آ جائے گی، تو اس وقت پھر اعمال کا وزن ہوگا، اور اعمال کے وزن کے اندر وہی اعمال وزنی ہوں گے جو شکر گزاری کے اوپر قائم ہوں گے، جن پر اللہ کا شکر ادا کیا گیا ہوگا اور جو شکر کی بنیاد پر کیے گئے ہوں گے، جس نے دنیا کی حرص و ہوس کو اپنے اوپر طاری کر لیا اور مال کمایا، یہ نہ دیکھا کہ کس طرح کمایا، بس مال کمانے کی ایک دھن ہے، جو اس پر سوار ہے، ایک کارخانے کے بعد دوسرا لگانا ہے۔ لیکن یہ نہ سوچا کہ کہاں سے بنا رہا ہوں، اور جو کچھ بنا رہا ہوں اس کو کہاں خرچ کروں گا؟ اس طرح جو لذت چاہی حاصل کی، جہاں چاہا اپنی خواہش کو پورا کیا... یہ زیادہ سے زیادہ اور ایک دوسرے سے بڑھ کر دنیا حاصل کرنے کی دھن جو تکاثر کی بیماری ہے، اگر جان کو لگی رہی اور موت آ گئی، اور توبہ کی توفیق تک نہ ملی، تو اس کے بعد تو سب کچھ کھل کر سامنے آ جائے گا۔

دراصل یہ وہ تعلیم ہے، جو اللہ تعالیٰ نے اس سورہ میں دی ہے اور یہی پورے انسانی کردار کی بنیاد ہے، جس سے مقصد زندگی کھل کر سامنے آ جاتا ہے، اور جو چیز آدمی آخرت میں دیکھنے والا ہے، اس کو آج علم کے ذریعے دیکھ لیتا ہے، اور اگر وہ علم کے ذریعے دیکھ کر یقین کر لے اور اس کے لیے تیاری کر لے تو وہ کامیاب ہے ورنہ کل وہاں جب اللہ کی نعمتوں کی جواب طلبی ہوگی، ان کا جواب دینے کے لیے وہ کھڑا ہوگا تو اس کے پاس کوئی جواب نہ ہوگا۔ اس کے اعمال کوئی وزن نہ رکھیں گے اور وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ناکامی سے دوچار ہو جائے گا۔ اسی یقین سے

اعمال درست ہوتے ہیں اور اسی یقین سے اعمال کے اندر وزن پیدا ہوتا ہے۔ دنیا کی اور مال کی محبت، جس کا ذکر آگے آئے گا کہ جس سے آدمی اپنی عمر کو ضائع کر دیتا ہے، نقصان اور خسارے میں پڑ جاتا ہے، اس خسارے سے کیسے بچا جا سکتا ہے اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کامیابی اور سرخ روئی سے کیسے سرفراز ہوا جا سکتا ہے۔ ان سب کی بنیاد یہی جواب دہی کا احساس اور عقیدۂ آخرت ہے۔ آدمی اپنی عمر کو کس طرح استعمال کرے، اپنے وقت کو کیسے کھپائے اور کیا کام کرے کہ جس سے وہ خسارے سے بچ جائے یہ وہ سوال ہے، جس کا جواب اگلی سورہ، سورہ عصر میں دیا گیا ہے۔